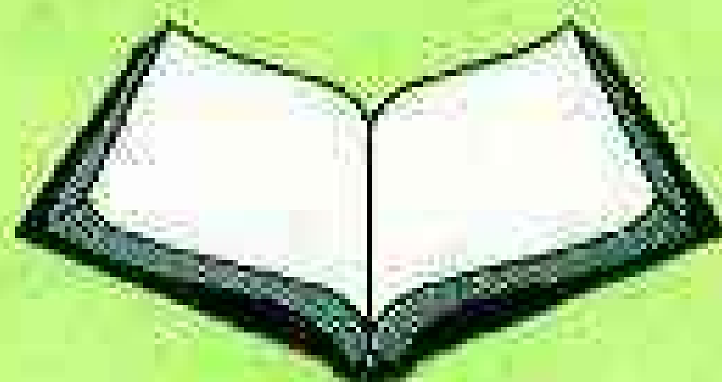
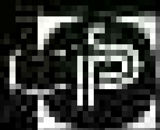
دینی مدارس کا نظامِ تعلیم





انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد

دینی مدارس کا نظامِ تعلیم

سیمینار

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد

۱۹۸۷ء

۱۹۹۳ء

کتاب : دینی مدارس کا نظام تعلیم

سلسلہ : تعلیم اسلامی تناظر میں (۵)

مرتب : مسلم سجاد۔ سلیم منصور خالد

ناشر

انسٹیٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز

بلاک ۱۹، مرکز ایف ۷، اسلام آباد

تقسیم کنندہ

بک پروموٹرز

جناح سپر مارکیٹ، مرکز ایف ۷، اسلام آباد

۳۷۷ء۹۷

دینی مدارس کا نظام تعلیم

اسلام۔ تعلیم۔ نصاب

قیمت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اداریہ

دینی مدارس کا نظام تعلیم ایک ناقابل تردید حقیقت کے طور پر ملک کے تعلیمی نقشہ پر موجود ہے۔ اس کی سخت جانی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو گا کہ نہ صرف پاکستان بلکہ مراکش سے انڈونیشیا تک دیگر اسلامی ممالک میں بھی استعماری طاقتوں کے صدیوں کے استیلاء کے باوجود یہ کسی نہ کسی شکل میں اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔ اس نے مسلمانوں کے معاشروں کی بعض مسلمہ ضروریات کو پورا کیا ہے اور مسلمانوں کا اپنے دین سے جیسا کچھ اور جتنا کچھ رشتہ بھی آج ہے۔ اسے قائم رکھنے میں ان تعلیمی اداروں کا حصہ ہے۔

نو آزاد مسلم ممالک کی تعلیمی ضروریات اور دینی مدارس کے نظام کے حوالے سے متعدد مسائل آج کے دور کے مسلمان مفکرین کے لئے غور و فکر کا موضوع رہے ہیں۔ ایک طرف یہ احساس ہے کہ یہ نظام آج کے دور کی کسی ریاست کی عمومی ضروریات کو پورا نہیں کرتا۔ اور اس کے مقابلہ میں ایک مکمل متوازی سیکولر نظام تعلیم بر سرپیکار ہے (جس کے اپنے مسائل ہیں) دوسری طرف یہ خواہش ہے کہ نئی نسل کے جس حصہ کی دین سے اتنی گہری وابستگی اور طویل تربیت ہوئی ہے اسے معاشرہ میں اسلامی اقدار کی ترویج میں اور اجتماعی معاملات میں زیادہ موثر ہونا چاہئے۔ لیکن کس طرح.....؟

انہی مسائل پر غور و فکر کے لئے انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز نے ۲۳، ۲۴، نومبر ۱۹۸۶ء کو چند اہل فکر کو اسلام آباد مدعو کیا ان نشستوں میں پیش کئے جانے والے مقالات کی روشنی میں مختلف مباحث زیر غور آئے کچھ امور پر اتفاق رائے ہوا اور کچھ پر سوچنے کی راہیں کھلیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس طرح کے مذاکروں کے نتیجے میں کوئی فوری تبدیلی رونما ہو جائے گی، اس کی فوری توقع رکھنا بھی غلط ہے لیکن یہ ہمارا یقین ہے کہ ملک و ملت کی بھلائی کے لئے نیک نیتی سے مل جل کر غور کرنے سے انشاء اللہ خیر ہی ظاہر ہو گا۔

حالات کے عملی اور فطری تقاضے بھی ہیں اور ماضی کی روایات بھی ہیں۔ نہ تو یہ مناسب ہے کہ بے سمجھے بوجھے تقاضے پورے کرتے چلے جائیں' اور نہ یہ قرین مصلحت ہے کہ روایات کو افادیت سے قطع نظر گلے سے لگائے رہیں۔ کھلی آنکھوں سے گردوپیش کا مطالعہ کرنا اور پھر کوئی راہ اختیار کرنا ہی زندگی کی علامت ہے۔ ہر مخلص مسلمان کی یہ خواہش ہے کہ اس خطہ پاک پر اسلام کا نظام حیات نافذ ہو اور یہاں کے رہنے والے صدموں اور پریشانیوں سے بچیں اور اس نظام کی برکتوں کو سمیٹیں لیکن اس مقصد کے حصول کے لئے پہلا قدم یہ ہے کہ یہ عزم صمیم ہو کہ یہ کام کرنا ہے۔ ؟

دینی مدارس کے مضبوط نظام' طلبہ اور اساتذہ کو اور اس سے وابستہ اور اس کے تیار کردہ علماء کو اس میں اہم کردار ادا کرنا ہے۔ اس مقصد سے اس نظام کے دائرہ میں رہتے ہوئے جو تدابیر بھی اختیار کرنا ہیں' انہیں سوچ بچار کے بعد طے کرنا چاہئے اور پھر عزم اور توکل کے ساتھ اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے استعانت طلب کرتے ہوئے ان پر عمل پیرا ہونا چاہئے۔

اس مذاکرے کے نتیجے میں کچھ سفارشات ایسی سامنے آئی ہیں جنہیں فوری طور پر اختیار کرنے سے اس پورے نظام میں مفید اور نتیجہ خیز بہتری کی توقع کی جاسکتی ہے۔

فاضل اور محترم مقالہ نگاروں نے محنت سے اپنے خیالات مرتب اور پیش کئے نہایت دلچسپی' سکون اور د سے مباحث میں حصہ لیا۔ مدیران مجلہ' انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے تمام شرکاء کے از حد شکر گذار ہیں' اللہ تعالیٰ جزائے خیر سے نوازے۔

زیر نظر شمارے کے مشمولات میں سید محمد متین ہاشمی صاحب' ڈاکٹر لطیف انصاری صاحب اور سفیر اختر صاحب کے مقالات دوران سیمینار پیش نہ ہوسکے تھے کیونکہ یہ مقالات تاخیر سے موصول ہوئے یا پھر مقالہ نگار شرکت نہ کرسکے۔ جبکہ مولانا عبدالغفار حسن صاحب کا مقالہ پڑھ کر سنایا گیا۔

امید ہے کہ مقالات کا یہ مجموعہ ایک مفید پیشکش ثابت ہوگا۔

مدیران

مسلم سجاد' سلیم منصور

ترتیب

شرکاء سیمینار

چیئرمین پروفیسر خورشید احمد

صدارت
ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتہ صاحب
مولانا مفتی سید سیاح الدین کاکاخیل صاحب
مولانا مفتی عبدالقیوم ہزاروی صاحب
مولانا گوہر رحمان

نظامت خالد رحمٰن صاحب

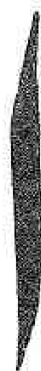
شرکاء

مولانا عبدالمالک صاحب لاہور
مولانا حافظ محمد انور صاحب گوجرانوالہ
مولانا سید عبدالخالق گیلانی صاحب گوجرانوالہ
مولانا سید معروف شاہ شیرازی صاحب مانسہرہ
مولانا محمد یاسین ظفر صاحب فیصل آباد
مولانا فتح الجمیل صاحب فیصل آباد
مولانا قاضی منیب احمد صاحب اسلام آباد
مولانا مصباح الرحمٰن یوسفی صاحب اسلام آباد
پروفیسر حافظ نذر احمد صاحب لاہور

پروفیسر سید محمد سلیم صاحب نواب شاہ
پروفیسر مسلم سجاد صاحب کراچی
ڈاکٹر اعجاز شفیع گیلانی صاحب اسلام آباد
ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی صاحب اسلام آباد
فرید احمد پراچہ صاحب لاہور
پروفیسر عبداللطیف انصاری صاحب مظفر آباد
پروفیسر امیر الدین مہر صاحب اسلام آباد
ڈاکٹر منصور علی صاحب اسلام آباد
علی احمد مہر صاحب اسلام آباد
سلیم منصور خالد لاہور

مقالہ نگار

- مفتی عبدالقیوم ہزاروی — ناظم اعلیٰ تنظیم المدارس پاکستان، مہتمم جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور۔ ممبر مرکزی رویت ہلال کمیٹی
- مولانا عبدالغفار حسن — شیخ الحدیث والادب، جامعہ تعلیمات اسلامیہ فیصل آباد
- مولانا محمد ناظم ندوی — سابق شیخ الجامعہ اسلامیہ بہاولپور۔ سابق پرنسپل دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو
- مفتی سیاح الدین کاکاخیل — رکن اسلامی نظریاتی مشاورتی کونسل۔ ممبر اقتصادیات اسلامی، انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اکنامکس اسلام آباد
- مولانا سید محمد متین ہاشمی — ریسرچ ڈائریکٹر دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، لاہور
- مولانا عبدالمالک — ناظم اعلیٰ رابطہ المدارس اسلامیہ۔ شیخ الحدیث مرکز علوم اسلامیہ لاہور
- پروفیسر حافظ نذر احمد — پرنسپل شبلی کالج لاہور
- پروفیسر سید محمد سلیم (علیگ) — ڈائریکٹر ریسرچ ادارہ تعلیمی تحقیق تنظیم اساتذہ پاکستان
- مولانا سید عبدالخالق گیلانی — شیخ الحدیث واستاد ادبیات جامعہ عربیہ گوجرانوالہ
- مولانا محمد یاسین ظفر — پرنسپل جامعہ سلفیہ فیصل آباد
- پروفیسر عبداللطیف انصاری — سیکرٹری امور دینیہ، اوقاف، عشر، زکوٰۃ، حکومت آزاد جموں وکشمیر
- سید معروف شاہ شیرازی — ایڈووکیٹ پشاور ہائی کورٹ، سابق ایڈیٹر "اسوہ ڈائجسٹ"
- ڈاکٹر منصور علی — ریسرچ سکالر
- فرید احمد پراچہ — سیکرٹری علماء اکیڈمی منصورہ، لاہور۔ سابق صدر پنجاب یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین
- پروفیسر مسلم سجاد — پروفیسر سپیریئر سائنس کالج کراچی، ومرتب "مجلہ تعلیم اسلامی تناظر میں"



دینی مدارس: غور و فکر کے چند نکات

پروفیسر خورشید احمد

معزز و محترم حاضرین کرام!

اس علمی محفل میں میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ یہ آپ کا فی الحقیقت ایثار ہے جو آپ اس اجلاس میں شرکت کے لئے اپنی مصروفیات سے وقت نکال کر تشریف لائے ہیں۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ ہمارے پاس جو بھی محدود وسائل اور قلیل تعداد میں افراد کار ہیں ان کے ذریعے تعلیم کے اس اہم میدان میں کچھ خدمت انجام دی ہے ہماری دوسری کوشش یہ رہی ہے کہ تمام نقطہ ہائے نظر کو سنا جائے اور باہم افہام و تفہیم کے ذریعے ان تدابیر کی نشاندہی کی جائے جن پر عمل کرنے سے امت مسلمہ اور خصوصاً پاکستان کی بہتری کا راستہ کھل سکے۔

میرا جو بھی پس منظر ہے وہ آپ سب کے سامنے ہے اور کوئی ڈھکا چھپا نہیں ہے میری اور میرے ساتھیوں کی کوشش رہی ہے کہ انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز میں ہم جو کام بھی کریں اس میں ملک کے تمام علمی مکاتب فکر کو شریک کریں، جو چیز بھی تیار کریں اسے پوری قوم کے سامنے لائیں اور ملک کے پالیسی ساز اداروں کو بھی اس سے باخبر کریں لیکن اس کے ساتھ ساتھ مستقبل کے سلسلے میں ہمارا مطمع نظر یہ بھی ہے کہ ہمیں اپنی قوم کے تمام عناصر کو اپنے ساتھ لے کر چلنا ہے۔ اس لئے ہم نے اس ادارے کو آزادانہ بنیادوں پر استوار کیا ہے۔ اختلاف رائے ناپسندیدہ شے نہیں ہے۔ اس لئے ہماری کوشش ہے کہ دوسرے

نقطہ ہائے نظر، مختلف پس منظر اور مختلف زاویہ ہائے نگاہ سامنے آئیں، گفتگو اور باہمی تبادلۂ خیال کے نتیجہ میں ایسے نکات تک پہنچ سکیں جو مشترک ہیں اور جن پر اتفاق ہے اور اگر کہیں اختلاف بھی رہتا ہے تو اس اختلاف کا بھی پورا پورا اظہار ہو جائے۔ ماضی میں بھی قومی اور ملّی حوالے سے اسی طرح فکری افق پر علمی کام آگے بڑھا ہے اور اگر آج بھی ہم اسی جذبے سے کام کریں تو ان شا اللہ کوئی وجہ نہیں کہ ہم اجتماعی طور پر آگے نہ بڑھ سکیں۔

مجھے اپنی کمزوریوں اور خامیوں کا پورا احساس ہے۔ اس کے باوجود آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم یہ کام پورے خلوص نیت اور خدا خوفی سے کر رہے ہیں۔ ہمارا یہ کام ملّی تقاضوں کو پورا کرنے کی ایک اجتماعی کاوش ہے اس ضمن میں آپ جو بھی نشاندہی کریں گے اور جو بھی مشورہ دیں گے اس سے ہم پورا پورا فائدہ اٹھائیں گے۔ ہماری دلی خواہش ہے کہ یہ کام ہم ایک دوسرے کی مدد اور ایک دوسرے کے تعاون سے سرانجام دیں۔ میں آپ تمام حضرات کا ممنون ہوں کہ آپ نے ہم سے تعاون کیا ہے۔

دینی مدارس کے نظام تعلیم کے سیمینار سے پہلے ہمارا "یکساں نظام تعلیم" پر سیمینار ہوا تھا، "تعلیم: اسلامی تناظر میں" ہمارا تعلیمی مجلہ ہے۔ اس میں وہ تحقیق جو اہل علم حضرات ہماری دعوت پر کرتے ہیں شائع کی جاتی ہے۔ "یکساں نظام تعلیم" اس مجلہ کا چوتھا شمارہ تھا۔ اس سیمینار کے مقالات انشاء اللہ پانچویں شمارہ کی شکل میں شائع کیے جائیں گے۔

ہم نے یہ سوچا کہ آپ حضرات کو زحمت دی جائے تاکہ دینی مدارس کی تعلیم کے سلسلہ میں ایک ایسی کوشش کی جائے جس سے اس مسئلے کی اہمیت قوم کے سامنے آسکے۔ میری نگاہ میں تعلیم کا یہ میدان بڑا مظلوم میدان ہے۔ حقیقت ہے کہ دور استعمار اور تحریک آزادی کے دور میں بھی دینی اقدار نبھانے کے لئے دینی علوم کے تحفظ اور علمی روایات کو باقی رکھنے کے لئے ان دینی اداروں نے غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں اور میں یہ تصور کر کے کانپ جاتا ہوں کہ استعمار کے آنے کے بعد اگر یہ دینی تعلیمی ادارے یہاں موجود نہ ہوتے تو اس قوم کا حال کیا ہوتا؟ لیکن دوسری طرف یہ بھی

حقیقت ہے کہ آج ہر شعبے میں جو قیادت ابھر رہی ہے اور ملک کی پالیسی سازی جس رخ پر اور جس ذہن سے کی جا رہی ہے اس میں دینی تعلیم کے اثرات بڑے ہی معمولی بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بڑی ہی جستجو سے تلاش کرنا پڑتا ہے کہ کہاں کس رخ پر دینی یا اخلاقی تصورات کی جھلک موجود ہے۔ جب کہ اس امت کی فی الحقیقت یہ تمنا اور خواہش ہے کہ ان حقیقی علمی روایات کی بازیافت کی جائے جو ہمارے ملّی عروج کا سبب بنیں۔

اسی پہلو سے ہم نے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ آپ کے تعاون سے اس مسئلے کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ دینی تعلیم کے مراکز دوبارہ وہ منصبی کردار کس طرح ادا کرسکتے ہیں جس کے وہ ذمہ دار اور مستحق ہیں اور جس کو اختیار کیے بغیر یہ امت کبھی صحیح رخ پر ترقی نہیں کرسکتی۔ یہ دراصل وہ جذبہ ہے جو اس سیمینار کی بنیاد بنا۔ ہمیں فطری طور پر یہ جائزہ زیادہ سے زیادہ معروضی انداز میں لینا ہے تاکہ حقائق جیسے بھی ہیں ان کو متعین کرسکیں اور پھر جس منزل کی طرف ہمیں جانا ہے اس کے درمیانی فاصلے کا ادراک کریں اور یہ سوچیں کہ اس خلیج کو کس طرح پاٹا جا سکتا ہے۔ اسی بات کو سامنے رکھ کر میں نے غور و فکر کے لئے نو نکات آپ حضرات کی خدمت میں بھیجے تھے[1]۔

ان میں ایک بنیادی چیز یہ تھی کہ دینی مدارس کا اس وقت جو کردار ہے اور جو حال ہے اور جن حالات میں وہ یہ کارِ خیر انجام دے رہے ہیں اس کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے۔ مستقبل کے لئے کوئی بھی کام کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ جہاں ہم اس وقت ہیں اس کا تعین ہو جائے۔ پھر یہ دیکھا جائے کہ دینی مدارس کی تعلیم اپنا وہ کردار کیوں ادا نہیں کر پا رہی ہے؟ اس کے بہت سے پس منظر ہو سکتے ہیں جن پر گفتگو ہو سکتی ہے۔ اس میں کم از کم ایک چیز جس کا آغاز ہمیں کرنا ہے یہ ہے کہ موجودہ چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے کیا حکمت عملی ہو؟ اس کا تعلق مقاصد کے تعین سے، نصاب سے اور افرادِ کار سے ہے۔ کس طرح موجودہ دینی تعلیمی

---

[1] ضمیمہ نمبر ا ملاحظہ فرمائیے

نظام زیر تربیت افراد کی صلاحیتوں اور مزاج میں مثبت تغیر پیدا کرے اور وہ کردار ادا کر سکیں جو انہیں ادا کرنا چاہیے لیکن ابھی ادا نہیں کر پا رہے ہیں۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ دنیا کا اجتماعی نظام بدل چکا ہے، ایک بالکل نیا ماحول اور نئی قیادت وجود میں آ چکی ہے، اسی طرح ایک نیا تعلیمی نظام بلکہ ایک نئی معاشرت، نئی سیاست، نیا قانون اور نئی معیشت تشکیل پا چکی ہیں۔ نتیجہ کے طور پر یہ دنیا کے وہ مسائل ہیں جن سے ہمیں سابقہ پیش آ رہا ہے۔ جب تک اس نظام تمدن کو مجموعی طور پر سمجھا نہ جائے اسے بدلنا ممکن نہیں، اس ہدف کے لئے کم از کم اس نظام تعلیم کی تشکیل جدید از بس ضروری ہے جہاں سے دینی عناصر قوت حاصل کر سکیں۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی سوچنا ہے کہ قدیم و جدید کے اس بُعد کو ختم کرنے کے لیے کون کہاں سے کیا کوششیں کر سکتا ہے۔ یہاں یہ امر واضح رہے کہ اگرچہ قدریں بدل چکی ہیں مگر ہم انہیں قبول نہیں کر سکتے ہیں۔ انہیں بہرحال اپنے دینی مقاصد کے مطابق ڈھالنا ہے۔ دینی عناصر اور دینی تعلیمی ادارے اس میدان میں کیا کردار ادا کر سکتے ہیں؟ اس مکالمے کو بحال کرنے کی ضرورت ہے۔

ہم نے اس سیمینار میں چند موضوعات کو آپ کے سامنے رکھا ہے۔ اس میں معیار تعلیم کا مسئلہ ہے، نصاب اور کتب کا مسئلہ ہے، دینی قیادت کا مسئلہ ہے۔ فن تدریس، فن تربیت اور اس سلسلے میں جو عصری تبدیلیاں ہوئی ہیں ان سے استفادہ کرنے کی حدود اور طریق کار کا مسئلہ ہے۔

یہ امر واقعہ ہے کہ آج ہمارے دینی مدارس کا نصاب تعلیم اس سے بہت مختلف ہے جب مسلمان حکمران تھے، اس وقت کا نظام تعلیم معاشرت و حکومت کے عصری تقاضوں سے مربوط تھا اور جو نتائج دے رہا تھا وہ آج کا دینی نظام تعلیم نہیں دے رہا ہے۔

اس سے ہمیں یہ قرینہ بھی ملتا ہے کہ کیوں نہ دونوں نظام ہائے تعلیم کو یکجا کر دیا جائے۔ واقعہ ہے کہ دور عروج میں دین اور دنیا کی تعلیمی ضرورتیں ایک ہی نظام تعلیم پوری کر رہا تھا۔ لیکن دور انحطاط اور پھر دور محکومی میں دینی ضروریات پوری کرنے والا نظام تعلیم معاشرت و ریاست

کے تقاضوں سے بے تعلق پود تیار کرنے لگا اور دنیاوی ضروریات پوری کرنے والے نظام تعلیم کو دینی تقاضوں سے کوئی علاقہ نہ رہا۔ ہماری یہ خواہش ہے کہ مستقبل میں پھر اسی علیم الشان نظام تعلیم کو رائج کیا جائے جو تعلیم کے ان دونوں دھاروں کو ساتھ ساتھ لے کر چل رہا ہو۔ اس اعتبار سے یہ توقع بالکل بجا ہے کہ علماکرام جو بھی نظام تعلیم تشکیل دیں اس میں اس ضرورت اور تعلیمی روایت کو ملحوظ رکھیں جس کے نتیجہ میں ان کا نظام تعلیم ایک طرف علما تیار کرے وہاں دوسری جانب زندگی کے دیگر شعبوں کو بھی متاثر کرے۔

اگر ہم اس نظام اور نصاب کے موجودہ مرحلہ میں صرف چار میدان کار کو ہدف بنائیں اور اگلے دس، پندرہ، بیس اور پچیس سال میں جم کر تجربے، عمل اور ترویج کی کوشش کریں تو انشاء اللہ کوئی وجہ نہیں کہ وہ مطلوبہ پالیسی جس کی جانب ہماری نگاہ بار بار اٹھتی ہے، اسے ہم نہ پالیں۔

پہلا میدان کار ایسے علما اور فقہا کی تیاری ہو سکتا ہے جو فی الحقیقت دین میں درک رکھتے ہوئے فہم دین سے منور ہوں، ان کے اندر صلاحیت ہو کہ وہ قرآن وسنت کو سمجھ سکیں۔ مزید یہ کہ آج ہمیں ایسے قانون دانوں، فقہا اور قاضیوں کی ضرورت پڑ رہی ہے جو بیرون ملک پیدا ہونے والی ضرورتوں کو پورا کر سکیں۔ قومی ضروریات پورا کرنے کے لئے ایسے افراد بھی تیار کرنا چاہئیں جو شریعت اور دوسرے قوانین کی تشریح وتعبیر کر سکیں۔ اس وقت دینی مدارس سے جو تعداد پڑھ کر نکل رہی ہے اس میں بہت ہی کم افراد اس چیلنج کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ اگر ہم ایسے افراد کار تیار نہ کر سکے تو بحیثیت مجموعی چوٹ کھا جائیں گے۔

دوسرا میدان کار ایسے خطیب اور امام تیار کرنا ہو سکتا ہے جو مسلم معاشرے کی بنیادی ضرورت ہیں۔ یہ افراد ہمارے محسن ہیں اور انہی کے ذریعے ہم نے قرآن کو پڑھا اور دین کو سیکھا ہے لیکن اس ضمن میں بھی ایک قدم آگے بڑھائیں تو آج کی ملکی اور بیرونی ضروریات کے تحت "مبلغ اور داعی" بھی تیار کریں جو ملک اور ملک سے باہر خدمات انجام دے سکیں۔ اس وقت مسئلہ یہ ہے کہ یورپ، افریقہ اور امریکہ میں مسجدیں اور اسلامک سنٹر موجود ہیں مگر پاکستان، بنگلہ دیش

اور بھارت سے جانے والے خطیب وامام ان معاشروں اور مقامی افراد کے ذہن کو نہیں سمجھ پا رہے ہیں۔ جو افراد یہاں سے جاتے ہیں ان میں سے سو میں ایک یا دو ہی انگریزی سمجھ یا بول سکتے ہیں۔ یہ ہماری دینی ذمہ داری ہے کہ نومسلم بھائیوں کو سنبھالیں اور غیر مسلم معاشروں کو اسلام سے روشناس کرائیں اور دین اسلام کی دعوت کو پہنچائیں۔ اس اعتبار سے انگریزی سیکھنا کلیدی اہمیت کا حامل ہے۔

تیسرا میدان اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے لئے ایسے اساتذہ کی تیاری کا ہو سکتا ہے جو عربی، فارسی اور اسلامیات کی تدریس کر سکیں، بلکہ میں اس سے بھی آگے بڑھوں گا کہ دینی تعلیم کے حصول کے بعد چار یا پانچ سال لگا کر دینی تعلیم گاہوں کے ذہین افراد معاشیات، سیاسیات، عمرانیات اور قانون میں بھی مقام پیدا کریں۔ اگر ہم یہ ہدف بنالیں تو آپ دیکھیں گے کہ اگلی اور اس کے بعد کی نسل کو یہ درس گاہیں ذہن ساز شخصیتیں دے سکیں گی۔ اس طرح بے دین شارحین اور متجددین کے بجائے دینی تعلیم کے فارغ التحصیل ماہرین عمرانیات رہنمائی کے منصب کو سنبھال لیں گے اور یہ ایک دوررس انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔

چوتھا دائرہ صحافت، انتظامیات اور خدمت عامہ وغیرہ کا ہو سکتا ہے۔ اس میں چند منتخب دینی مدارس کو منصوبہ بنا کر اپنا رول ادا کرنا چاہئے۔ یہ بہت بڑا میدان ہے جہاں ہزاروں افراد کو ہم بھیج سکتے ہیں اور یہ افراد یقیناً سیکولر تعلیم کے فارغ افراد سے بہتر ثابت ہو سکتے ہیں۔

اگر یہ چار چیزیں اپنے سامنے رکھ کر آپ دینی مدارس کے نصاب و نظام تعلیم پر نگاہ بازگشت ڈالیں تو بڑی آسانی سے یہ معلوم ہو سکے گا کہ ہمیں کہاں کہاں تبدیلی کی ضرورت ہے اور اس کی حکمت عملی کیا ہو سکتی ہے۔

مثال کے طور پر پرائمری یا ابتدائی درجہ میں صورت یہ ہو کہ قرآن پاک، سنت رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم، فقہ کا عمومی فہم حاصل ہو، عربی زبان کے لئے اس مدت میں ایسا سہل نظام تدریس اختیار کریں جس سے، ہر شخص بنیادی قواعد و اسالیب کو سمجھ لے اور اسی کی بنیاد پر اگلے درجوں میں وہ

حصول علم کر سکے۔ اس سے اگلے درجے میں گہرائی میں جائیں اور وہاں پر مختلف علوم کو الگ الگ کر سکتے ہیں۔ مثلاً جن افراد کو "فقیہ" بنانا ہے ان کو عربی زبان، منطق اور اصول پڑھائیں۔ لیکن جن افراد کو "مدرس یا مبلغ" بنانا ہے ان کے لئے نصاب میں ذرا تبدیلی کریں جس سے ان میں ایسی استعداد پیدا ہو جائے کہ آگے چل کر حکمت تدریس اور حکمتِ تبلیغ کو احسن انداز سے روبہ عمل لا سکیں۔ اس مقصد کے لئے ہمیں فن تعلیم کی سائنس (Education Science) اور نفسیات کے مضامین کو اسلامی فلسفہ و حکمت کے مطابق ترتیب دینا ہوگا۔ یہ کام کوئی مشکل نہیں ہے۔ اس کے بعد تخصص (Specialization) کا مرحلہ آتا ہے۔ کچھ لوگ امام خطیب اور مدرس بن کر عملی زندگی میں داخل ہو جائیں گے یا کچھ افراد ایم اے کریں گے۔ لیکن کچھ افراد ایسے ضرور ہوں جنہیں درجہ تخصص میں فقیہ بنایا جا سکے۔ ان کے لئے تحقیق و تالیف کی تربیت اور بیرونی زبانوں کی تعلیم کا انتظام کرنا ہوگا۔ یہ کام سارے ادارے تو نہیں کر سکتے لیکن بہر طور ملک کے چار پانچ دینی تعلیمی ادارے بھی اس ضمن میں منصوبہ سازی اور حکمت عملی تیار کر لیں تو حقیقی معنوں میں بہت بڑی خدمت ممکن ہو سکتی ہے۔

اس طرح اپنی تعلیمی روایت کو مجروح کئے بغیر نیا کردار بھی سامنے آسکے گا اور نئی ضرورتوں کا کوئی حل بھی پیش ہو سکے گا۔ سوچ بچار کے لیے یہ ابتدائی نوعیت کی تجویز ہے جس کو مزید گہرائی میں جا کر عملی شکل دی جا سکتی ہے۔ میری دلی تمنا ہے کہ کاش اس حوالے سے کام کرنے کے لیے کوئی قدم اُٹھے۔

آپ حضرات نے بیشتر موضوعات پر دلائل کے ذریعے مفصل تحریری رائے کا اظہار کیا ہے یا کم از کم اپنی ترجیحات کا اظہار فرمایا ہے لیکن میرا تاثر ہے کہ اس وقت تک جو مقالات پیشگی موصول ہوئے ہیں ان میں چند پہلوؤں پر سرسری ذکر تو موجود ہے لیکن اس کا پوری گہرائی کے ساتھ جائزہ نہیں لیا گیا خصوصیت کے ساتھ وہ تین موضوعات یہ ہیں اولاً فقہی اور مسلکی اختلافات کا مسئلہ ہے ثانیاً دو نظام ہائے تعلیم یعنی دینی اور دنیاوی نظام تعلیم کے انضمام و اشتراک کا مسئلہ اور ثالثاً دینی

اور دنیاوی نظام تعلیم کے انضمام و اشتراک کا مسئلہ اور چوتھا "دینی مدارس اور حکومت کے تعلق کا مسئلہ ہے"
مسلمانوں میں فروعی اور مسلکی اختلافات کا حل ہرگز کسی قوت، قانون اور حکومت کے دباؤ سے
ممکن نہیں ہے۔ چونکہ مسئلہ دین کا ہے اور ہر مسلک پر قائم فرد اسے دین کا بنیادی تقاضا سمجھ
کر جیا ہوا ہے۔ لیکن اگر تمام علما خود مل کر کسی مرکزی وفاقی بورڈ کے ذریعے متحدہ نصاب تجویز
کریں اور یکساں نظام امتحان بنالیں، اور اس طرح باہم مشورہ و تبادلہ خیال کی مستقل بنیاد فراہم ہو
جائے تو امکان ہے کہ آئندہ تعلیمی عمل متحد اور یکساں ہو، اس کی وجہ سے اختلاف مسالک
خود بخود گھٹتا چلا جائے گا۔ باقی اختلاف کے ضمن میں امر واقعہ یہ ہے کہ اگر ایک دوسرے کو
اسلام سے خارج نہ سمجھا جائے تو اصلاح ممکن ہے علمی سطح پر اختلاف اور چیز ہے لیکن فرق بن
کر دوسرے کی تکفیر کرنا الگ چیز ہے۔ بدقسمتی سے اختلاف نے کافر سازی کی جس رسم کو ہمیں
گھرا کر دیا ہے اس کا آغاز یہودی سازش سے ہوا لیکن اس کی جدید ترین شکل ہمیں استعماری
طاقتوں نے مہیا کی ہے۔ بذات خود اختلاف تعبیر کی موجودگی میں تحقیقات ہوتی ہیں کہ کس کی رائے
درست ہے اور کس بنیاد پر درست ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ تعلیمی نظم اور نصاب میں ہم آہنگی اور
یکسانیت اور اساتذہ کے باہم استفادہ کے نتیجہ میں اختلاف کی شدت گھٹ جائے گی اور فرقہ واریت
کی جگہ دلیل کی بنیاد پر علمی اختلاف رائے کا باوقار انداز متعارف ہو سکے گا۔ ماضی میں بھی دراصل
یہ شکل تھی کہ اختلاف تو کسی نہ کسی دائرے میں تھا لیکن ایک مسلک کے فقہا اور علما کے شاگرد
دوسرے مسلک کے اساتذہ کے پاس جاکر استفادہ کرتے تھے۔ پہلے ان سے پڑھا تو پھر دوسرے
سے بھی جاکر پڑھا۔ اس اعتبار سے کتنی تابناک تعلیمی روایت ہمارے ہاں موجود رہی ہے۔ اس تنظیمی
روایت کا احیا امت کا بہت بڑا مسئلہ ہے۔

حکومت اور دینی مدارس کے تعلقات کا بڑا اہم بڑا نازک اور بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے جس میں
نزاکتیں اور مشکلات بھی ہیں۔ سرکاری سرپرستی سے جہاں بہت سے مواقع حاصل ہوتے ہیں
وہاں اس سے بہت سی پابندیاں بھی لگ جاتی ہیں اور بہت سی زنجیریں پڑ جاتی ہیں۔ ماضی میں

ہماری یہ روایات رہی ہیں کہ ہم نے سرکاری سرپرستی بھی حاصل کی اور اپنی آزادی کو بھی برقرار و محفوظ بھی رکھا۔ آج کے حالات میں اس مسئلے کا حل سوچنا ہے۔

اسی طرح اس وقت دو متوازی نظام ایک دینی تعلیم کے نظام اور دوسرا جدید تعلیم کے نظام کا مسئلہ ہے۔ ان دونوں کو کس طرح ایک دوسرے کے قریب لایا جائے۔ کیا ان کے انضمام کی کوئی تدریجی پالیسی جس کے تحت ایک خاص مدت میں یہ دونوں نظام مل جائیں پھر جو نیا نظام ہو وہ دینی اور دنیاوی دونوں ضرورتوں کو پورا کرے۔ ابتداً ان دونوں میں کچھ اصلاحات کی جائیں ان دونوں کے درمیان کچھ پل بنا دیئے جائیں۔ اس طرح کوئی ایسا راستہ بن سکے، جو آگے چل کر اس بُعد کو دور کر سکے اور تعلیم کا ایک نیا ماڈل تیار ہو سکے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان دونوں نظام ہائے تعلیم کا اپنا ایک مزاج ہے اور اگر ان کو ایک دوسرے میں ضم کر دیا جاتا ہے تو پھر اس سے نفسیاتی تبدیلیاں واقع ہوں گی۔

یہ وہ سارے نازک پہلو ہیں جن پر سوچ بچار اور بار بار غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے اور پھر قوم کے سامنے کوئی ایسا راستہ رکھنے کی ضرورت ہے کہ ہم کس طرح یہ کام سرانجام دے سکتے ہیں۔ پاکستان سے باہر مسلم دنیا میں اس پہلو پر جو کوششیں ہو رہی ہیں وہ بھی ہمارے پیشِ نظر رہنی چاہئیں۔

ہم نے جو نو موضوعات آپ کو پیش کئے ہیں ان میں پورے طریقے سے ان تمام مسائل و معاملات کا احاطہ تو ممکن نہیں جو درپیش ہیں مقصد یہ تھا کہ اس طریقے سے سوچنے کی کچھ راہیں کھلیں، اور جو دوسرے موضوعات اور دوسرے مسائل ہیں ان تک پہنچنے کے لئے یہ ممد و معاون ثابت ہوں۔

مجلّہ تعلیم۔ ۱

اسلامی تناظر میں

مقالات

پاکستان میں دینی مدارس مختصر جائزہ

پروفیسر حافظ نذر احمد

مدارس عربیہ پاکستان سے مراد وہ درسگاہیں ہیں، جو پاکستان کے طول و عرض میں، ہر قریہ و بستی میں موجود ہیں۔ دینی تعلیم و تربیت کے یہ ادارے بالعموم جامعہ، دارالعلوم یا مدرسہ عربیہ اسلامیہ کے نام سے موسوم ہیں۔ ان درسگاہوں میں عربی زبان کا معروف نصاب "درسِ نظامی" رائج ہے۔ یہ نصاب علامہ نظام الدین شہید سہالوی متوفی ۱۱۶۱ھ / ۱۷۴۷ء کا مرتب کردہ ہے۔

درسِ نظامی کے آٹھ یا نو سالہ نصاب کی تمام کتب عربی زبان میں ہیں۔ ذریعہ تدریس بالعموم اردو ہے۔ صوبہ سندھ اور بلوچستان کے کچھ مدارس میں، خصوصاً مضافاتی مدارس میں تدریس پشتو زبان میں ہو رہی ہے۔ اسی طرح صوبہ سندھ کے مضافاتی مدارس میں ذریعہ تدریس سندھی ہے۔ باقی دور و نزدیک تدریس اردو زبان ہی میں ہو رہی ہے۔

حفظ و ناظرہ قرآن کریم کے مکاتب اور مدرسے ہر چھوٹے بڑے شہر [illegible]ات اور دیہات میں بھی موجود ہے۔ ان میں قرآن مجید حفظ و ناظرہ کا اہتمام ہے۔ اس [illegible] بعض مدارس و مکاتب میں تجوید و قرأت اور ابتدائی تعلیم کا انتظام بھی ہوتا ہے۔ خصوصاً قصبات و دیہات میں نیک دل خواتین اپنے گرد و نواح کی بچیوں اور بچوں کو ابتدائی دینی معلومات اور ناظرہ قرآن سے بہرہ ور کرتی ہیں۔

مختلف مسالک اور ان کی تنظیمیں

یہ ایک انتہائی خوش آئند صورت حال ہے کہ مسلک و مشرب کے اختلاف کے باوصف مدارس

عربیہ کا نصاب بہت حد تک مشترک ہے، خصوصاً اہل سنت والجماعت بریلوی اور دیوبندی مسالک کے جملہ مدارس میں از اول تا آخر ایک ہی نصاب ہے۔ مشمولہ نصاب کتابیں بھی دو چار کے سوا تمام مشترک ہی ہیں۔

چاروں مسالک دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث اور شیعہ مدارس کے وفاق اور تنظیمیں موجود ہیں۔ یعنی تنظیم المدارس لاہور (بریلوی مدارس) وفاق المدارس ملتان (دیوبندی مدارس) وفاق المدارس فیصل آباد (اہل حدیث) اور وفاق المدارس (شیعہ) لاہور۔ اکثر و بیشتر مدارس ان تنظیموں سے وابستہ ہیں۔

نظم و اتحاد کے علاوہ ان تنظیموں سے ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ یہ تنظیمیں اپنے اہتمام اور اپنی زیر نگرانی آخری درجات کے امتحان منعقد کرتی ہیں اور کامیاب طلبا کو سندات جاری کرتی ہیں۔ حکومت نے ان کی سندات کو منظور کر لیا ہے ــــ البتہ کچھ مدارس کسی تنظیم سے وابستہ نہیں۔

مزید برآں یہ کہ مختلف مسالک کے مدارس کی کوئی ایک مرکزی تنظیم نہیں جو وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔

محل وقوع اور ماحول

عام [illegible] س عربیہ مساجد سے ملحق ہیں۔ پاکستان میں شاذ ہی کوئی ایسی بڑی اور جامع مسجد ہو گی [illegible] ساتھ کوئی مکتب، مدرسہ یا دارالعلوم قائم نہ ہو۔ اس سے نہ صرف تعمیر (بلڈنگ) کے مسئلہ کو حل کرنے میں مدد ملتی ہے، بلکہ اس سے مدرسہ کا تقدس اور نظم کی خوبی بحال رکھنے کا عظیم فائدہ مرتب ہوتا ہے۔ کیونکہ مسجد بجائے خود تربیت کا اہم مقام ہے۔ مسجد اور مدارس کے ماحول میں کسی شورش، ہڑبونگ اور بدنظمی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

حسب ضرورت، مدارس کی اپنی عظیم الشان عمارات بھی ہیں۔ ان مدارس میں طلباء کی اکثریت اقامتی ہوتی ہے، اس لیے ہر مدرسہ کا اپنا ہاسٹل ہوتا ہے۔

طرزِ تدریس

- مدارس عربیہ کا نصاب درس نظامی ہے، یا اس کی قدیم واصلاح شدہ صورت ہے۔
- ذریعۂ تعلیم بالعموم قومی زبان اردو ہے۔ صرف مضافاتی علاقوں کے مدارس میں تدریس پشتو یا سندھی میں ہوتی ہے۔
- اندازِ تدریس کتابی و تقریری ہے۔
- طلبہ اپنے آئندہ سبق کا پیشگی مطالعہ کرکے شامل درس ہوتے ہیں۔
- اسباق میں کتاب کی عبارت طلبا خود پڑھتے ہیں۔ اس سے نہ صرف تلفظ کی درستی ہوتی ہے بلکہ مطالعہ کی عادت بھی پختہ ہوتی ہے۔
- دورانِ تدریس اساتذہ کرام سبق کے مشکل مقامات کی تشریح کرتے ہیں۔ اکثر وضاحت سوال وجواب کی صورت میں ہوتی ہے۔

مدارس عربیہ کے طرز تدریس کی ایک دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہاں طلبہ اپنے اساتذہ کے گرد گھومتے ہیں وہ خود چل کر اپنے اساتذہ کے کمروں میں، ان کی مسند کے سامنے دائرہ کی شکل میں دو زانو مؤدب بیٹھتے ہیں نہ یہ کہ اساتذہ طلبأ کے کمرۂ جماعت میں حاضر ہوں۔

اساتذہ کا احترام دیدنی ہوتا ہے، ان کے جوتے اٹھانا اور پیر دبانا طلباء اپنے لیے باعث فخر تصور کرتے ہیں۔

مسجد کے ماحول، نصابی کتب کے تقدس، اور تعلیم کو ایک عبادت سمجھنے کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ مدارس عربیہ کا نظم ونسق انتہائی پاکیزہ اور مثالی رہتا ہے۔ یہاں کسی ہڑتال اور احتجاج کی ناخوشگوار صورت حال پیدا نہیں ہوتی۔

مدارس عربیہ کے طرز تدریس کی ایک دوسری خصوصیت علم میں گہرائی اور گیرائی ہے۔ یہاں کسی ٹیسٹ پیپر، گیس پیپر، آسان رہنما کتب (گائیڈ بک) یا ترجمے اور خلاصے کا کوئی رواج نہیں

اصل کتب کے مطالعہ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ طلباء اپنی نصابی کتب پر مکمل طور سے حاوی ہوتے ہیں۔

طلباء نہ صرف سبق کا پیشگی مطالعہ کرتے ہیں، بلکہ بعد مغرب اجتماعی طور پر دن کے خواندہ اسباق کا اعادہ کرتے ہیں جسے تکرار کہا جاتا ہے۔ اعادہ و تکرار عام طور پر اساتذہ اور محنتی طلباء کی زیر نگرانی ہوتا ہے اور اسے تعلیم کا ایک لازمی جزو تصور کیا جاتا ہے۔

توجہ طلب امور

ان تمام خوبیوں کے ساتھ بعض امور انتہائی توجہ طلب ہے۔ ان میں سرفہرست نصاب کا مسئلہ ہے۔ بعض مضامین ترمیم و اضافہ کے متقاضی ہیں۔

اس طرح نصاب کی مشمولہ کتب بہت قدیم ہیں، جن سے مندرجات اور معلومات دور ازکار اور غیر ضروری ہو چکی ہیں۔

عصری علوم، اور جدید معلومات سے بے خبری مدارس عربیہ کے طلباء کو معاشرہ سے دور رکھنے کا موجب بنی ہوئی ہے۔ یہ مسئلہ لاینحل نہیں، حضرات علمائے کرام کی اجتماعی توجہ کی ضرورت ہے۔

جدید تقاضوں کے پیش نظر نصاب میں بعض مضامین کا شمول ازبس ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً جدید فلسفہ، اقتصادیات، تقابل ادیان اور مطالعہ تحریکات جدیدہ وغیرہ مدارس عربیہ کے طلباء میں غیر نصابی مطالعہ کا فقدان، اور غیر تدریسی سرگرمیوں سے احتراز ان کے اور معاشرہ کے درمیان بُعد کا سبب بنا ہوا ہے جو ملک و ملت کے لیے ایک بڑی محرومی کی بات ہے۔

جائزہ اعداد و شمار

مدارس عربیہ کے بارے میں اس وقت تک تین کتابیں شائع ہوئی ہیں

جائزہ مدارس عربیہ مغربی پاکستان مرتبہ حافظ نذر احمد (۸۰۰ صفحات) ۱۹۶۰ء

جائزہ مدارس عربیہ پاکستان " " (۲۰ ۷ صفحات) ۱۹۷۲ء

رپورٹ قومی کمیٹی برائے دینی مدارس وزارت امور مذہبیہ (۲۲۰ صفحات) ۱۹۷۹ء

زیر نظر اعداد و شمار انہی کتابوں سے ماخوذ ہیں۔

تعداد مدارس ۸۹۳

الف) باعتبار مسلک

حنفی دیوبندی	۳۵۴
حنفی بریلوی	۲۶۷
اہلِ حدیث	۱۱۴
شیعہ	۴۱
بلاتخصیص	۱۰۵

ب) باعتبار صوبہ جات

صوبہ پنجاب میں	۵۸۰
صوبہ سندھ	۱۳۰
صوبہ سرحد	۱۴۹
صوبہ بلوچستان	۴۴

ج) باعتبار کثرت ضلع وار

پنجاب میں ضلع ملتان	۸۳
سرحد میں ضلع بنوں	۲۷
سندھ میں ضلع سکھر	۳۰
بلوچستان میں ضلع قلات	۱۳

د) باعتبار کثرت شہر

لاہور	۳۴
کراچی	۳۳

ملتان	۱۴
فیصل آباد	۱۳
گوجرانوالہ	۸

(ھ) عہد بہ عہد ترقی سند تاسیس کے اعتبار سے

۱۹۴۷ء	میں	۱۳۷
۱۹۵۰ء	میں	۲۴۴
۱۹۶۰ء	"	۶۷۱
۱۹۷۲ء	"	۸۹۳
اس وقت تقریباً		۱۰۰۰

تعداد طلبا ۹۹۰۴۱

ان تمام مکاتب و مدارس کے طلبا کی تعداد کا تخمینہ ممکن نہیں جو ہر قریہ و بستی میں بلکہ ہر گاؤں اور محلے میں قائم ہیں۔ صرف دار العلوم، بڑے مدارس اور جامعات کے طلبأ کے اعداد و شماریوں ہیں!

(الف) مضامین کے اعتبار سے

دورۂ حدیث (آخری درجہ)	۲۴۲۲
موقوف علیہ (وسطانی درجہ)	۴۵۳۹
تجوید قرأت	۷۸۵۱
ابتدائی درجات	۴۵۴۲۰

(ب) صوبوں کے اعتبار سے

صوبہ پنجاب	۸۱۱۳۴
صوبہ سندھ	۸۳۴۴

صوبہ سرحد	۷۷۴۹
صوبہ بلوچستان	۱۸۱۴

ج) تینتیس (۳۳٪) طلبا بیرونی و دارالاقامہ میں مقیم، باقی مقامی ہیں۔ ۱۶۴۶ طلبا غیر ملکی ہیں

د) باعتبار استعداد

مڈل پاس	۱۶۵۱
میٹرک	۶۹۳
ایف اے/بی اے	۲۸۵
فاضل السنہ	۲۶۴

تعداد اساتذہ ۵۰۰۵

ان میں ۴۸۴ ثانوی تعلیمی بورڈ اور یونیورسٹیوں کے مستند ہیں، ۳۵۴ درس نظامی کے سند یافتہ ہیں۔ باقی کے کوائف دستیاب نہیں ہو سکے۔

مدارس عربیہ کے دوسرے اہم شعبے

۱۔ دارالافتاء

مدارس عربیہ کی تدریسی و تربیتی خدمات کے علاوہ اہم شعبہ "دار الافتاء" ہے۔ یہاں سے دینی مسائل، عائلی قوانین، معاشی و معاشرتی مسائل کے سلسلہ میں استفسارات کے جواب میں مصدقہ فتوے جاری کئے جاتے ہیں۔ عامۃ المسلمین کے علاوہ عدالتیں بھی بوقت ضرورت ان سے رجوع کرتی ہیں۔

۳۱۵ مدارس میں دارالافتاء باقاعدہ موجود ہیں۔ بالعموم وہ استفسارات اور ان کے جواب میں جاری شدہ فتاویٰ کا باقاعدہ ریکارڈ بھی رکھتے ہیں۔

۲۔ دارالتصنیف

۱۰۴ مدارس عربیہ کے ہاں "دارالتصنیف" کے نام سے تصنیف و تالیف اور نشر و اشاعت کا شعبہ موجود ہے۔

۳۔ جرائد

۲۱ مدارس کے اپنے باقاعدہ ماہانہ/ پندرہ روزہ/ ہفت روزہ دینی اور علمی جرائد و مسائل ہیں

۴۔ دارالکتب

مدارس عربیہ ہر طالب علم کو درسی کتب خود مہیا کرتے ہیں، اس لیے درسی کتب کی حد تک تو ہر مدرسہ کا اپنا کتب خانہ لازماً موجود ہے۔ درسی کتب کے علاوہ ہر دینی موضوع کی کتب پر مشتمل کتب خانے ۶۱۲ مدارس میں موجود ہیں ان میں موجود کتب حوالہ کی تعداد ۳۲۴، ۸۳، ۱ ہے۔

قلمی کتب کی تعداد ان کے سوا ہے۔ ان قلمی کتب میں بعض انتہائی نادر اور اہم مخطوطات ہیں۔

۵۔ ملحقہ جدید تعلیم کے ادارے

عوامی دور میں قومیائے جانے سے قبل مدارس عربیہ کے زیر اہتمام اور زیر نگرانی مندرجہ ذیل ادارے قائم تھے۔

ڈگری اور انٹر کالج	۵
ہائی سکول	۷
مڈل اور لوئر مڈل سکول	۱۱
پرائمری سکول	۳۲

قومی تحویل میں لیے جانے کے بعد اب صرف چند مدارس عربیہ کے تحت پرائمری سکول قائم ہیں۔ دو تین مدارس میں میٹرک اور ایف اے کے نصاب کی تدریس کا انتظام ہے۔

دو تعلیمی نظام

اب میں عرض کرتا ہوں دو تعلیمی نظاموں کے بارے میں، ہماری رائے میں بیک وقت دو نظام تعلیم رائج رہنا غیر مفید اور خالی از افادہ نہیں اس لیے کہ دونوں نظام ہائے تعلیم کے مقاصد بھی مختلف ہیں اور ان مقاصد کے حصول کے لیے نصاب تعلیم بھی مختلف ہیں۔

جدید نظامِ تعلیم کے مقاصد

۱۔ پاکستانی عوام کے دل و دماغ پر عام طور پر، اور طلبا کے دل و دماغ پر خاص طور پر مسلم قومیت اور اسلام سے وفاداری کے جذبہ پر زور دینا تاکہ مختلف صوبوں کے باشندوں اور اقلیتی لوگوں میں نظریاتی یک جہتی پیدا ہو۔[1]

۲۔ طلبا کے دلوں میں یہ احساس پیدا کرنا کہ وہ نہ صرف پاکستانی مسلم قوم کے فرد ہیں بلکہ مسلم اُمّہ کے بھی ایک جزو لاینفک ہیں۔ ان کے وجود کا مقصد ایک طرف دنیا بھر کے مسلمانوں کی خیر سگالی ہے اور دوسری طرف دنیا بھر میں تبلیغ اسلام ہے۔

۳۔ قرآن و سنت کے مطابق پاکستانی طلباء کے کردار اور عادات و اطوار کو ڈھالنا جس سے ان کے قول و فعل میں تضاد نہ رہے۔

۴۔ تربیت اور مشق کے ذریعہ فرد کی امکانی قوتوں کو بروئے کار لانا، تاکہ وہ معاشرہ کو اسلامی نظریہ کے مطابق تشکیل دے سکے۔

۵۔ مذہب و ملت کی کسی تخصیص کے بغیر عوام کو بالعموم اور نوجوانوں کو بالخصوص تعلیم سے بہرہ ور کرنا، تاکہ وہ قوم کے لیے مفید شہری بن سکیں۔

۶۔ نوجوانوں میں حصول علم اور تحقیق و تدقیق کی دلچسپی پیدا کرنا، یہاں تک کہ وہ تعلیم کو ایک

---

[1] بظاہر یہ اعلان کیا گیا ہے مگر عملاً اس ضمن میں بڑی نیم دلانہ پالیسی ہے۔ مرتبین

تسلسل اور سعی پیہم کی شکل دے سکیں۔

۷۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم و تدریس اور ملک میں تحقیق و تدریس کا مکمل انتظام کرنا جس سے ملک مستقبل میں خود کفیل اور محفوظ ہو جائے۔

(National Education Policy 1978 p. 12)

جدید نظام تعلیم کے مراحل

جدید نظامِ تعلیم مندرجہ ذیل مراحل میں منقسم ہے۔

۱۔ ابتدائی (پرائمری)

۲۔ مڈل سکول

۳۔ ہائی سکول

۴۔ انٹرمیڈیٹ (الیف اے، الیف الیس سی)

۵۔ بی اے، بی الیس سی۔

۶۔ ایم اے، ایم الیس سی۔

جدید نظامِ تعلیم کے مضامین

۱۔ پرائمری	اردو، ریاضی، مطالعۂ پاکستان، جغرافیہ، ناظرہ قرآن، اسلامیات۔
۲۔ مڈل	اسلامیات، اردو، انگریزی، مطالعۂ پاکستان، ریاضی، عربی، ناظرہ قرآن
۳۔ ہائی کلاسنر	اسلامیات، اردو، انگریزی، مطالعۂ پاکستان

(سائنس گروپ کے لیے) ریاضی اختیاری، طبعیات، کیمیا، بیالوجی

(آرٹس گروپ کے لیے) ریاضی لازمی، جنرل سائنس، دو مزید مضمون (اختیاری)

۴۔ انٹرمیڈیٹ	اسلامیات و مطالعۂ پاکستان، اردو، انگریزی، تین مزید مضمون (اختیاری)

کامرس گروپ اس کے علاوہ ہے۔

۵۔ بی اے	اسلامیات و مطالعۂ پاکستان، انگریزی، دو مزید مضمون (اختیاری)

ایک مضمون (زائد اضافی اختیاری)

اختیاری مضامین میں مندرجہ ذیل مضمون شامل ہیں۔

(سائنس) طبعیات، کیمیا، بیالوجی، زوالوجی، اسٹرالوجی وغیرہ

(السنہ) عربی، فارسی، اردو، پنجابی، سندھی، بلوچی، براہوی وغیرہ

(آرٹس) تاریخ، جغرافیہ، نفسیات، اقتصادیات، شہریت، ایجوکیشن، جرنلزم، میوزک، فائن آرٹس وغیرہ

۶۔ ایم۔اے، ایم۔ایس۔سی	السنہ، آرٹس، اور سائنس کے متعدد مضامین

نوٹ (۱)، ناظرہ قرآن

سال ۶۱-۱۹۶۰ء میں ناظرہ قرآن خوانی کو باقاعدہ نصاب کا حصہ قرار دیا گیا۔ جماعت سوم میں قاعدہ یسرنا القرآن اور جماعت چہارم سے ہشتم تک ناظرہ قرآن کی تدریس نصاب کا لازمی حصہ قرار دی گئی ۔۔۔ لیکن میرے جائزے اور ذاتی معلومات کی حد تک پورے ملک کے دریں بھر سکولوں میں قرآن کریم کی از اول تا آخر تدریس کا سرکاری طور پر کوئی انتظام پچیس سال میں نہیں ہو سکا ہے۔ اپنے طور پر کہیں کہیں یہ کار خیر انجام پا رہا ہے۔

تدریسِ اسلامیات جدید نظامِ تعلیم میں

۱۹۵۰ء میں ایف اے، ایف ایس سی میں اسلامیات بطور ایک زائد اختیاری (Aditional, Optional) مضمون ۵۰ نمبر

۱۹۵۰ء میں ایم اے میں اسلامیات کا شمول

۱۹۵۰ء میں پرائمری، مڈل کلاسز میں اسلامیات بطور لازمی مضمون ۱۰۰ نمبر

۱۹۵۶ء میں بی اے میں اسلامیات بطور اختیاری مضمون ۲۰۰ نمبر

بی اے، بی ایس سی میں اسلامیات بطور ایک اضافی اختیاری مضمون ۵۰ نمبر

۱۹۵۸ء میں ایف اے اسلامیات بطور اختیاری مضمون ۲۰۰ نمبر

۱۹۶۲ء میں ہائی کلاسز (میٹرک) میں اسلامیات بطور اختیاری مضمون ۲۰۰

۱۹۶۲ء میں ایف اے/ایف ایس سی سے اسلامیات اضافی اختیاری مضمون ختم

۱۹۸۳ء میں ہائی کلاسز (میٹرک) ایف اے، ایف ایس سی، بی اے، بی ایس سی تمام کلاسز کے لیے اسلامیات بطور ایک لازمی مضمون ۵۰ نمبر

گویا قیام پاکستان کے سال ۱۹۴۷ء سے مضمون اسلامیات کو کسی ترتیب، اور کسی نظم سے یکساں طور پر شامل نصاب کرنے میں ۲۶ سال کا عرصہ لگا۔

نصابِ اسلامیات کا مطالعہ کریں تو یہ عجیب صورت حال سامنے آتی ہے کہ مضامین میں کوئی تسلسل نہیں۔

جدید نظامِ تعلیم میں اسلامیات کا نصاب[1]

پرائمری کلاسز سے ایم اے تک اسلامیات کے نصاب کا جائزہ بندہ مرتب کر چکا ہے ۲۳ صفحات کے اس جائزہ کا یہاں نقل کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ اس میں سے صرف قرآن و حدیث کے مشمولہ حصہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ پرائمری کلاسز | ناظرہ خوانی ۔ پارے حفظ : آخری پارہ کی دس صورتیں ۔
ترجمہ و تشریح : کچھ نہیں ۔ حدیث کوئی نہیں۔

۲۔ مڈل کلاسز | ناظرہ خوانی : بقیہ ۲۳ پارے ۔ حفظ ۹ آیات ۔
ترجمہ و تشریح : آخری پارہ کی دس سورتیں ۔ سورۃ البقرہ کی ۴ آیات ۔ حدیث کوئی نہیں۔

۳۔ ہائی کلاسز (میٹرک) | ترجمہ و تشریح : آخری پارہ کی چند سورتیں، اور چند مختصر جملے،
حدیث : ۲۰ مختصر احادیث

---

[1] : ناظرہ قرآن خوانی شامل نصاب ضرور ہے لیکن نہ اس کا امتحان ہے، نہ کہیں تدریس کا انتظام ہے (مقالہ نگار)

۴۔ انٹرمیڈیٹ

(الف) ایف اے (اختیاری مضمون)

	لاہور ثانوی تعلیمی بورڈ	دوسرے بورڈز میں
ترجمہ وتشریح :	سورۃ البقرہ ۲۰ رکوع	سورۃ البقرہ صرف ۷ رکوع
حدیث	اربعین نوویؒ (۴۲ احادیث)	۲۰ منتخب احادیث

(ب) ایف اے/ایف ایس سی (اسلامیات لازمی)

ترجمہ وتشریح : تین آیات اور سات مختصر جملے

حدیث : دس مختصر احادیث

۵۔ بی اے

ہر یونیورسٹی میں بی اے کلاسز کے لیے اسلامیات کا نصاب مختلف ہے۔

(الف) اسلامیات اختیاری ــــ بالعموم قرآن مجید کی کوئی ایک سورۃ (المائدہ، النساء یا کوئی دوسری سورت شامل ہے۔ جبکہ احادیث میں صحاح ستہ کی کسی ایک کتاب کا کوئی ایک باب شامل نصاب ہے۔

(ب) اسلامیات لازمی ــــ سورۃ الحجرات، الفرقان کی پندرہ آیات، آخری پارہ کی پانچ سورتیں (یعنی کل ۶۳ آیات) ۲۰ مختصر احادیث۔

تجزیہ

قومی تعلیمی پالیسی ۱۹۷۸ء کی دوسری شق میں واضح کیا گیا ہے کہ اس نظام تعلیم کا ایک مقصد یہ ہے کہ طلبا کو "دنیا بھر میں تبلیغ اسلام" کے لیے تیار کیا جائے (قومی تعلیمی پالیسی صفحہ ۲) جب کہ پرائمری کلاسز سے بی اے کی آخری جماعت تک ان کے نصاب اسلامیات میں قرآن عزیز کے مندرجہ ذیل حصے شامل ہیں۔

آخری پارہ کی ۱۷ مختصر سورتیں

سورۃ البقرہ ۲۰ رکوع

المائدہ ، النساء ، الحجرات ، یا کوئی ایک دوسری سورۃ

مزید ۸۴ آیات اور ۱۵ آیات کے مختصر جملے۔

احادیث کے باب میں اول سے آخر تک صرف ۷۰ احادیث شامل نصاب ہیں۔

درسِ نظامی کے مقاصد

علامہ نظام الدین شہید سہالوی (متوفی ۱۱۶۱ مطابق ۱۷۴۷ء) نے درسِ نظامی مرتب کیا۔ مختلف ادوار میں اس میں ترمیم و اصلاح اور اضافے ہوئے ہیں، لیکن وہ سب معمولی نوعیت کے ہیں۔ ہماری نظر سے علامہ موصوف کی کوئی ایسی تحریر نہیں گزری جس میں انہوں نے درسِ نظامی کے اغراض و مقاصد کا تعین کیا ہو یا کسی اور نے ان کی نشاندہی کی ہو۔

ہمارے جائزہ مدارس عربیہ" سنہ ۱۹۶۰ء کے موقع پر سوالنامہ (۱) کے جواب میں حضرات علمائے کرام اور دوسرے فضلا نے مندرجہ ذیل مقاصد کی نشاندہی فرمائی۔

(الف) درسِ نظامی اور مروجہ تمام علوم و فنون کی تدریس سے مقصدِ مطلوب کتاب و سنت کے حقائق کا علم ہے۔

(ب) اصلاحِ اُمت اور تہذیبِ اخلاق کے لیے طلبا کو تیار کرنا

(ج) اپنے مسلک کی وضاحت و اشاعت، حفاظتِ دین اور اشاعتِ اسلام

(د) طلبا کی اصلاحِ نفس اور اصلاحِ اعمال

(ہ) رضائے الٰہی اور نجاتِ اُخروی کے لیے تعلیم و تدریس نہ کہ کسی دنیوی مفاد کے لیے۔

(و) خدمتِ خلق کرنے والے اہلِ علم تیار کرنا۔

(ز) کتاب و سنت کے حقائق سے آگاہی۔

(ح) ایسے اصحابِ فکر و نظر تیار کرنا جو علمِ دین پر گہری نظر رکھتے ہوں۔

موجودہ نصاب درس نظامی

فنون	کتب
۱۔ صرف (عربی)۔	میزان، منشعب، پنج گنج، صرف میر، علم الصیغہ، فصول اکبری، دستور المبتدی، زرادی، زنجانی، صرف بہائی، مراح الارواح، شافیہ۔
۲۔ نحو (عربی)۔	نحو میر، نظم مائۃ عامل، شرح مائۃ عامل، ہدایۃ النحو، کافیہ، شرح جامی، تسہیل الکافیہ، حاشیہ شرح جامی۔
۳۔ منطق۔	صغریٰ کبریٰ، ایساغوجی، مرقات، شرح تہذیب، سلم العلوم، شرح سلم قاضی مبارک، حمد اللہ، شرح ملا حسن، رسالہ میر زاہد، قطبی، میر قطبی،
۴۔ حکمت وفلسفہ۔	میبذی، صدرا، شمس بازغہ، ہدیہ سعیدیہ۔
۵۔ ریاضی وہیئت۔	تصریح، شرح چغمینی، تحریر اقلیدس، تشریح الافلاک، خلاصۃ الحساب۔
۶۔ معانی وبیان۔	تلخیص المفتاح، مختصر معانی، مطول۔
۷۔	خلاصہ کیدانی، منیۃ المصلی، نور الایضاح، قدوری، کنز الدقائق، شرح وقایہ، ہدایہ اولین، ہدایہ آخرین، سراجی۔
۸۔ اصول فقہ۔	اصول الشاشی، نور الانوار، حسامی، توضیح تلویح، مسلم الثبوت۔
۹۔ کلام وعقائد۔	شرح مواقف، شرح عقائد جلالی، شرح عقائد نسفی، خیالی۔
۱۰۔ تفسیر	بیضاوی، جلالین، کشاف، مدارک التنزیل۔
۱۱۔ اصول التفسیر	فوز الکبیر فی اصول التفسیر
۱۲۔ حدیث۔	مشکوۃ المصابیح، صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابو داؤد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، شمائل ترمذی۔
۱۳۔ اصول حدیث۔	نخبۃ الفکر۔

۱۴- مناظرہ۔ رشیدیہ۔

۱۵- ادب عربی۔ مقامات حریری، دیوان متنبی، دیوان حماسہ، سبعہ معلقہ، مفید الطالبین، نفحۃ الیمن، نفحۃ العرب،

۱۶- عروض عروض المفتاح (ماخوذ مفتاح العلوم)

(ماخوذ از رپورٹ قومی کمیٹی برائے دینی مدارس صفحہ ۱۳۵)

تجزیہ

دونوں نظام ہائے تعلیم کو قریب تر لانا، اور انجام کار باہم مربوط کرنا، ایک خواہش کی حد تک بہت خوش آیند بات ہے، اور اس سلسلہ میں مساعی بھی ہوئی ہیں۔۔۔ لیکن اس صورت میں جبکہ دونوں نظام ہائے تعلیم کے مقاصد بھی مختلف ہیں، طرز تعلیم بھی مختلف ہے، اور نصاب بھی مختلف ہے، ان کا باہم مربوط ہو جانا، بظاہر آسان نظر نہیں آتا۔

باہم مربوط کرنے کی مساعی

دونوں نظام ہائے تعلیم کو باہم مربوط کرنے کی مساعی سرکاری اور غیر سرکاری دونوں سطح پر ہوئی ہیں۔

مدارس عربیہ کی مساعی

(الف) متعدد مدارس عربیہ نے اپنے زیر اہتمام اور اپنی زیر نگرانی جدید تعلیمی نظام کے ادارے اسی نصاب کے مطابق قائم کیے چنانچہ عوامی دور میں قومیائے جانے سے قبل مندرجہ ذیل تعداد میں ادارے قائم تھے، جن میں سے بیشتر، بلکہ تقریباً تمام تر قومی تحویل میں لے لیے گئے ہیں۔

(i) ڈگری اور انٹر کالج ۵

(ii) ہائی سکول ۷

(iii) مڈل اور پوئر مڈل سکول ۱۱

(۱۷) پرائمری سکول ۳۲

ان کا نصاب اور مضامین ، اگرچہ مروجہ جدید تعلیمی نظام کے مطابق تھے، لیکن یہاں اسلامیات عربی، قرآن خوانی اور تہذیب اخلاق پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔

اس وقت، میری معلومات کی حد تک ، صرف جامعہ نعیمیہ ، لاہور میں میٹرک اور ایف اے کی تدریس طلبہ کے فارغ اوقات میں ہو رہی ہے۔

(ب) بعض مدارس عربیہ نے دونوں نصاب ، کچھ کمی کرکے یکجا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً دارالعلوم قاسمیہ ہائی سکول میرپور خاص ، (سندھ)، جامعہ محمدیہ غوثیہ بھیرہ (پنجاب) وغیرہ

(ج) بعض مدارسِ عربیہ نے درسِ نظامی کی تعداد سے کچھ کمی کرکے عصرِ حاضر کے علوم کو شامل نصاب کیا ہے۔ مثلاً

جامعہ تعلیماتِ اسلامیہ، فیصل آباد، دارالعلوم قمرالاسلام کراچی، جامعہ سلفیہ فیصل آباد وغیرہ

II سرکاری سطح پر مساعی

(الف) جامعہ عباسیہ بہاولپور میں دونوں نصاب میں امتزاج کی کامیاب کوشش کی گئی، مگر افسوس کہ جامعہ عباسیہ جب اسلامی یونیورسٹی بن گئی تو اس نے بھی ملک کی دوسری یونیورسٹیوں کی صورت اختیار کر لی۔

(ب) ۱۹۷۹ء میں حکومت پاکستان نے مدارس عربیہ کے نظام و نصاب کے لیے ایک قومی کمیٹی کی تشکیل کی ۔ اس کمیٹی نے بڑی جانفشانی ، اور تحقیق و تدقیق کے بعد چاروں مکتبِ فکر کے علماء اور دوسرے فضلاء کے مشوروں سے جدید نصاب مرتب کیا ــــ افسوس کہ قومی کمیٹی کی متفقہ تجاویز اور نصاب کو حکومت نے منظور کیا، لیکن بیحد نیم دلانہ انداز سے، دوسری طرف اپنے علماء کے اتفاق کے باوصف مدارس عربیہ نے اسے رائج کرنے کے لیے کوئی عملی قدم نہ اٹھایا۔

۱۹۸۵-۸۶ء کے تعلیمی سال میں وفاقی حکومت نے چند مدارس عربیہ کو جدید مضامین کی تدریس کے لیے دو، دو اساتذہ مہیا کرنے کی پیش کش کی ہے ۔

مستقبل کے لیے تجاویز

۱۔ مدارسِ عربیہ کے نصاب میں کسی ترمیم واصلاح کی کوشش سرکاری سطح پر کرنا بے سود ہوگا۔ یہ کام علمائے کرام، اصحابِ مدرسہ یا ان کے وفاق خود انجام دیں تو نتیجہ خیز ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے انہیں مواقع اور آسانیاں مہیا کی جائیں۔

۲۔ متداول قدیم کتب کی جگہ (خصوصاً معقولات، منطق وفلسفہ میں) انہی مضامین کی جدید کتب کا شمول ازبس ضروری ہے ــــ نیز عصری علوم اور تقابلِ ادیان وتحریکاتِ جدیدہ پر کتب کا اضافہ وقت کی ضرورت ہے۔

اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے مدارسِ عربیہ کی زبان اور مزاج کے موافق کتب کا حصول یا جدید کتب کی تدوین واشاعت کی ذمہ داری اصحابِ خیر یا حکومت اپنے ذمہ لے۔

۳۔ عصری علوم، جدید کتب، تقابلِ ادیان، تحریکاتِ جدیدہ کی تدریس کے لئے مدارسِ عربیہ کے اساتذہ کے لیے ریفریشر کورسز کا اہتمام کیا جائے ــــ اور ان کے ہم مسلک وہم مزاج اساتذہ مہیا کیے جائیں۔

دینی نظام تعلیم: ایک نظر میں

مولانا مفتی عبدالقیوم ہزاروی

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم۔ اما بعد

سب سے پہلے میں ادارہ انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی کے ذمہ وار حضرات کو ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے دینی تعلیم اور اس کے نظام کو قابل التفات قرار دیتے ہوئے اس کو موضوع سخن بنایا۔ جس سے حاضرین کو کم ازکم دینی تعلیم کے نظامِ تدریس سے تعارف ہوگا اور ان کی معلومات میں اضافہ ہوگا، اس لحاظ سے میں ان کا شکر گذار بھی ہوں کہ انہوں نے مجھے بھی اس مجلس میں شرکت کا موقعہ فراہم کیا۔

اگرچہ دینی تعلیم سے متعلق چند استفسارات کا جواب معلوم کرنے کے لیے یہ مجلس منعقد کی گئی ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ بعض استفسارات غلط مفروضہ پر مبنی ہیں اور بعض قابلِ غور بھی ہیں، تاہم دینی تعلیم سے متعلق کسی بھی سوال وجواب سے قبل علم دین کی تعریف وتقسیم، اس کا موضوع، طریقہ ونظام تعلیم اور اس کے اغراض ومقاصد کو بیان کرنا ضروری ہے تاکہ خلطِ مبحث نہ ہونے پائے۔ اس لئے، مقالہ میں ان امور کو مختصر انداز میں بیان کرنے کے بعد اس کی تعلیم سے متعلق شکوک وشبہات کا ازالہ نیز آخر میں کچھ اعترافات اور ان کے متعلق تجاویز پیش کی جائیں گی۔

تعریف

چونکہ علم دین کی ترکیب اضافی ہے اس لیے اس کی تعریف، اس کے دونوں جزؤں کی معرفت

سے حاصل ہوگی اور یہ بات بھی واضح ہے کہ مضاف کا تعین مضاف الیہ کی تعریف و تعین پر موقوف ہے اس لیے پہلے مضاف الیہ یعنی دین کا مفہوم پیش کیا جاتا ہے۔

دین سے مراد، دینِ اسلام ہے چونکہ یہ دین انسان کی دنیوی و اخروی زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے بیان کردہ طریقہ کا نام ہے اسی لئے یہ دین انسان کی دونوں زندگیوں سے متعلق اُمور پر بحث کرتا ہے، یہ امور جسمانی ہوں روحانی یا عقلی ہوں، شخصی ہوں یا اجتماعی پھر یہ حقوق اللہ سے متعلق ہوں یا حقوق العباد سے متعلق، دینِ اسلام ان سب امور پر مشتمل ہے۔

علم دین کی ترکیب میں علم اپنے معلوم کی طرف مضاف ہے ظاہر ہے کہ معلوم یعنی دین میں جو وسعت ہوگی وہی وسعت اس کے علم میں بھی ہوگی۔

تقسیم !

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ انسان دو قوتوں یعنی قوتِ[1] نظریہ اور قوتِ[2] عملیہ کا حامل ہے قوتِ نظریہ کی بنا پر وہ موجودات میں غور و فکر کرتا ہے اور قوتِ عملیہ کے ساتھ قوتِ نظریہ سے حاصل کردہ نتائج کے پیشِ نظر عمل پیرا ہوتا ہے۔ اسی طرح کائنات کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ کہ جس کے وجود میں انسانی قوت و ارادہ کو دخل نہیں ہے، کائنات کی یہ قسم موجوداتِ خارجیہ سے موسوم ہے اس کی دوسری قسم جس کے وجود میں انسانی قوت و ارادہ کا دخل ہے، جن کو اعمال و افعال سے تعبیر کیا جاتا ہے انسان کی قوتِ نظریہ کا تعلق موجودات سے ہوتا ہے اور اس کی قوتِ عملیہ کا تعلق اعمال و افعال سے ہے۔

لہٰذا کائنات سے متعلق انسان کو دو فکر یعنی نظریات و عملیات حاصل ہوئے، ان ۲ دو فکروں کی تقسیم سے علومِ دینیہ کے اقسام حاصل ہوں گے۔ نظریات سے علومِ نظریہ[1] اور عملیات سے علومِ عملیہ[2] حاصل ہوں گے۔

نظریات !

نظریات میں سے بعض یقینی اور بعض ظنّی ہیں۔ نظریاتِ یقینیہ کو اعتقادیات اور ایمانیات کہا جاتا ہے جن سے علم الکلام بحث کرتا ہے اور نظریاتِ ظنیہ سے بحث کرنے والا علم فلسفہ و حکمت ہے پھر طبعیات اور مابعد طبعیات کے لحاظ سے فلسفہ کی دو قسمیں علم الطبعی اور علم الالٰہی جن میں سے ہر ایک کی تین تین انواع ہیں۔

عملیات:

عملیات میں سے بعض کا تعلق شخص واحد سے ہے اور بعض کا تعلق جماعت سے ہے۔ عملیاتِ شخصیہ اگر وجدانی ہوں تو ان کو تصوّف کہا جاتا ہے اور اگر ان کا تعلق جوارح سے ہو تو ان کو عبادات سے تعبیر کرتے ہیں۔

جن عملیات کا تعلق جماعت سے ہے، اعمال و افعال کی نوعیت کے لحاظ سے ان کے مختلف اقسام ہوں گے، مثلاً اگر یہ افعال مالی امور سے متعلق ہوں تو پھر ان کے تمام فریق زندہ ہوں تو ان کو معاشیات اور اگر ایک فریق میّت ہو جس کے مال کی تقسیم کی جائے تو اس کو فرائض و میراث کہا جاتا ہے اور یہ اعمال ازدواج سے متعلق ہوں تو مناکحات ہیں اور اگر معاشرہ سے متعلق ہوں تو معاشرتی علوم، اگر لڑائی جھگڑے کے بارے ہوں تو مخاصمات، حکام اور رعیت سے متعلق ہوں تو ان کو سیاسیات کا نام دیا جاتا ہے۔

پھر یہ سیاسیات داخلی ہوں تو ان کو امارۃ، قضا اور زواجر یعنی تعزیرات سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اگر سیاسیات خارجی امور سے متعلق ہوں تو ان کو سیر وجہاد کہا جاتا ہے نظریات و عملیات کے ان تمام اقسام کا نام دین ہے۔

پھر ان نظریات و عملیات سے متعلق بعض ایسے امور بھی ہیں جو ان میں حسن و خوبی پیدا کرتے ہیں ان کو آداب کہا جاتا ہے اور بعض ایسے بھی ہیں جو ان کے ادراک و فہم اور عمل میں معاون بنتے ہیں۔ اگر وہ معاون لفظی ہوں تو صرف، نحو، لغت اور بلاغۃ اور اگر عقلی ہوں تو منطق اور اگر یہ

امور ان نظریات و عملیات کے لئے عملی معاون ہوں تو یہ سیرت و تاریخ کہلاتے ہیں۔

چونکہ ان تمام نظریات و عملیات اور معاون۔ کا ماخذ و مصدر۔ قرآن و حدیث ہیں، اس لیے ماخذ ہونے کی حیثیت سے ان سے بھی بحث ضروری ہے پھر ان سے اخذ و استنباط کے اصول و قواعد کو جاننا بھی ضروری ہے اس لیے اصولِ تفسیر، اصولِ حدیث، اصولِ فقہ کا حصول بھی ضروری ہے۔ سامعین حضرات پر واضح ہو گیا کہ علوم دینیہ کا یہ نظام آپس میں کس طرح مربوط ہے۔

موضوع: تیس کے قریب یہ عنوانات علمِ دین کا موضوع ہیں۔ ان میں سے عملیات کے چھ عنوان کو فقہ سے تعبیر کرتے ہیں جبکہ طب اور ریاضی کے بعض اقسام نیز مناظرہ کو بھی دینی تعلیم میں شامل کر لیا جائے تو یہ تعداد مزید بڑھ جائے گی۔

دینی تعلیم کا دائرہ: دینی تعلیم چونکہ علومِ دینیہ سے متعلق ہے لہٰذا اس تعلیم کا دائرہ کار جملہ علومِ دینیہ کو محیط ہو گا۔ جن کی تعداد حسب ذیل ہے۔

صرف، نحو۔ لغت، بلاغت (معانی، بیان اور بدیع) منطق و فلسفہ (کی دو قسمیں جو مجموعی طور پر چھ انواع پر مشتمل ہیں) کلام، فقہ، اصولِ فقہ، حدیث، اصولِ حدیث، تفسیر۔ اصولِ تفسیر، سیرت و تاریخ، فرائض، تصوّف، طب۔ مناظرہ، ہیئت، ہندسہ بیس سے زائد ان علوم کی تعلیم مدارسِ دینیہ میں دی جاتی ہے۔ جبکہ لسانیات میں سے عربی فارسی اور اردو کی بھی تعلیم دی جاتی ہے۔

اس کے علاوہ حفظِ قرآن، تجوید قرآن بھی مدارسِ دینیہ کی معروف تعلیم ہے جبکہ داخلہ کے وقت طالب علم کم از کم پرائمری تک ضرور پڑھا ہوتا ہے اس سے واضح ہو گیا کہ مدارس دینیہ میں طالب علم کو کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔

واضع: چونکہ ان تمام علوم کا منبع و مصدر، قرآن کریم ہے اور قرآن منزل من اللہ ہے لہٰذا ان علوم کا واضع اللہ تعالیٰ جل و علیٰ ہے۔

مُعلّمِ اوّل: ان علوم کی تعلیم خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دی ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ کتب احادیث میں ان تمام عنوانات کے تحت احادیث موجود ہیں۔

غرض و غایت: قوّتِ نظریہ و عملیہ سے متعلق حسن و کمال اور ضرر و فساد کو پہچان کران دونوں قوّتوں کو فساد سے محفوظ اور فضائل سے مزین کرنا۔ تاکہ انسان اپنے فکر و عمل میں حق و باطل کی صحیح پہچان کر کے اِحقاقِ حق و اِبطالِ باطل کے ذریعہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کا تحفظ کر سکے اور دنیا و آخرت کی سعادت مندیوں سے بہرہ ور ہو سکے۔

مقاصد: تفقہ فی الدین کی اجتہادی قوت حاصل کرنے کے لیے قرآن و حدیث کی تشریحات سے متعلق اسلاف کی تحقیقات کو سمجھنے کا ملکہ اور استعدادِ تام حاصل کرنا۔

۲۔ حق کے دفاع کے لیے ایسی فورس تیار کرنا جو تعلیم دین کے ساتھ ساتھ اس کی بقاو تحفظ کے لئے ایثار و قربانی، مشکلات و پریشانی کے تحمل کا خوگر بن سکے تا کہ اعلائے کلمۃ الحق کے لیے جہاد میں مصائب و آلام کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہوئے ثابت قدم رہ سکے۔

نظامِ تعلیم: دینی تعلیم کا نظام، مذکورہ بالا اغراض و مقاصد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے ارشاد "فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ"، پر مبنی ہے۔

چونکہ آیۃ کریمہ میں ہر اجتماعی آبادی میں سے کچھ لوگوں کو تفقہ فی الدین کے لئے سفر کی تنبیہہ کی گئی ہے اس لئے دینی تعلیم کے اقامتی ادارے قائم کیئے گئے، تاکہ مختلف اطراف سے آئے ہوئے مسافر طلبا یہاں قیام کر کے تعلیم حاصل کریں جن کے لیے میزبانی کے فرائض خود استاد اور معلم کو ادا کرنا ہوتے ہیں۔ اس نظام کا مقصد طلبا کو سفری صعوبتوں، بے سرو سامانی اور استاد کی احسان مندی میں مُبتلا کر کے دینی جد و جہد میں استقلال کا خوگر بنانا ہے۔

دوسرا یہ کہ علم دین صرف پڑھنے کا نام نہیں بلکہ اس تعلیم سے حاصل شدہ معرفت پر عمل پیرا ہونا اور اس معرفت کے تقاضوں کو پورا کرنا بھی ضروری ہے ورنہ علم غیر نافع کے بارے مُعلّمِ شریعت نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا "اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ عِلْمٍ لَا یَنْفَعُ" اس نظامِ تعلیم میں طلبا کو زیرِ نگرانی رکھ کر عملی تربیت دینا مقصود ہے۔ اسی حکمت کے پیشِ نظر رسولِ مقبول صلی اللہ تعالیٰ

علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں پہلا مدرسہ قائم فرما کر اس نظام کی بنیاد مہیا فرمائی۔

طریقۂ تعلیم: دینی علوم کی تعلیم کے لیے مدارس میں یہ طریقہ کار ہے کہ ابتداء میں طلبہ کو علوم آلیہ یعنی صرف، نحو، لغت، منطق کی ابتدائی کتب زبانی یاد کرائی جاتی ہیں تاکہ یہ اصول و قواعد انکو ازبر ہو جائیں، اسباق میں ان قواعد کا اجراء بھی ساتھ ساتھ کرایا جاتا ہے اس کے بعد ہر فن کی مشکل سے مشکل تر کتاب کی طرف تدریجاً طلبہ کو بڑھایا جاتا ہے۔ کتاب کو حل کرنے کا ملکہ پیدا کرنے کے لئے طلبہ کو پابند کیا جاتا ہے کہ وہ یومیہ اسباق کو حل کر کے آئیں، چنانچہ استاد اور شاگرد روزانہ ہر سبق کی تیاری کر کے اوقاتِ تدریس میں اس پر مذاکرہ کرتے ہیں جس میں اسباق کے لفظی و معنوی پہلوؤں پر کھل کر بحث کی جاتی ہے اس طرح ہر فن کی مشکل ترین اور قیل و قال سے بھرپور کتاب پر اس فن کی تدریس ختم کر دی جاتی ہے۔

اس طریقہ تعلیم کا مقصد طلبا کے ذہنی گوشوں کو جلا بخشنا ہے اور ان کو باریک اور مشکل ترین مسائل کے حل کرنے کی استعداد فراہم کرنا ہے محض کتابوں سے مسائل یا ان پر قیل و قال ہرگز مقصود نہیں۔ کیونکہ تعلیم و تعلّم میں علم بمعنیٰ ملکہ ہوتا ہے یہاں علم بمعنیٰ ادراک نہیں اور نہ ہی بمعنیٰ مسائل ہے کیونکہ اگر صرف ادراک مقصود ہو تو پھر ایک دو مسئلوں کے ادراک پر اس فن کا عالم قرار دینا ہو گا۔ اسی طرح مسائل مراد ہوں تو کتنے ہوں؟ اگر تمام مسائل ہوں تو یہ غلط ہے کیونکہ ہر فن کے مسائل لامحدود ہیں جن کو محدود وقت میں حاصل کرنا ممکن نہیں، اور بعض مسائل بھی مراد نہیں ہو سکتے کیونکہ یہ بعض معلوم نہیں، لہٰذا تعلیم و تعلّم میں مقصد صرف ملکہ و استعداد پیدا کرنا ہے جس سے پیش آمدہ مسائل کو حل کیا جا سکے۔

مدتِ تعلیم: چونکہ اس تعلیم کا مقصد معینہ مسائل کا حصول نہیں تاکہ مدت کا تعین کیا جا سکے، یہاں تو حصولِ ملکہ و استعداد مقصود ہے اور فطری طور پر انسان کے قویٰ میں تفاوت ہے جس کی وجہ سے استعداد کے حصول میں وقت کا تفاوت لازمی ہے، تاہم آٹھ دس سال میں اکثر طلبا یہ استعداد حاصل کر لیتے ہیں۔

فضلاء کی اہلیّت وصلاحیّت: کسی فاضل کی اہلیت و قابلیت معلوم کرنے کے لیے اس کا تعلیمی نصاب معلّم اور تعلیم گاہ کا ماحول معلوم کیا جاتا ہے۔ اگر نصاب فنون کا جامع ، استاد معلّمانہ خصوصیات کا حامل اور علوم وفنون کا ماہر ہو نیز درس گاہ کا ماحول پاکیزہ ہو ، پھر طالب علم علمی استعداد حاصل کر چکا ہو اور دوران تعلیم قواعد وضوابط کی پابندی کا خوگر بن چکا ہو تو اس کی قابلیت میں کسی شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اب صرف میدان عمل میں اس کی صلاحیت کار کے لئے عملی تجربہ کی ضرورت ہے جو کہ معاشرتی ذمہ داریاں سونپ دینے پر موقوف ہے۔

دینی تعلیم کے فضلاء جس نصاب کو پڑھتے ہیں وہ جامع ہے۔ ان کے اساتذہ کرام علوم وفنون میں ماہر ہوتے ہیں۔ دینی مدارس کے پاکیزہ ماحول میں تربیت حاصل کرتے وقت قواعد وضوابط کی پابندی بھی مسلّم ہے اس کے باوجود ان کی قابلیت واہلیّت میں شک وشبہ غلط فہمی پر ہی مبنی ہو سکتا ہے، خصوصاً دینی تعلیم میں عملی تربیت کا علم ہو جانے پر اہلیت کا سوال بے معنی سا ہو جاتا ہے کسی بھی تعلیم کی اہم کامیابی یہ ہوتی ہے کہ اس کے فاضل حضرات خطرناک ، اہم اور نازک ترین مواقع پر تعلیمی وتربیتی تقاضوں سے سرمو انحراف نہ کریں، جس کا مظاہرہ دینی تعلیم کے فاضل دو صد۲ سال سے کر رہے ہیں۔ انگریز کی آمد کے بعد اس نظامِ تعلیم اور اس کے حاملین کو نیست ونابود کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی بلکہ ابھی تک یہ سلسلہ بدستور جاری ہے اور نہ جانے کب تک جاری رہے، اس کے باوجود یہ نظامِ تعلیم اور اس کے حاملین زندہ ہیں قائم و دائم ہیں۔ نیز ہر قسم کے مصائب وآلام اور مشکلات کے باوجود اپنے مقدس مشن کو جاری رکھے ہوئے ہیں، اگر علماء کرام کی اہلیت معاشرتی ذمہ داریوں کے بارے میں معلوم کرنی ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ ان کو معاشرتی ذمہ داریاں سونپی جائیں جبکہ یہی علماء کرام دو صدی قبل تک تمام معاشرتی ذمہ داریوں سے عمدہ طور پر عہدہ برآ ہونے کی اہلیت ثابت کر چکے ہیں جس پر تاریخ شاہد ہے پھر موجودہ دور میں بھی اس دینی تعلیم کے فضلاء کی اہلیتِ کار معلوم کرنی ہو تو مدارس کے عظیم الشان نظام کو ملاحظہ کیا جائے جن میں سینکڑوں طلبہ کی

رہائش، خوراک اور کتب بلکہ لباس تک کا مفت انتظام، اساتذہ اور دیگر عملہ کے اخراجات کے علاوہ تعمیرات، لائبریریاں وسیع کتب خانے، تحقیق و تالیف، نشر و اشاعت کتب وغیرہ غرضیکہ مدرسہ کیا ہے ایک مملکت ہے جسے ایک عالم دین اپنی علمی سیاسی اور انتظامی بصیرت سے چلاتا ہے۔ جبکہ ابتدا ً خالی ہاتھ، کھلی جگہ نہ کمرہ نہ دیوار مگر طلبہ اور ان کی تعلیم کی ذمہ داریوں کا بوجھ اپنے پختہ عزم کے کندھوں پر ڈالے بیٹھ جاتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے چند سال بعد وہاں ایک جہان آباد ہوتا ہے۔

اس طرح دینی تعلیم کے فاضل حضرات کی سیاسی اور قائدانہ صلاحیت بھی اظہر من الشمس ہے انگریز اور ہندو کے خلاف تمام تحریکوں میں قیادت، تحریک آزادی اور آزادی کے بعد جتنی تحریکیں چلیں، ان کا مطالعہ اور مشاہدہ بھی علماء کرام کی اہلیت کار اور ان کی بصیرت کا بیّن ثبوت ہے۔

دینی تعلیم اور اس کے نظام کے بارے میں شکوک و شبہات

دینی تعلیم اور اس نظام کے بارے میں ایک سوال یہ کیا جاتا ہے کہ

"مروجہ سرکاری اداروں میں اسلامیات اور عربی لازمی قرار دیئے جانے کے بعد دینی مدارس کی کیا ضرورت ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بنیادی طور پر کوئی تعلیم اسلامی یا غیر اسلامی نہیں بلکہ اس کا مدار تعلیم کے اغراض و مقاصد پر ہے اگر تعلیم کے مقاصد دنیاوی ہیں تو وہ دنیاوی ہے اور اگر اس کا مقصد حق و باطل میں امتیاز نیز حق کے بقاء تحفظ اور دفاع کے لیے جدوجہد ہے تو یہ دینی تعلیم کہلائے گی۔ جبکہ اس جہاد کے لیے مشقت، پریشانی، ایثار اور قربانی مالی ہو یا جسمانی کی عملی تیاری ضروری ہے۔

سرکاری تعلیمی اداروں میں تعلیم کا مقصد صرف اچھی ملازمت کا حصول ہے تاکہ دنیاوی جاہ و جلال اور مفادات حاصل کیے جاسکیں اور اگر ان میں تعلیم کا مقصد حق و باطل کا امتیاز تسلیم بھی کر لیا جائے، جب بھی مروجہ سرکاری اداروں میں طالب علم کو اِحقاقِ حق کے جہاد کے لئے ایثار و قربانی اور مشکلات

مبتلا ہونے کا خوگر نہیں بنایا جاتا کیونکہ وہاں ہر قسم کی سہولت میسر ہوتی ہے بلکہ فیس کی ادائیگی کی بنا پر طلبہ ان درسگاہوں اور اساتذہ کا تقدس معمولی سی مشکل پر پامال کر دیتے ہیں جبکہ دینی تعلیمی اداروں میں مسافری، بے سروسامانی، ایثار و قربانی، اساتذہ کی خدمت اور احسان مندی کے بغیر تعلیم کا کوئی تصور نہیں ہے جس سے طلبہ جدوجہد اور مشکلات پر صبر کرنے کا عادی ہو کر اعلائے کلمۃ الحق کے جہاد کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ نیز آپ سن چکے ہیں کہ صرف اسلامیات پڑھنے کا نام علم دین نہیں ہے بلکہ اس کو نافع بنانے کے لیے اس سے حاصل شدہ معرفت پر عمل پیرا ہونا بھی ضروری ہے۔ جس کے لئے عملی تربیت لازمی ہے جبکہ یہ سب کچھ مروجہ سرکاری اداروں میں نا پید ہے جس کا واضح ثبوت سرکاری تعلیمی اداروں میں روزمرہ کے واقعات ہیں۔

جبکہ دینی اداروں میں تعلیم کے ساتھ عملی تربیت کا اہتمام ہے۔ لہٰذا ان مخصوص علمی مقاصد کے حصول کے لیے دینی مدارس کی اپنی جگہ ضرورت باقی ہے۔

سوال نمبر ۲۔ دینی تعلیم کے متعلق ایک شبہ یہ بھی کیا جاتا ہے کہ دینی تعلیمی اداروں میں جو نصاب پڑھایا جاتا ہے وہ قدیم ہے اور اس کے بعض علوم متروک ہو چکے ہیں۔ اس لیے وہ موجودہ دور کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا لہذا اس میں ترمیم کی ضرورت ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ کسی نصاب کی افادیت و عدم افادیت معلوم کرنے کے لیے اس کے اغراض و مقاصد سمجھنا ضروری ہیں، درس نظامی یعنی دینی تعلیم کے نصاب کا مقصد ایک قوت راسخہ حاصل کرنا ہے جس سے قرآن و حدیث پر اسلاف کے کیے ہوئے کام کو سمجھا جا سکے، کیونکہ قرآن ہی علوم کا منبع ہے اس تک رسائی کے لئے اسلاف کی تشریحات سے رہنمائی حاصل کرنا ضروری ہے۔

جب کہ ان تشریحات کو سمجھنے کے لئے موجودہ درسِ نظامی کے علوم پر مشتمل نصاب ضروری ہے کیونکہ اسلاف نے اپنی تصانیف میں ان علوم و فنون کی اصطلاحات کو استعمال فرمایا ہے۔

۲۔ نیز درسِ نظامی کا نصاب اتنا وسیع اور جامع ہے کہ اس کا حامل تمام علوم میں دسترس حاصل کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نصاب کے فضلاء تمام علوم میں تحقیقات کر سکتے ہیں۔

۳۔ بعض علوم متروک ہونے کے باوجود اس نصاب میں اس لیے شامل ہیں کہ سابقہ قرون کی تالیفات میں ان علوم کی اصطلاحات کو استعمال کیا گیا ہے۔ اس لیے ان اصطلاحات کے حصول کے بغیر ان تالیفات سے رہنمائی مشکل ہے۔ اس کی مزید وضاحت یہ ہے کہ دوسری اور تیسری صدی ہجری میں اہلِ یونان نے اسلام کے بارے شکوک و شبہات پیدا کرنے کے لیے یونانی حکمت و فلسفہ کو استعمال کیا اور اسلامی عقائد و نظریات اور مسلّمات پر اعتراضات کیے تو اس وقت اسلاف نے یونانی حکمت کے چند فنون عربی میں منتقل کیے تاکہ یونانی اعتراضات سمجھ کر ان کے اصول کو غلط ثابت کیا جائے اور اسلامی اصول و قواعد کا تحفظ کیا جائے۔

چنانچہ مفسرین و محققین نے اہلِ یونان کو ان کی ہی اصطلاحات میں جواب دیا۔ جس سے اس فتنہ کا سدِباب ہوا۔ اب چونکہ قرآن و حدیث کی تشریحات میں جا بجا اسلاف نے ان اصطلاحات کو استعمال فرمایا۔ اس لئے کسی بھی محقق کے لیے ان اصطلاحات کو حاصل کیے بغیر تحقیق کرنا ناممکن نہیں تو متعذر ضرور ہے۔ غرضیکہ وہ اصطلاحات مقصد نہیں بلکہ اسلاف کی تحقیقات کے ذریعہ قرآن و حدیث تک رسائی مقصود ہے۔

ایک اور سوال یہ کیا جاتا ہے (۱) کہ اس نصاب کے حاملین معاشرہ میں کس کام کے اہل ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دینی تعلیم کے نصاب کی جامعیت کے باوجود یہ سوال تجاہلِ عارفانہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ اگر ادنیٰ نصاب کے حاملین کی اہلیت مسلّم ہے تو اس سے کہیں اعلیٰ نصاب کے حاملین کی اہلیت میں کیوں شبہ کیا جاتا ہے۔ سرکاری اداروں کا نصاب اول سے آخر تک صرف چھ اور اب کچھ اسلامیات اور قدرے عربی لازمی قرار دینے پر آٹھ مضامین بنتے ہیں جن میں سے انگریزی اور اُردو کو لسان قرار دے کر خارج کر دیا جائے تو علوم کی تعداد صرف چھ رہ جاتی ہے اس کے علاوہ کچھ اختیاری مضامین بھی رکھے جاتے ہیں۔ پھر ان چند مضامین کی تعلیم کا حال سب کو معلوم ہے۔ خلاصے اور گیس پیپرز کے ذریعہ کامیابی حاصل کی جاتی ہے ان تمام کوتاہیوں کے باوجود اس کے حاملین (میٹرک تا ایم اے) معاشرتی ذمہ داریوں کے اہل قرار پائیں جبکہ دینی

تعلیم کے تیس ۳۰ سے زائد مضامین جن سے کم از کم بیس ۲۰ لازمی مضامین کے حاملین جو کہ فنون میں قدم رکھنے سے قبل حافظ قرآن، قاری اور پرائمری، مڈل نیز میٹرک کر چکے ہیں کو معاشرتی ذمہ داریوں کے نااہل قرار دینا خود کوتاہ فہمی ہے حالانکہ دینی تعلیم کی بنیاد خلاصوں اور گیس پیپرز پر نہیں بلکہ مشکل ترین کتب کے حل کرنے پر مبنی ہے۔ اس سے قطع نظر جب چند مضامین کی ناقص تعلیم کے حامل کو معاشرتی ذمہ داریوں کا اہل بنانے کے لیے اس کو تربیتی کورس کرائے جا سکتے ہیں تو دینی تعلیم کے فضلا کو بھی یہ کورس کرائے جا سکتے ہیں۔

(ب) دینی نصاب، دینی علوم میں مہارت اور ملکہ حاصل کرنے کے لیے پڑھایا جاتا ہے۔ اس سے یہ کب لازم آتا ہے کہ اس نصاب کے بعد کوئی فنی علم یا مہارت اس کے لیے ممنوع ہے۔ بلکہ معاشرہ میں جن ذمہ داریوں کو اپنانا چاہے اس کی تربیت کا راستہ کھلا ہے۔ بلکہ ان علوم کی مدد سے وہ کسی بھی تربیتی کورس کو کامل طور پر حاصل کر سکتا ہے۔

(ج) ایک جواب یہ ہے کہ دینی تعلیم کا مقصد طالب علم میں ملکۂ استنباط و استخراج پیدا کرنا ہے جس سے وہ پیش آمدہ امور و مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ کیونکہ نصاب کی جامعیت اس کو ہر میدان میں صلاحیتِ کار کا اہل بنا دیتی ہے۔

(د) معاشرتی ذمہ داریوں کی اہلیت کا معیار معاشرہ کی تشکیل پر موقوف ہے جبکہ معاشرہ کی تشکیل حکومت کی ذمہ داری ہے۔ جیسی حکومت ہوگی ویسا ہی معاشرہ تشکیل پائے گا۔ اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ کا یہی مطلب ہے۔ لہٰذا یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ کس قسم کا معاشرہ تشکیل دیتی ہے اور اس کے لیے کسے اہل قرار دیتی ہے۔ آج اگر اسلامی معاشرہ تشکیل دیا جائے اور عملاً اسلام نافذ ہو جاتا ہے تو اہلیت کا معیار تبدیل ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ دو سو سال قبل تک ایسا معاشرہ تھا جس میں تمام تر معاشرتی ذمہ داریاں علماء کے سپرد تھیں۔ اس کے بعد انگریز کا تشکیل کردہ معاشرہ آیا تو اہلیت کا معیار بھی تبدیل ہو گیا۔ لہٰذا معاشرتی اہلیت کی بنیاد سرکاری منصوبہ بندی ہے۔ آج اگر منصوبہ بندی کرتے وقت علماء کی خدمات کو شامل کیا جائے تو خود بخود لوگ دینی تعلیم کو اہلیت کا معیار قرار دیں گے۔

۷) اہلیت اگر انسانی کمال، علمی استعداد اور صلاحیتِ کار کا نام ہے تو اس کا مظاہرہ حکومتی سرپرستی ختم ہو جانے کے باوجود آج تک علماء کرام کر رہے ہیں، دینی تعلیمی نصاب اور اس کے حاملین کو ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کے باوجود، آج بھی یہ نصابِ تعلیم اور اس کے حامل رواں دواں ہیں۔ اس کے برعکس اگر موجودہ سرکاری نصابِ تعلیم اور اس کے حاملین کی سرکاری سرپرستی ختم ہو جائے تو یہ پوری عمارت زمین بوس ہو جائے۔ نہ یہ نصاب رہے گا، اور نہ ہی اس کے حاملین کیونکہ اس کی بنیاد ذاتی خوبی پر نہیں بلکہ ملازمت کے سبز باغ پر ہے۔

کردار میں وسعت کی ضرورت

دینی مدارس کے موجودہ نظام کو برقرار رکھتے ہوئے۔ ان سے فارغ ہونے والے افراد کے معاشرتی کردار میں وسعت کا سوال حکومت سے کیا جانا مناسب ہے۔ اگر وہ خلوصِ نیت سے یہ چاہتی ہے تو اس کے لیے علماء کرام ہر ایک ذمہ داری کا بار اٹھانے پر آمادہ ہیں، یہ ذمہ داری انتظامی، قانونی، عدالتی، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تیس قسم کے علوم میں تدریس و تحقیق کے علاوہ ہر قسم کی منصوبہ بندی، میں اعلیٰ قسم کی صلاحیت کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ اگر کسی تکنیکی شعبہ میں ذمہ داری سونپنا چاہتے ہیں تو اس شعبہ میں تربیت کے بعد علماء کرام ذمہ داری قبول کرنے کو تیار ہیں جس طرح سرکاری اداروں سے فارغ التحصیل حضرات کو تکنیکی شعبہ میں اس کی تربیت کے بعد ہی ذمہ داری سونپی جاتی ہے۔ جبکہ اس تربیت کی اہلیت علماء کرام میں دوسروں کی نسبت زیادہ ہے محض انگریزی زبان کو علماء کی نااہلی کے لئے عذر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ زبان اور علم میں فرق واضح ہے۔ اگر اس کو عذر قرار دیا جائے تو علماء چھ ماہ میں اس عذر کا ازالہ کر سکتے ہیں، بشرطیکہ حکومت منصوبہ بندی میں سنجیدہ ہو نیز آزمائش شرط ہے۔

معیار کی بہتری کے لئے قواعد و ضوابط

سوال کے پہلے جز میں درسِ نظامی کا ذکر ہے غالباً دینی مدارس کے معیار کی بہتری کا سوال مراد ہے کیونکہ درسِ نظامی دینی مدارس کے نصاب کا نام ہے جس کا معیاری ہونا مسلّم ہے۔ اگر مدارس کے معیار کا سوال ہو تو پھر معیاری شرائط کے متعلق ہی سوال کافی تھا۔" کسی مقام پر نئے مدرسہ کے آغاز پر پابندی کا ذکر غیر متعلق ہے کیونکہ مدرسہ دینی تعلیم کے مرکز کا نام ہے۔ یہ مراکز جتنے زیادہ ہوں گے یہ تعلیم اتنی زیادہ ہوگی۔ جب حکومتی پالیسی بھی یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ تعلیمی ادارے قائم کیے جائیں، تاکہ تعلیم عام ہو۔

جبکہ دینی مدارس میں طلباء کی مفت تعلیم بلکہ ان کے اقامتی اخراجات بھی خود مدرسہ کے آغاز کرنے والے کو برداشت کرنا ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان اداروں کا قیام نہ صرف تعلیمی وسعت کا ذریعہ ہے بلکہ خدمتِ خلق اور اس کی فلاح کا باعث بھی ہے اس کے مقابلہ میں سرکاری تعلیم کے اداروں کے آغاز پر کوئی پابندی نہیں خواہ یہ ادارے تجارت کی بنیاد پر ہی کیوں نہ قائم ہوں اور تعلیم کے نام پر لوٹ مار ہی کیوں نہ کرتے ہوں۔ ان کا آغاز صرف اسی لیے پسندیدہ ہے کہ وہاں تعلیمی نصاب سرکاری ہے۔ رہا یہ سوال کہ دینی مدارس کے آغاز کے لیے قواعد وضوابط کیا ہوں؟ اور کون وضع کرے اور کون نافذ؟

اس کا جواب واضح ہے کہ یہ ضابطے مدارس کے اغراض ومقاصد اور اس کی تعلیم کے پیشِ نظر وضع کیے جا سکتے ہیں مگر ان کے نفاذ کے لیے آزاد معاشرہ میں جبر نہیں کیا جا سکتا البتہ اخلاقی دباؤ کارآمد ہو سکتا ہے۔ جس کی ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اداروں کو امداد مہیا کرنے والی اتھارٹی مناسب ضابطے وضع کرے اور جو ادارہ یا مدرسہ ان ضابطوں کی پابندی کرے اسے امداد دی جائے۔

مثلاً محکمہ زکوٰۃ علماء کرام کا ایک بورڈ بنائے جو معیاری ضابطے وضع کرے پھر ان ضابطوں کی پابندی کرنے والے اداروں کو امداد دی جائے لیکن اس کے لیے نیک نیتی سے اصلاحِ احوال مقصود ہو۔ محض اداروں کے قیام کو روکنا یا ان کو ناکام بنانا مقصود نہ ہو۔ ورنہ یہ ایک گناہِ عظیم اور معاشرہ کی اصلاح وفلاح کے راستہ کو مسدود کرنے کے مترادف ہوگا۔ جس کو معاشرہ کسی طرح

بھی قبول نہیں کرے گا۔

نصاب اور موجودہ تقاضے

یہ سوال نمبر ا کا اعادہ ہے۔ جس کا جواب دیا چکا ہے۔ تاہم دوبارہ وضاحت کے لیے اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ اگر سرکاری نصاب جو پرائمری تا ایم اے صرف چھ مضامین یا زیادہ سے زیادہ آٹھ مضامین پر مشتمل ہے۔ اس کے فارغ التحصیل جن کی کامیابی کا دارومدار نصاب پر نہیں بلکہ نصابی خلاصوں اور امتحانی گیس پیپرز پر ہے، اگر اسے اہل قرار دیا جا سکتا ہے تو دینی علوم کے فضلاء جن کی کامیابی کا معیار محنت اور نصاب کی تکمیل پر ہے انہیں کیوں اہل قرار نہیں دیا جا سکتا؟ اس کا سبب صرف سرکاری منصوبہ بندی کی خامی ہے۔ جبکہ عصری، علمی اور دینی قیادت آج بھی علماء کے ہاتھ میں ہے جس کا انکار اپنے آپ کو دھوکہ دینے کے مترادف ہے البتہ حکومتی قیادت کا سوال درست ہے جبکہ حکومت سیاسی، علمی یا دینی قیادت پر مبنی نہیں ہے بلکہ پاکستان میں حکومتی قیادت ایک مخصوص طبقہ کی اجارہ داری پر مبنی ہے۔

تاہم کسی بھی ترمیم و اضافہ کا کوئی مقصد متعین کرنا ضروری ہے جبکہ مقصد کے تعین کے بغیر مستحکم نصاب کو تبدیل کرنا بے معنی ہوگا بلکہ اس سے تعلیمی معیار کو گرانا اور کمزور کرنا مقصود ہوگا۔ جس کا کوئی عقل مند شخص تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس نصاب کا مشکل ہونا ہی اس کی خصوصیت ہے کیونکہ جن مقاصد کے لیے یہ نصاب وضع کیا گیا وہ عظیم تر مشکل ترین ہیں جن کا حل یہی نصاب ہے۔ لہٰذا وہ مقاصد واضح کیے جائیں تاکہ ان کے مطابق ترمیم و اضافہ ممکن ہو۔

تربیت اساتذہ

تربیتی کورسز بھی اگرچہ پڑھنے سننے کا نام ہے۔ تاہم تربیتی کورسز کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کے لیے منصوبہ بندی کرتے وقت اس بات کو ملحوظ خاطر رکھا جائے کہ یہ

کورسز علماء کے شایانِ شایان ہوں تاکہ وقت کا ضیاع نہ ہو۔ علمی یا عملی طور پر کمتر حضرات سے تربیت دلانا علماء سے مذاق متصور ہوگا۔ تربیتی کورسز کی نوعیت اس کے اغراض و مقاصد پر موقوف ہے اگر تدریسی مقاصد کے لیے ہی کورسز کرانے ہوں تو پھر ضروری ہے کہ جس قسم کی تدریس پیش نظر ہو گی اسی تدریس کے ماہرین مقرر کرنے ہوں گے۔ یہ تدریس اگر درسِ نظامی کی تو پھر درسِ نظامی کی تدریس کے ماہرین کا تقرر کرنا ہوگا جس کے لیے مصری ازہری جامع علماء کا تقرر مناسب ہوگا۔ جامع کی بات اس لیئے کی ہے کہ آج کل جامعہ ازہر کے علماء عام طور پر ایک فن میں ہی مہارت رکھتے ہیں جبکہ ہندو پاک کے علماء درسِ نظامی کے تمام علوم کے ماہر ہوتے ہیں۔ اگر تربیت دینے والا استاد کسی ایک پہلو سے بھی کمزور ہوگا تو وہ علماء کرام پر اثر انداز نہ ہوگا۔ کیونکہ طلباء اساتذہ کو ان کے کمزور پہلوؤں پر پریشان کرتے ہیں جس کی وجہ سے اساتذہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہو کر طلباء پر تفوق قائم نہیں کر پاتے۔ بہرحال کورسز کا نصاب، مدت وغیرہ، تفصیلات طے کرنے کے لیے بورڈ قائم کیا جا سکتا ہے۔ جو قابلِ عمل تجاویز مرتب کرے۔

اختلافِ مسالک

موجودہ دور میں یہ ایک لاینحل مسئلہ ہے کیونکہ یہ اختلاف انگریز نے ایک مخصوص نظریہ کے تحت پیدا کیا، جس کی بنیاد آزادیٔ فکر و عمل کے دلکش نعرہ پر رکھی گئی چنانچہ ہندوستان میں وارد ہوتے ہی انگریز نے مسلمانوں میں اس نعرہ کی تشہیر کی اور اس کے لیے آواز بلند کرنے والوں کو گرانٹس دیں اور ان کے تحفظ کی ذمہ داری لی۔ جس کا ثبوت ریکارڈ پر موجود ہے۔ انگریز تو رخصت ہو گیا اس کے افکار و نظریات اب تک جاری و ساری ہیں اور ہماری حکومت انہی نظریات اور اصولوں پر قائم ہے۔ لہٰذا موجودہ دور میں اختلافات کا خاتمہ ناممکن ہے۔ اس کے خاتمہ کی ایک ہی صورت ہے کہ اسلامی اصولوں کو اپنایا جائے اور حق و باطل میں تمیز کر کے حق کا احقاق اور باطل کا ابطال بزورِ طاقت کیا جائے۔ انگریز کی آمد سے قبل مسلمان حکمرانوں کے دور میں جس

طرح اسلامی نظریہ کا تحفظ قانونی طور پر نافذ تھا اسی طرح آج بھی کوئی مسلمان جب تک حق و باطل میں تمیز پیدا کرنے کے بعد حق کے تحفظ کو قانونی شکل نہیں دیتا اس وقت تک نئے فتنے پیدا ہوتے رہیں گے۔

حکومت اور مدارس

اس وقت حکومت اور مدارس کے درمیان محکمہ زکوٰۃ و عشر کے قیام کے بعد مالیات کے شعبہ میں قدرے تعلق قائم ہے۔ کیونکہ حکومت نے زکوٰۃ فنڈ میں سے صرف دس فی صد رقم مدارس کو دینی منظور کی ہے جبکہ اس کی تقسیم بھی بیوروکریسی کے ہاتھ میں ہے جو دینی تعلیم اور اس کے نظام اور اس کے حامل حضرات کو ایک آنکھ دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ مدارس اور اہل مدارس کو اس بہانہ سے رسوا کیا جا رہا ہے، ہوسکتا ہے یہ تعلق کچھ مدت کے بعد ختم ہو جائے۔

دوسرا تعلق: جنرل ضیاء الحق صاحب کی ذاتی دلچسپی کی بنا پر قائم ہوا ہے۔ وہ یہ کہ انہوں نے دینی مدارس کے بورڈوں یعنی تنظیم و وفاق کی سندات کو محکمہ تعلیم میں تدریسی ملازمت کے لیے ایم اے عربی/اسلامیات کے مساوی قرار دیا ہے۔ اگرچہ کاغذی طور پر یہ اعلان ہو رہا ہے اور جہاں تک یونیورسٹی گرانٹس کمشن کا دائرہ اختیار تھا وہاں تک حرکت ہوئی اس کے بعد محکمہ تعلیم کے اہل کار ہر شعبہ میں وہی لوگ ہیں جو علماء اور مدارس سے نفرت کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے اپنے دائروں میں علماء کے آگے دیواریں کھڑی کر دی ہیں۔ غرضیکہ مدارس اور حکومت کے درمیان صرف ان دو صورتوں میں برائے نام تعلق ہے جو کہ مزید نفرت کا باعث ثابت ہو رہا ہے۔

دو متوازی نظام تعلیم

اس سے متعلق گذارش ہے کہ اگر صرف نصابِ تعلیم، طریقۂ تعلیم اور اغراض تعلیم کا تفاوت ہوتا تو ان امور میں تبدیلی پر غور ہوسکتا تھا لیکن یہاں دینی اور لادینی کا سوال ہے یہ دو ضدیں بلکہ

نقیضین ہیں، ان امور کا جمع ہونا محال ہے۔اس وقت سرکاری تعلیمی اداروں ہیں ان ضدین میں معرکہ آرائی جاری ہے۔ ابھی تو انتظار کا مرحلہ ہے۔ سرکاری تعلیمی اداروں کی تعلیم کا جب تک کوئی واضح رخ متعین نہیں ہوتا اس وقت تک کوئی رائے دینا بے کار ہے۔

فی الحال سرکاری اداروں میں لادینی تعلیم کی دلیل یہ ہے کہ وہاں کے استاد اور طالب علم کے لیے دین پسندی کوئی شرط نہیں، یہی وجہ ہے کہ وہاں کے استادوں اور پروفیسروں کی اکثریت لادین ہے۔ جو انہی سرکاری اداروں کی پیداوار ہے۔

دیگر مسلم ممالک میں تعلیم

تمام اسلامی ممالک کا وہی حال ہے جو پاکستان میں ہے یعنی سرکاری اداروں میں لادینی تعلیم اور پرائیویٹ سیکٹر میں دینی تعلیم دی جاتی ہے۔ الا ماشاءاللہ وہاں کے نجی دینی تعلیمی ادارے بھی قدیم نصاب و نظام پر مبنی ہیں اور وہاں بھی متدین علماء کرام اسی بے سروسامانی میں کام کر رہے ہیں جس میں پاکستانی علماء مبتلا ہیں، تمام مسلم ممالک میں نجی دینی اداروں اور حکومت کے درمیان معرکہ آرائی جاری ہے اللہ تعالیٰ دینی اداروں کو اس امتحان میں استقامت اور استقلال عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین!

اعترافات

ابتداء سے علماء دین کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ ہر فن کی تحصیل اس فن کے مشہور ماہر سے کرتے رہے ہیں اور اس غرض کے لیے مختلف مقامات پر اساتذہ کے ہاں استفادہ کرتے اور ان سے تعلیمی سندات حاصل کرنے کو فخر محسوس کرتے تھے موجودہ دور میں بھی طلباء ایک مدرسہ سے دوسرے مدرسہ میں تعلیمی خصوصیات اور ماہرین کی شہرت کی بناء پر منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ یہ ایک اچھا اور

مقبول مقصد ہے۔

لیکن آج کل اکثر طلباء کا مقصد اس کے برعکس ہوتا ہے، وہ آج علمی خصوصیات کی بجائے آسائش اور سہولیات کے علاوہ اختصار کے متلاشی ہوتے ہیں جس کی بناء پر نصابی ترتیب کو پامال کرتے ہوئے دوسرے مدرسہ میں اپنی مرضی کی اونچی کلاس میں داخلہ لیتے ہیں۔ بناً علیہ طلباء کی استعداد اور اہلیت متأثر ہوتی ہے۔ جس سے دینی تعلیم کے اغراض و مقاصد پورے نہیں ہوتے۔ اس کے لیے سرٹیفکیٹ کا نظام رائج کرنا ضروری ہے تاکہ پہلے مدرسہ کے سرٹیفکیٹ کی بنیاد پر دوسرے مدرسہ میں داخلہ لے، اور مروّجہ نصاب کی تکمیل کے بغیر فارغ نہ ہوسکے۔ اس نظام کا پابند ہونا تمام مدارس کے لیے ضروری قرار دیا جائے۔

بعض مدارس انتظامی وسائل کے بغیر کسی بھی درجے کی تعلیم کا اعلان کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے ایک طرف ایسے مدارس کی کارکردگی متأثر ہوتی ہے تو دوسری طرف طلباء اور اساتذہ کا وقت ضائع ہوتا ہے، اس لیے مدارس کی درجہ بندی ان کے وسائل کے مطابق ہونا ضروری ہے تاکہ اساتذہ اور طلباء پریشانی سے محفوظ رہ سکیں۔

معاشرہ میں جس طرح باقی شعبوں میں جعل سازی رواج پا چکی ہے اسی طرح دینی تعلیم کے لیے دینی اداروں کے نام سے جعل سازی شروع ہو چکی ہے۔ جس سے علماء اور مدارس کا وقار مجروح ہو رہا ہے۔ اس کے سدِباب کے لیے ضروری ہے کہ کسی مسلک کا مدرسہ اس کے تعلیمی بورڈ کی منظوری کے بغیر قائم نہ ہوسکے اور بورڈ کی منظوری اور اس کے رجسٹریشن سرٹیفکیٹ کے بغیر اس مدرسہ کی امداد ممنوع قرار دی جائے تاکہ دینی اداروں کا تقدس پامال نہ ہو اور قوم کا سرمایہ بے مقصد اور بے جا صرف نہ ہو۔

بعض مدارس کورس کی تکمیل کے بغیر اور استحقاق کو نظر انداز کرتے ہوئے سندات جاری کر دیتے ہیں بلکہ بعض مدارس نچلے درجہ کو فوقانی ظاہر کرکے یا فوقانی درجہ کی شرائط پوری کئے بغیر طلباء کو اس میں داخلہ دے کر سند کا مستحق بناتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ناپختہ اور ناقص افراد

معاشرہ میں علماء کی بدنامی کا باعث بنتے ہیں۔

بنیادی اقدام

ان تمام کمزوریوں کا علاج یہ ہے کہ حکومت علماء کرام کا ایک مشترکہ نگران بورڈ بنائے جس کو قانونی طور پر ان امور کے سدِباب کا اختیار ہو، لیکن یہ بورڈ قانونی اختیار رکھنے کے باوجود اپنے دائرہ اختیار میں آزاد ہو تاکہ علماء کے بغیر کوئی حکومتی اہل کار مدارس کے کام میں دخل اندازی نہ کر سکے بلکہ حکومت صرف اس بورڈ کی سفارشات کی پابند ہو۔

مجلّہ تعلیم ۔ ۲

اسلامی تناظر میں

مقالات

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد

مباحث: اجلاس اول

مفتی سیاح الدین کاکاخیل

"تمام دینی مدارس کے تدریسی علوم میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ البتہ دینی مدارس میں جدید علوم پڑھانے کا سلسلہ تو ہونا چاہیے مگر قدیم نصاب پہلے سے خاصا جامع ہے اسی میں تخصص کی ضرورت ہے۔

پروفیسر خورشید احمد

دینی مدارس کے نصاب میں جدید فلسفے کی بھی تو ضرورت ہے جو اس وقت نظر انداز ہے۔"

مفتی سیاح الدین کاکاخیل

اس کی ضرورت یقیناً ہے اور عربی کے علاوہ اردو میں بھی اس کی تدریس ہو سکتی ہے۔ اس ضمن میں ان فلسفوں کی خوبیاں اور خامیاں دونوں واضح کر دی جائیں تو مفید رہے گا۔ جغرافیہ کی اجمالی طور پر واقفیت طلبہ کو لازماً ہونی چاہیے، باقی میرے خیال میں دینی مدارس میں کتابوں کی بجائے طریق تدریس میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں اساتذہ کو خاص محنت کرنا ہوگی۔

مسلم سجاد

اساتذہ کے لیے ریفریشر کورسوں کا انتظام قائم کیا جائے اور تربیت اساتذہ کے ادارے پرائیویٹ سیکٹر میں قائم کیے جائیں۔

حافظ نذر احمد

جدید نظام تعلیم میں اسلام کا پیوند لگانے کی کوشش کی گئی مگر یہ کوشش ناکام رہی خاص مزاج اور خاص ماحول کے بغیر یہ کام ممکن نہیں ہوگا، اسی طرح دینی تعلیم میں جدید علوم کو نہیں سمویا جا سکا۔"

مفتی عبدالقیوم ہزاروی

دنیاوی اور دینی مدارس کے تدریسی مضامین کا جائزہ لیا جا سکتا ہے حقیقت میں دینی نصاب بہت جامع ہے جبکہ میرے نزدیک دنیاوی نصاب خاصا محدود ہے۔ کالجوں اور اسکولوں میں دینی علوم کو لانے کی ضرورت ہے۔ درس نظامی میں نئے مضامین کا واضح طور پر تعین کیا جائے جو پہلے سے موجود نہ ہوں۔

مولانا گوہر الرحمٰن

یہ الجھن کیوں پیش آرہی ہے؟ سب سے پہلے اس کا جائزہ لیا جائے۔ ایک اعتراض یہ سامنے آتا ہے کہ انگریزی کے بغیر، موجودہ نظام ریاست کو فضلا و علماء نہیں چلا سکتے۔ مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ دینی مدارس کے اندر خامیاں اور خرابیاں دونوں موجود ہیں، جب ہمارا تمام تر نظام زندگی غیر اسلامی بنیادوں پر چل رہا ہے اس لیے یہ تمام تر مشکلات پیش آرہی ہیں۔ دینی مدارس کے طلبہ میں صلاحیت، محنت اور دینی علم کی کمی نہیں مگر جدید علوم کی مہارت نہ ہونے کی وجہ سے وہ موجودہ نظام کو چلانے میں ناکام رہیں گے۔ دراصل موجودہ نظام عدالت و سیاست اور معیشت و معاشرت میں انقلابی تبدیلی کے بغیر یہ سارا کام محض نصابی تبدیلیوں سے ممکن نہیں ہے۔ موجودہ صورت حال میں بڑی سے بڑی اصلاحات اپنا رنگ نہیں دکھا سکتیں اور وہ منطقی طور پر ناکام ہو جائیں گی کہ پورا نظام ان کی ضد پر قائم۔ پاکستان میں شریعت بل کی مخالفت کی وجہ بھی یہ ہے کہ لوگ استعماری عدالتی قواعد وضوابط کے مطابق اس بل کو موزوں و مناسب نہیں سمجھتے۔ باقی سمجھنے کی بات یہ ہے کہ چار علوم بنیادی نوعیت کے حامل ہیں

جن میں بنیادی "علم دین" قرآن و حدیث اور فقہ کا علم ہے۔ دوسرا وسائل فہمی کا علم، جس میں علوم دینیہ کو سمجھنے کے لیے علوم آلیہ کی ضرورت ہے۔ اسی طرح وسائل تبلیغ دین و دفاع دین ہے اس پہلو سے دین کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ تبلیغ کی بھی ضرورت ہے اس کے لیے زمانے کے عصری علوم کی موثر زبانوں کا جاننا بے حد ضروری ہے۔ جدید اصطلاحات کو مروج کرنے اور اخبارات و رسائل میں موجود مذاکرے اور مباحثے بھی زیر مطالعہ رکھنے کی ضرورت ہے فکری دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے اس کے داؤ پیچ سے آگاہ ہونا اشد ضروری ہے۔ سرمایہ داری، اشتراکیت، قادیانیت اور دوسرے فتنوں سے آگاہی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ علوم کے مطالعہ کے دوران ہی ان علوم باطل پر موثر انداز میں تنقید کی جا سکتی ہے۔ یہ بات بھی واضح ہے کہ جدید یا عصری علوم سے مراد، جدید علم اور ٹیکنالوجی ہے جو اپنی جگہ سیکھنے اور ملک کو چلانے کے لیے بے حد ضروری ہے مگر کیا ہم دینی مدارس میں ایسے ماہرین تیار کر سکتے ہیں جو جدید ٹیکنالوجی کے ساتھ ساتھ علوم شریعہ کے ماہر بن سکتے ہیں۔ میرے خیال میں ایسا انتہائی مشکل اور ناممکن نظر آتا ہے۔ یہ کام تصور کی حد تک تو مفید ہے مگر عملاً ممکن نہیں ہے۔ ہمارے درس نظامی میں اصلاح کی ضرورت ہے مگر ساری خرابی درس نظامی میں نہیں، بلکہ ہمارے موجودہ اجتماعی اور ریاستی نظام میں ہے۔

معروف شاہ شیرازی

جدید نظام تعلیم میں اصلاح کی ۷۵٪ اور دینی نظام تعلیم میں اصلاح کی ۲۵٪ ضرورت ہے۔ قرآن و سنت سے متعلق درس نظامی کے علوم عالیہ میں تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے البتہ جو علوم از خود متروک ہو چکے ہیں ان کو نکالنے کی ضرورت ہے مزید یہ کہ دینی مدارس کے لیے جدید نظام تعلیم کو اپنے اوپر حاوی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

مفتی عبدالقیوم ہزاروی

جدید علوم کو سمجھنے کے قدیم علوم سے بہرہ ور ہونا ضروری ہے۔

پروفیسر خورشید احمد

مولانا گوہر رحمٰن صاحب کے بیان کردہ چاروں نکات بنیادی اہمیت کے حامل ہیں لیکن چوتھا نکتہ بلاشبہ بہت اہمیت کا حامل ہے۔ ہمارے دینی مدارس کا موجودہ حالات میں کردار کیا ہو۔ یہ جائزہ کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔ ہمیں تو ضرورت اس چیز کی ہے کہ عام طالب علم دین کی بنیادی تعلیمات سے واقف و آگاہ ہو۔ اس سلسلہ میں دینی مدارس کیا کردار ادا کر سکتے ہیں۔ ہمیں صرف ڈاکٹر اور سائنس دان کی ضرورت نہیں، بلکہ ہمیں تو مسلمان ڈاکٹر اور مسلمان سائنس دان کی ضرورت ہے۔ اسی طرح یہ جائزہ بھی اہمیت کا حامل ہوگا کہ دینی تعلیمی اداروں اور ان کے فارغ التحصیل افراد کا اس معاشرے میں کیا کردار ہونا چاہیے۔

مولانا ظفر یاسین

جدید تعلیم میں تبدیلی لانا ممکن نہیں، البتہ دینی مدارس میں تبدیلی لانا قدرے ممکن ہے۔ اس کے نتیجہ میں چند سالوں کے اندر بڑی حد تک نمایاں تبدیلی واقع ہو سکتی ہے"۔

مولانا محمد ناظم ندوی

مقالہ نگار حضرات نے اپنے مقالات میں خاصی اچھی بحث کی ہے۔ علماء، علماء ہی رہیں گے اور ڈاکٹر، ڈاکٹر ہی، مگر دونوں کی اچھی چیزوں کو جمع کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک قسم کے اداروں سے دونوں قسم کے افراد کی تیاری ممکن نہیں ہے۔ ماضی قریب میں علوم دینیہ کے ساتھ، علوم دنیاوی کو ملانے کی کوشش کی گئی تو پھر علوم دینیہ متاثر ہوئے ہیں۔ دونوں اداروں کا الگ الگ دائرہ کار ہے علوم دینیہ کے ذریعے ایک خاص اسلامی ماحول پیدا ہوتا ہے، اس ماحول کو برقرار رکھنے کی ضرورت ہے۔

رپورٹ: افتخار کھوکھر


۲

دینی مدارس اور اسلامی معاشرہ

پروفیسر مسلم سجاد

اس عنوان کے تحت دو مختلف لیکن متعلق موضوعات پر گفتگو پیش نظر ہے۔

اولاً یہ کہ اگر مستقبل میں ہمارے ملک میں ایک اسلامی معاشرہ قائم ہو جاتا ہے جیسا کہ ہماری کوشش اور دعا ہے، تو اس معاشرہ میں دینی مدارس کے فارغ التحصیل طلبا کا کیا مقام اور مرتبہ ہونا چاہیے اور اس کے لحاظ سے موجودہ دینی مدارس کے نظام نصاب اور روایات میں کیا تبدیلیاں مطلوب ہیں۔

ثانیاً یہ کہ اسلامی معاشرہ کے قیام میں یعنی اسلامی انقلاب برپا کرنے میں دینی مدارس کے طلبا کا دورانِ طالب علمی اور اس کے بعد کیا کردار ہونا چاہیے۔ قیام پاکستان کے بعد سے جو کردار رہا ہے کیا وہ اطمینان بخش ہے؟ اگر نہیں تو اس کے اسباب کیا رہے اور ان کا تدارک کس طرح ہو سکتا ہے؟

ا۔ مستقبل کا اسلامی معاشرہ اور موجودہ مدارس

دینی مدارس اور ان کے طلبہ کے بارے میں جب بات ہوتی ہے تو قدرتی طور پر اس کا پس منظر موجودہ معاشرہ ہوتا ہے جو ایک مسلمانوں کا معاشرہ تو ضرور ہے لیکن اسے ایک اسلامی معاشرہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ عموماً اس طرح کی تجاویز پیش کی جاتی ہیں کہ ان مدارس کے نصاب میں انگریزی اور سائنس وغیرہ کو شامل کیا جائے اور ان کے فارغ التحصیل

طلبا کے لئے سرکاری ملازمتوں کے دروازے کھولے جائیں۔ ان تجاویز کا ہدف یہ نظر آتا ہے کہ ان طلبا کو بھی موجودہ نظام میں جذب کر لیا جائے لیکن کیا یہ مطلوب ہے؟ اور کیا یہ مسائل کا حل ہے؟

دینی مدارس کے نظام میں جو تبدیلیاں بھی لائی جائیں گی وہ لازماً "حالات کے تقاضوں" کے تحت ہوں گی۔ بلاشبہ ماضی میں دینی مدارس نے حالات کے تقاضوں کی پرواہ کیے بغیر یا دا گر دوسرے نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو م حالات کے تقاضوں کے تحت اپنے آپ کو مقررہ نظام اور روایات میں کسے رکھا ہے لیکن اب ہر طرف مدارس کے اندر بھی اور باہر بھی تبدیلی کی ضرورت کا احساس ہے۔ (اس کا ایک اظہار یہ سیمینار بھی ہے)

لیکن اس تبدیلی کے لئے جو سوچ اور منصوبہ بندی کی جائے اس میں کیا امور پیش نظر رہیں؟ کیا رائج نظام سے مطابقت اور موجودہ نظام تعلیم سے اختلاف کو کم سے کم کرنا مقصود ہو سکتا ہے۔ ان سطور کا مقصد اس طرف متوجہ کرنا ہے کہ تبدیلی کے لیے منصوبہ بندی میں مطمح نظر مستقبل کا اسلامی معاشرہ ہونا چاہیے۔

بالکل ممکن ہے کہ دینی مدارس کے بعض طلبہ (اور اساتذہ بھی) یہ سوچتے ہوں کہ جب اسلامی معاشرہ قائم ہو جائے گا تو پھر ان کے مدارس ہی ملک کا رائج نظام تعلیم ہوں گے اور موجودہ، (بنظر ان کے) "کافرانہ نظام تعلیم" کو ختم کر دیا جائے گا ــ جدید نظام کے پروردہ مجھ جیسے شخص کو یہ سوچ بڑی غیر عملی محسوس ہوگی، لیکن گمان یہ ہے کہ ایسی سوچ رکھنے والے کم تر ہوں گے۔ دوسری انتہا پر ایک سوچ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جدید نظام تعلیم میں مکمل اصلاح کے بعد، اگر یہ اسلامی معاشرہ کی ضروریات پورا کرتا ہے تو، دینی مدارس کے مخصوص اور علیحدہ نظام کی کیا ضرورت ہے؟

ان دونوں سوچوں میں جو بات مشترک ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ میں ایک ہی جامع نظام تعلیم ہونا چاہیے۔ اس کے فارغ التحصیل افراد باعمل مسلمان ہوں، دین کے حقیقی

تقاضوں سے آشنا ہوں اور کسی نہ کسی میدان میں معاشرہ کی خدمت انجام دیں۔ اسلامی معاشرہ کو یہ گوارا نہیں کرنا چاہیئے کہ موجودہ طریقہ کے مطابق دو علیحدہ متوازی نظام رائج رہیں اور اپنی اپنی چھاپ لگا کر شخصیت کے متضاد نمونے ڈھال ڈھال کر معاشرہ میں ڈالتے چلے جائیں۔ نظام تعلیم کو قرآن وسنت کی مطلوبہ شخصیت پیدا کرنے والا ہونا چاہیے۔ (اپنی بات واضح کرنے کے لیے یہ صراحت ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر ایک نظام تعلیم نماز روزہ کا پابند، کبائر سے مجتنب اور دین سے واقف افراد تیار کرے لیکن یہ افراد موجودہ دور کے ایک اسلامی معاشرہ کی صنعت، تجارت، بنکاری اور دفاع وغیرہ کے نظام کو چلانے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں تو میری دانست میں یہ قرآن وسنت کی مطلوبہ شخصیت پیدا کرنے والا نظام متصور نہ کیا جائے گا، اس لیے کہ خدا نے اپنی کتاب اور رسول اس لئے نہیں بھیجے کہ اس کے ماننے والے اس کا علم حاصل کریں، اس کا علم پھیلائیں اور اس کا ایک ایسا سلسلہ بن جائے کہ دین حق کو طاغوت اور باطل پر غالب کرنے کے علم کو روبہ عمل لانے کی نوبت ہی نہ آئے جس کی خاطر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری زندگی جدوجہد کی اور جو اس امت کا مشن اور مقصد وجود ہے۔)

اب ہم اپنے بنیادی سوال کی طرف واپس آتے ہیں۔ یعنی یہ کہ اگر اس سرزمین پر اسلامی معاشرہ قائم ہو جاتا ہے تو دینی مدارس کے فارغ التحصیل طلبا کا اس میں کیا مقام ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ دینی مدارس نے اپنا حال ماضی میں ہی بسر کر دیا ہے اور "حالات" سے آنکھیں بند رکھی ہیں (ایک نقطہ نظر کے مطابق) اب ہم سے یہ مطالبہ کر رہے ہیں وہ ایک دفعہ پھر موجودہ حالات سے آنکھیں بند کر کے (یعنی حالات کا ادراک کر کے) مستقبل میں چھلانگ لگا دیں۔ معلوم نہیں اس مطالبہ کو تسلیم کرنا ممکن العمل ہے یا نہیں، لیکن بہرحال اس نقطہ نظر سے سوچنے سے غور کرنے کے لیے نئی راہیں ضرور کھلتی ہیں۔

علوم دینی کے مراکز یا مکمل نظام تعلیم

اس مسئلہ پر غور کرتے ہوئے دینی مدارس کو یعنی ان کے قائدین علما کو ایک بنیادی بات کا فیصلہ کرنا ہوگا۔ وہ مستقبل کے اسلامی معاشرہ میں ان مدارس کو محض علوم دینی کے مراکز کی حیثیت سے برقرار رکھنا چاہتے ہیں، یا معاشرہ کی مختلف النوع ضروریات پورا کرنے کے لئے اپنے زیرِ تعلیم طلباء کو تربیت دینا چاہتے ہیں۔ ان دونوں مقاصد کا اسلامی معاشرہ سے یا اس کے مقاصد سے کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ مطمح نظر واضح اور صاف ہو تو اس کے مطابق منصوبہ بندی کرنا اور مقاصد حاصل کرنا ممکن ہوتا ہے۔ ایک راستہ یہ بھی ہے کہ جیسے وقت گذر رہا ہے، گذرنے دیا جائے (اس لیے اجر تو غالباً اب بھی مل رہا ہوگا) لیکن یہ راستہ دنیا میں کچھ کر دکھانے والوں کا راستہ نہیں۔ ہم جس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیوا ہیں وہ دنیا میں سب سے بڑا انقلاب برپا کر کے رخصت ہوئے تھے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ مقصد طے کر لیا جائے اور اس کے مطابق منصوبہ بندی کی جائے لیکن اگر کوئی اسلامی معاشرہ کے قیام کو اپنے دل میں ناقابل عمل سمجھتا ہے تو اسے یہ ساری بحث ہی غیر متعلق محسوس ہوگی ـــــ بھلا جب اسلامی معاشرہ قائم ہی نہیں ہوتا تو اس کے لئے تیاری کیوں کی جائے اور اگر قائم ہوا بھی تو جب قائم ہوگا، تب دیکھی جائے گی۔ اس کی تیاری کی فکر میں کیوں ہلکان ہوں۔

جن دو راستوں کی طرف نشان دہی کی گئی ہے، وہ دونوں ہی کھلے ہیں۔ آج وقت کا تقاضہ ہے کہ سوچ سمجھ کر باہم مشورہ کر کے کسی ایک راستہ پر چل پڑا جائے۔ کھڑے ہوئے بہت وقت گذر چکا ہے۔ ہمارے دینی مدارس ماضی میں کھڑے ہیں اور حال گذرا جا رہا ہے۔ ابھی وقت ہے کہ مستقبل کو گرفت میں لے لیا جائے۔

پہلا راستہ؛ دینی علوم کے مراکز

اگر دینی مدارس اپنے لے پہلا راستہ منتخب کرتے ہیں تو انہیں دینی علوم کے ماہر تیار

کرنے کا کام اسلامی معاشرہ کے تقاضوں کے مطابق انجام دینا ہوگا "As it is" تو وہ کسی اسلامی معاشرہ کی دینی علوم کی ضروریات پورا کرنے کے لائق نہیں ہیں۔ ان مدارس کے لیے اسلامی معاشرہ کا چیلنج یہی ہوگا کہ وہ ایسے ماہرین دینی علوم یعنی علماء تیار کریں جو معاشرہ کی قیادت سنبھال سکیں، موجودہ علماء اپنے محدود اور مخصوص دائرہ سے باہر ایک ثانوی حیثیت رکھتے ہیں اور برسرکار قائدین انہیں اپنی مطلب براری کے لیے بآسانی استعمال کر لیتے ہیں۔ جس نوعیت کے اور جس سطح کے علماء کی ضرورت آج سے دس سال بعد ہونا ہے اس کا اندازہ کرکے اس کے لیے تیاری کرنا آج کے لوگوں کا کام ہے۔

بنیادی طور پر دینی علوم کے تصور کو تبدیل کرنا ہوگا۔ اگر ایک عالم دین اسلام کی معاشی تعلیمات سے بخوبی واقف ہے لیکن جدید دور کی معاشیات پر اور اس کے مسائل پر اس کی کوئی نظر نہیں ہے تو اسلامی معاشرہ میں ایسے شخص کو ماہر نہیں سمجھا جانا چاہیے۔ اسی طرح دوسرے میدان ہیں، قرآن حدیث فقہ کے روایتی علوم کو بھی جدید انداز سے اور جدید پس منظر کے ساتھ مطالعہ کرنا ہوگا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ سطحی علم حاصل کیا جائے قرآن حدیث اور فقہ کا وہی گہرا علم مطلوب ہے جس میں عمریں گذار کر نظر پیدا ہوتی ہے لیکن اس کے ساتھ معاشرہ کے مسائل پر اور سرکاری پالیسیوں پر اس کا اطلاق جو محض کتابی نہیں بلکہ عملی ہو اور حقیقی میدان سے بحث کرتا ہو' یہ بھی چاہیے۔

اس طرح کے علما سیاسی میدان میں قیادت کے جوہر دکھا سکتے ہیں اور ان کی وجہ سے اسلامی معاشرہ میں پاکیزہ سیاست کی اعلیٰ روایات قائم رہیں گی۔

ایک بڑی ضرورت جوان علما کو پورا کرنا ہے وہ منصب قضا کے لیے مناسب افراد کی فراہمی ہے۔

اسی طرح خود ان مدارس کے لیے اہل اور قابل اساتذہ کی فراہمی بھی ان مدارس کا کام ہوگا۔

یہ ضرور ہے کہ اسلام میں پاپائیت نہیں ہے لیکن غالباً اب ایسے اسلامی معاشرہ کا تصور نہیں کیا جاتا جس میں مساجد کا نظام اہل محلہ رضا کارانہ طور پر چلائیں اور اس کے لئے کسی باقاعدہ مقررہ امام اور مؤذن کی ضرورت نہ ہو۔ اس لئے ان مدارس کا ایک بنیادی کام یہ برقرار رہے گا کہ ملک کی مساجد کے لئے تربیت یافتہ امام تیار کئے جائیں۔ اس کے لئے ایک تجویز یہ ہو سکتی ہے علم دین کی تعلیم کے ساتھ ساتھ امامت کا تربیت کورس علیحدہ سے شروع کیا جائے جس میں اہل محلہ سے رابطہ (Public Relations) دعوت و تربیت کی جدید تکنیک وغیرہ کے کورسز ہوں۔ فارغ التحصیل افراد کو امامت کے منصب پر تقرر میں ترجیح حاصل ہو۔

یہ چند اشارے ہیں جن کی روشنی میں موجودہ مدارس کے نصاب پر کھلے دل اور کھلے ذہن کے ساتھ غور کیا جانا چاہیے۔ ان باتوں کو اختیار کرنا چاہیے جن سے قرآن و سنت کا منشا پورا ہوتا ہو اور ان باتوں سے خوامخواہ نہ بچنا چاہیے جنہیں قرآن و سنت نے ممنوع قرار نہیں دیا ہے۔

دوسرا راستہ: مکمل نظامِ تعلیم

دوسرے راستہ کو اختیار کیا جائے تو یہ دراصل ایک بہت بڑے چیلنج کو قبول کرنا ہوگا۔ اس کے لیے غیر معمولی تخیل، سوچ، ندرت اور عزم و استقلال سے کام کرنے کی ضرورت ہے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آج سے صدیوں قبل یہ مدارس جس طرح رائج الوقت معاشرہ کی تمام ضروریات کو پورا کرتے تھے۔ اسی طرح مستقبل میں بھی اسلامی معاشرہ کی تمام ضروریات پورا کریں۔ دوسرے الفاظ میں جب ایک اسلامی حکومت جدید نظام تعلیم کو اسلامی نظام تعلیم میں تبدیل کرے تو وہ دراصل صرف یہ کرے کہ اس نظام تعلیم کو اختیار کرے جو دینی مدارس نے اپنے ہاں رائج کر لیا ہو۔ دینی مدارس متوازی طور پر اپنے کو ایک مکمل نظام تعلیم کی شکل میں ڈھالیں۔ یعنی نادان بن کر چند کلیوں پر قناعت نہ کریں۔

اس پر تفصیلی بات ہو سکتی ہے اور پورا نقشہ مرتب ہو سکتا ہے۔ اپنی بات سمجھانے کے لیے

لیکن اپنی بات کو مختصر کرتے ہوئے میں بہت چھوٹے پیمانے کی ایک مثال دوں گا۔ مثلاً آغاز کے طور پر ایک دینی مدرسہ اپنے ساتھ ملحق ایک کامرس کالج (یا لاکالج، یا میڈیکل کالج ......) کھولے اور یہاں کے کامرس گریجویٹ اسلامی کردار اور دینی معلومات کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ کامرس کے بہترین پیشہ ور گریجویٹ ہوں اور اپنا سکہ منوائیں۔

اگر دینی مدارس اس طرح کے تجربات کریں تو اسلامی معاشرہ کی ہر طرح کی ضروریات پورا کرنے کے لائق ہوں گے اور ایسی مثال اور نمونہ پیش کریں گے کہ وقت آنے پر پورا نظام تعلیم اس کے مطابق استوار کرنا ممکن ہو گا۔

۲۔ اسلامی انقلاب اور مدارس کے طلبہ کی قوت

اب اس مضمون کا دوسرا موضوع یعنی اسلامی انقلاب برپا کرنے میں اسلامی معاشرہ کے قیام کی جدوجہد میں دینی مدارس، یعنی ان کے طلبہ و اساتذہ، کا کیا کردار ہونا چاہئیے۔ اسی ذیل میں یہ بحث آئے گی کہ قیام پاکستان کے بعد اس جدوجہد میں دینی مدارس کا کیا کردار رہا ہے۔

برطانوی دور میں دینی مدارس نے اسلامی علوم کی شمع روشن رکھنے کا اور ایک محدود دائرہ میں اسلامی اقدار کے تحفظ کا جو کردار ادا کیا ہے اس کی تحسین امت مسلمہ کا ہر بہی خواہ کرتا ہے لیکن قیام پاکستان کے تاریخ ساز واقعہ نے دینی مدارس اور ان کے قائدین علماء کے سامنے جو چیلنج پیش کیا، کیا یہ مدارس اس کا جواب دے سکے؟

وہ چیلنج کیا تھا؟ آزادی کی تحریک اسلام کے نام پر چلائی گئی۔ پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ کے نعرے لگائے گئے اور عام مسلمانوں نے محض اسلامی ریاست اور اسلامی معاشرہ کے خواب دیکھ کر اس تحریک کے لئے اپنا تن من دھن لٹا دیا۔ اہلِ نظر دیکھ رہے تھے کہ نئے ملک میں اسلامی نظام کا نفاذ آسان کام نہ ہوگا۔ اسلام کے لیے مخلص ہر شخص کے لیے قیام پاکستان کا چیلنج یہ تھا کہ وہ موجودہ جذباتی فضا کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسلامی نظام کے قیام کو ممکن بنانے کے لئے اپنی بساط بھر سب کچھ کر ڈالے تاکہ صدیوں بعد ملنے والا یہ موقع ضائع نہ ہو۔ یقیناً اس

چیلنج کے اصل مخاطب علماء اور ان کے زیر اثر چلنے والے ہزاروں مدرسوں کے لاکھوں طلبا تھے۔

دینی مدارس کے اساتذہ اور طلبا لاکھوں کا وہ گروہ تھے جن کی پوری زندگی دین کی نذر ہوتی ہے، بالعموم زندگی کے بارے میں وہ مادہ پرستانہ نقطہ نظر نہیں رکھتے۔ ان کی نظر آخرت کی زندگی پر ہوتی ہے اور پھر یہ کہ ان کا جال سارے ملک میں پھیلا ہوا ہے۔ کوئی دور دراز گوشہ بھی ان کے اثرات سے خالی نہیں ہے۔ مساجد کے ذریعہ ان کا عوام سے براہ راست رابطہ ہے۔ انہیں اس لحاظ سے ایک منظم گروہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے اساتذہ کی ہر بات پر آمنّا وصدّقنا کہنے کی خوب تربیت پائے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان عوامل کی وجہ سے دینی مدارس اور ان کے طلبا پاکستانی معاشرہ کی ایک بڑی قوت تھے (اور ہیں)۔

اگر یہ قوت متحد منظم اور فعال ہو کر اسلامی نظام کے غلبہ کے لیے متحرک ہو جاتی تو آزادی کے پانچ دس سال بعد یہ ملک اسلام کا گہوارہ بن جاتا، خیر و برکت کا دور دورہ ہوتا اور آج ہمیں اپنی آنکھوں اور کانوں سے شعائر اسلام کی تضحیک کے مناظر دیکھنے اور سننے کی آزمائشوں سے نہ گذرنا پڑتا۔

حالات کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دینی مدارس کے اساتذہ و طلبا اس امر کے منتظر رہے کہ کوئی دوسرا اسلامی نظام نافذ کرے یا اس کے لیے جدوجہد کرے۔ حالانکہ مدارس اور ان کے طلبہ پر غلبہ اسلامی کی جدوجہد بدرجہ اولیٰ فرض تھی۔ بدقسمتی سے ان کے رہنما حالات کا صحیح ادراک کر کے ملک میں موجود اپنی طاقت کو غلبہ دین کے لیے استعمال نہ کر سکے۔ قیام پاکستان نے جو زریں موقع فراہم کیا تھا وہ ضائع ہوتے ہوتے چالیس برس گذر گئے۔ دینی قیادت نے یہ سوچا کہ دین دشمن عناصر اس ملک میں اسلامی نظام کو روکنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں گے اور اگر مدارس کے طلبہ اور اساتذہ کی عظیم قوت میدان میں نہ لائی گئی تو اس کا اندیشہ ہے کہ یہ ملک اسلام دشمنوں کے نرغہ میں چلا جائے اور یہاں مدارس اور علماء کا وہی حشر ہو جو سمرقند و بخارا میں ہو چکا ہے۔ وہ بائیس نکات پر دستخط کرنے کو عظیم کارنامہ سمجھتے رہے حالانکہ حالات

کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس جدوجہد میں اپنی قوت کی آخری رمق بھی جھونک دی جائے۔

کوتاہی کے اسباب

پاکستان میں اسلامی معاشرہ کے قیام کی جدوجہد کا یہ سرسری تجزیہ یہ بتانے کے لیے کافی ہونا چاہیے کہ اس جدوجہد میں ہمارے مدارس نے وہ کردار ادا نہیں کیا جس کا تقاضا ان کا دین ان سے کرتا تھا۔

اس کے ضرور کچھ اسباب تھے۔ ان میں سے کچھ یہ تھے۔

۱۔ قائدین اس چیلنج کا ادراک ہی نہ کر سکے جو آزادی کے حصول اور اسلام کے نام پر حصول سے پیش آ گیا تھا۔

۲۔ مدارس کی مسلکوں کے لحاظ سے تقسیم نے انہیں کسی متحدہ اقدام کے قابل ہی نہ چھوڑا

۳۔ انگریزوں کے دور میں دین کی ایسی تعلیم دی گئی جس میں معاشرہ کو بدلنے اور اسلام کو غالب کرنے کا تصور خارج از بحث تھا۔ آزادی کے بعد یہ جاری رہا۔ اس لیے طلبا تبدیلی کے کسی احساس اور عزم سے محروم رہے۔

۴۔ مدارس کے نصاب میں تبدیلی کی باتیں تو بہت ہوئیں لیکن کسی حقیقی اور انقلابی تبدیلی کے لیے اندر سے کوئی ایسی تحریک نہ چلی جو برگ و بار لاتی۔

۵۔ مدارس کے ذمہ داروں نے اپنے طلباء کو دین کی عملی جدوجہد میں شرکت سے باز رکھا اور اس طرح اپنی طاقت کو خود ہی بے اثر بنا لیا۔

لائحہ عمل

اگر دینی مدارس کے ارباب وحل وعقد اور طلبا سرزمین پاکستان میں غلبہ اسلام کی جدوجہد میں کوئی فیصلہ کن کردار ادا کرنا چاہتے ہیں تو انہیں غور و فکر کر کے کوئی مشترکہ لائحہ عمل اختیار کرنا

ہوگا۔ پاکستان ہمیشہ ہی نازک دور سے گذرا ہے لیکن شاید یہ غلط نہ ہو کہ آج کی طرح کے نازک دور سے پہلے نہیں گذرا۔ ابھی دولخت ہونے کا زخم نہیں بھرا ہے کہ نئے گھاؤ لگانے کی تیاریاں ہیں۔ ان حالات میں دینی مدارس کے تین لاکھ سے زائد طلبا جو اپنی زندگیاں دین کے لئے وقف کئے ہوئے ہیں مقصد کا شعور حاصل کر کے میدان میں آئیں تو حالات کا رخ بدل سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں چند تجاویز پیش ہیں۔

۱۔ نصاب میں بنیادی حیثیت قرآن پاک اور سنت کے براہ راست مطالعہ کو دی جائے۔ قرآن کے مطالعہ میں جدید دور کی تفاسیر سے بھی استفادہ کیا جائے۔

۲۔ سیرت کا تفصیلی مطالعہ اس عنوان سے ہو کہ کس طرح آپ نے اپنی زندگی دعوت میں صرف کی اور کس طرح آپ نے اپنے دور میں انقلاب برپا کیا۔

۳۔ اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں یعنی سیاسی نظام اور معاشی نظام وغیرہ کے بارے میں اسلام نے جو نقشہ پیش کیا ہے، وضاحت سے اس کی تدریس کی جائے

۴۔ دور جدید کے گمراہ مفکرین اور ان کے ملحدانہ نظریات کا تنقیدی مطالعہ بھی کروایا جائے۔

۵۔ حالات حاضرہ پر غور و فکر کی تربیت کے لیے سیمینار کا طریقہ اختیار کیا جائے۔

۶۔ اسلامی انقلاب کے لیے عوام کو متحرک کرنا ضروری ہے۔ اس مقصد کے حصول میں مساجد اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔ یہ کام صحیح تربیت یافتہ آئمہ ہی کر سکتے ہیں۔

۷۔ دینی مدارس کے طلبہ کو اسلامی حمیت کے مسائل پر سڑکوں پر آنے میں تکلف نہ کرنا چاہیے۔ حرمتِ دین کی خاطر اتنا جہاد "دین کی نظری" تعلیم کے ساتھ "پریکٹیکل" کے طور پر جزو نصاب ہو۔

۸۔ ان طلبا کو معاشرہ میں ہونے والے مظالم کے خلاف آواز بلند کرنے کی تربیت

دی جائے۔ اس طرح یہ طلبہ عوام کے دکھ درد میں شریک ہو کر ان کی آنکھ کا تارا بن سکتے ہیں۔ نیز اس طرح اسلام کی شناخت مظلوموں کے ملجا و ماویٰ کی حیثیت سے ہوگی۔

اگر ہمارے دینی مدارس کے طلبہ، اور ان کے نگراں اور رہبر علماء، یکسو ہو کر درج بالا طریقے اختیار کریں، تو امید کی جا سکتی ہے کہ گذشتہ چالیس برس میں جو کوتاہی رہی ہے، اس کا ازالہ ہو سکے اور پاکستان میں اسلامی نظام کی منزل قریب آسکے۔

،مجلہ تعلیم اسلامی تناظر میں۔ ۳

اسلامی ریاست میں نظام تعلیم

پروفیسر مسلم سجاد

"تعلیمی افق پر ایک
درخشاں ستارہ اس موضوع پر
ایک جامع ترین کتاب ہے،
جو نظری امور سے ہی نہیں بلکہ
عملی مسائل سے بھی حقیقت پسندانہ
انداز میں بحث کرتی
ہے"

پیش لفظ، پروفیسر خورشید احمد

دینی تعلیم کے مختلف پہلو

پروفیسر محمد یاسین ظفر

پاکستان میں اسلامی معاشرہ کے قیام اور اسلامی اصولوں کے مطابق پاکستانی معاشرہ کی رہنمائی کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ درس نظامی کے فارغ التحصیل علماء کرام کو مؤثر کردار ادا کرنے کے مواقع بہم پہنچائے جائیں تاکہ وہ پاکستان میں نفاذ شریعت کے عمل کے ساتھ اسلامی تعلیمات کو فروغ دے سکیں۔

کسی بھی قوم یا ملک کا نظام تعلیم اور نصاب ان کی تہذیب و ثقافت کا آئینہ دار ہوتا ہے اور ہر قوم اُسے اپنی ضروریات کے پیش نظر مرتب کرتی ہے۔

برصغیر میں انگریز کے آنے سے پہلے جو طریقہ تعلیم یا نصاب رائج تھا وہ ہماری تمام ضروریات پوری کر رہا تھا۔ مدارس کے فارغ التحصیل حکومت کی سطح سے لے کر زندگی کے ہر شعبے میں خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ لیکن انگریزوں نے یہاں قدم رکھتے ہی جہاں بے شمار اصلاحات کیں، وہاں نظام تعلیم اور نصاب تعلیم بھی تبدیل کیا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کے عزائم کی تکمیل موجودہ نصاب اور نظام سے نہیں ہوگی۔ حکومت چلانے کے لیے ہر شعبے میں اپنی مرضی کے افراد فراہم کرنے کے لیے نصاب کے اندر مذہب کو نظر انداز کیا اور لادینی نظام نافذ کیا۔

مگر افسوس ان پر نہیں اپنوں پر ہے کہ چالیس سال بعد بھی ہم وہاں ہی کھڑے ہیں جہاں انگریز ہمیں چھوڑ کر گیا تھا۔

چاہیے تو یہ تھا کہ فوری طور پر نصاب میں انقلابی تبدیلیاں کی جاتیں اور ایسا نصاب اختیار کیا جاتا جو مذہبی نقطۂ نظر سے کامل ہوتا اور جدید تقاضوں کو بھی پورا کرتا اور سائنس اور ٹیکنالوجی

کے موجودہ دور کے تقاضوں کو پورا کرتا۔ اس طرح دینی مدارس اور جدید نظام تعلیم کے درمیان خلیج مکمل نہیں تو قدرے کم ہوتی، لیکن ایسا نہیں ہوا۔

اب میں ان نکات کی طرف آتا ہوں جن کی نشاندہی کی گئی ہے۔

کردار میں وسعت

دینی مدارس سے فارغ التحصیل علمائے کے مصرف کا جہاں تک سوال ہے تو یہ صرف ایک شخص سے متعلق مسئلہ نہیں ہے۔ ہم نے آج تک انہیں صرف لبطور امام، خطیب یا سکول کی حد تک آزمایا ہے کیا کبھی کسی نے انہیں کسی اور میدان میں بھی جگہ دی ہے اور انہیں آزمایا ہے۔

صرف یہ کہہ دینا کہ غیر تربیت یافتہ ہیں کسی اور میدان میں نہیں چل سکتے۔ میرے خیال میں غیر درست ہے۔ ہم نے انہیں کبھی موقع ہی نہیں دیا۔

میں سمجھتا ہوں انہیں اگر موقع ملے تو یقیناً اپنی صلاحیتوں سے بہتر نتائج سامنے لا سکتے ہیں مثال کے طور پر اس وقت کالج اور یونیورسٹیوں کے شعبہ اسلامیات اور عربی کام کر رہے ہیں۔ ان کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے جو مدرسین رکھے جاتے ہیں انہوں نے محض وہ معمولی اور مختصر نصاب پڑھا ہوتا ہے جو یونیورسٹی کی جانب سے مقرر ہیں کیا ہی اچھا؟ اگر اس ضرورت کو معیاری درسگاہوں کے فارغ التحصیل علماء کرام سے پورا کیا جائے یقیناً اس کے نتائج بہتر ہو سکتے ہیں اور پڑھنے والوں کو بھی اندازہ ہو کہ وہ اسلامیات کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

حضرات! اس طرح ان کے لیے ایک نہایت ہی عمدہ میدان بن سکتا ہے۔

معیار کی بہتری

موجودہ صورت میں جو شخص بھی فارغ ہوتا ہے ایک نئے دینی مدرسہ کی بنیاد رکھ لیتا ہے اور چندہ کی فراہمی کے لئے بھرپور مہم چلاتا ہے جس کی وجہ سے مدرسوں کا معیار بہت ہی گر

گیا ہے اور مستحق مدارس بھی اس سے متأثر ہوئے ہیں۔ اس پر مکمل پابندی ہونی چاہیے۔ اس کا طریقۂ کار یہ ہے کہ حکومت پاکستان نے جو وفاق منظور کئے ہیں ان کو ذرا متحرک اور منظم کیا جائے۔

ہر مسلک اپنے وفاق کو تسلیم کرے اور ان کا بنایا ہوا نظام اور نصاب اپنے مدرسے میں رائج کرے اور جتنے بھی مدارس یا جامعات وفاق کے تحت ہوں ان کی درجہ بندی کی جائے۔ اور حکومت کسی بھی ادارے کو رجسٹرڈ نہ کرے تاوقتیکہ وہ وفاق کی طرف سے سرٹیفکیٹ پیش نہ کرے اور نہ ہی اسے ادارہ کھولنے کی اجازت دے اور ہر مدرسہ میں کم از کم پچاس طلبہ کا ہونا ضروری قرار دیا جائے اور وفاق اس نظام کے نفاذ کی ذمہ دار ہو۔

نصاب اور موجودہ دور کے تقاضے

عربی کا مقولہ ہے کہ "لِکُلِّ فَنٍّ رِجَالٌ" کہ ہر میدان کے لیے آدمی مخصوص ہوتے ہیں جس طرح کی انہیں تعلیم دی جائے اس طرح کا اگر ان سے کام لیا جائے تو بہتر نتائج سامنے آئیں گے۔ رہی بات موجودہ دور میں عصری قیادت کے پورا کرنے کی ہے۔ میرے خیال میں جو قیادت اس وقت سیاست دان کر رہے ہیں ان سے تو بہتر طور پر ہی انجام دیں گے بشرطیکہ علمائے صحیح معنوں میں عالم ہوں۔ تو وہ یہ کام بخوبی سرانجام دے سکتے ہیں۔

لیکن اس کے ساتھ انہیں پھر تربیت کی ضرورت ہے تاکہ جو کام ان کے سپرد کیا جائے اس کے مسائل کو سمجھ کر فوری حل تلاش کر سکیں۔ اس سلسلے میں نصاب کے علاوہ ان کے لیے تربیت گاہیں کھولی جائیں اور ان میں تمام جدید مضامین رکھے جائیں۔

درسی کتب کی جدید طرز پر تیاری

نصابی کتب کی نئے سرے سے تجدید کی ضرورت نہیں بلکہ اس میں جدید علوم کو بہتر طریقے سے سمو دیا جائے اور خاص کر دینی مدارس کے ابتدائیہ اور متوسطہ میں وہ کتب نصاب میں رکھ

دی جائیں جو عرب ممالک (سعودیہ اور مصر) میں رائج ہیں تو کافی حد تک جدید تقاضے بھی پورے کرے گا اور حاشیوں کی بھرمار سے بھی نجات مل جائے گی۔

اساتذہ کی تربیت

موجودہ حالات میں سائنسی ایجادات اور نئی اصطلاحات سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ خاص کر کمپیوٹر کے ذریعے قرآن کریم اور حدیث شریفہ کی تحقیق ہو رہی ہے۔ ہر فارغ التحصیل ہونے والے کو آگاہ کرنا چاہیے کیونکہ یہاں ہر مکتب فکر کے علیحدہ مدارس ہیں اس نسبت سے علیحدہ علیحدہ مرکز ہوں اور ان میں جدید طریقوں سے تعلیم دینے کا خاص انتظام ہو۔

علاوہ ازیں اساتذہ کرام کی تربیت کے لیے مخصوص پروگرام ہونے چاہئیں۔ اس کا انتظام بھی مرکز کرے۔ اس پر فن تدریس، طریق تدریس، اصول تدریس جیسے موضوعات کے علاوہ عملی طور پر بھی تربیت ہونی چاہیے۔ اس کے لیے باہر سے کسی اسلامی یونیورسٹی سے وڈیو کیسٹ منگوائے جا سکتے ہیں اور ان کے ذریعے بہترین طریقے سے ان کا اسلوب اور طریقہ تعلیم دیکھا جا سکتا ہے۔ اور یہاں سے تربیت پانے والوں کو اسناد دی جائیں اور ان کی تقرری کی باقاعدہ سفارش کی جائے۔

مسلک کا اختلاف

دینی مدارس میں اختلافِ مسالک کے اسباب یوں تو اور بھی ہوں گے مگر ایک عام اختلاف جو معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اکثر مدارس میں قرآن وحدیث سے براہ راست اکتساب کی بجائے فقہی مسائل پر زیادہ زور دیا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ فارغ التحصیل فروعی مسائل میں اپنا سارا وقت صرف کرتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ہر مسلک کے مدارس دن بدن زیادہ ہو رہے ہیں۔ وہ اپنے مسلک کی ترویج کے لیے صرف امتیازی مسائل پر خصوصی توجہ دیتے ہیں بلکہ بعض مدارس صرف مناظرے کی

تربیت دیتے ہیں۔

اگر مدارس میں قرآن و حدیث سے براہ راست استفادہ کرنے کی تربیت دی جائے تو یہ فروعی مسائل میں اختلافات کافی حد تک کم ہو سکتے ہیں۔

مدارس اور حکومت

پاکستان میں دینی مدارس کی دو اقسام ہیں۔ ایک اوقاف کے تحت چل رہے ہیں اور دوسرے صاحب ثروت حضرات کے عطیہ وغیرہ سے چل رہے ہیں۔

موجودہ دور میں دینی مدارس اور حکومت میں زکوٰۃ اور دیگر فنڈز کے حصول کی حد تک رابطہ ہے جو کسی طرح سود مند نہیں۔

چونکہ دینی مدارس کے منتظمین اپنے مدارس میں حکومتی مداخلت پسند نہیں کرتے البتہ اس کیلیے وفاق المدارس کے تحت قواعد وضوابط بنانے چاہئیں اور ان کے نظم ونسق کے تحت درجہ بندی کے حساب سے تعلیم دی جائے تو کسی حد تک یہ نظام مربوط ہو سکتا ہے۔

یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کی رپورٹیں اس سلسلے میں معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔

دو متوازی نظام

جدید تعلیمی نظام اور درس نظامی کو قریب لانے کی اشد ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں اگر سعودیہ میں رائج نظام کا مطالعہ کیا جائے تو بہت مفید ہوگا۔ کم از کم بی۔ اے کی سطح تک جو نظام ہے اسے اپنانے میں یہ فائدہ ضرور ہوگا کہ لڑکے میں یہ استعداد پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ خود مسائل کو سمجھ کر ان کا حل ڈھونڈ سکتا ہے اس کے بعد تخصص کی کلاسیں ہوں۔ یہ نظام دو نظاموں کو قریب لانے کے لیے نہایت مفید ہو سکتا ہے۔ دینی مدارس میں موجود نصاب میں ریاضی، تاریخ، ادبیات، پولیٹیکل سائنس ایجوکیشن وغیرہ مضامین کو ضم کیا جائے منطق

علم کلام، علومِ عقلیہ کی اصلاح کی جائے۔

دیگر غیر مسلم ممالک

دیگر اسلامی ممالک میں دینی تعلیم کا نظام مختلف ہے۔ بعض ممالک میں دینی مدارس بھی حکومت کے زیرِ اثر چل رہے ہیں۔ لیکن ان کے حالات اتنے اچھے نہیں (مثلاً مالدیپ) انڈونیشیا میں دینی مدارس آزادی سے کام کر رہے ہیں۔ اکثر مدارس کا نصاب ملتا جلتا ہے جس کے نہایت اچھے نتائج ہیں اور طلبہ کے اندر استعداد بھی پائی جاتی ہے۔

اسی طرح سعودیہ میں بھی دینی مدارس حکومت کے تحت ہیں لیکن ان پہ علماء حاوی ہیں۔ جس کی وجہ سے نتائج بہت اچھے ہیں۔

علم کلام، علومِ عقلیہ کی اصلاح کی جائے۔

دیگر غیر مسلم ممالک

دیگر اسلامی ممالک میں دینی تعلیم کا نظام مختلف ہے۔ بعض ممالک میں دینی مدارس بھی حکومت کے زیر اثر چل رہے ہیں۔ لیکن ان کے حالات اتنے اچھے نہیں (مثلاً مالدیپ) انڈونیشیا میں دینی مدارس آزادی سے کام کر رہے ہیں۔ اکثر مدارس کا نصاب ملتا جلتا ہے جس کے نہایت اچھے نتائج ہیں اور طلبہ کے اندر استعداد بھی پائی جاتی ہے۔

اسی طرح سعودیہ میں بھی دینی مدارس حکومت کے تحت ہیں لیکن ان پہ علماء حاوی ہیں۔ جس کی وجہ سے نتائج بہت اچھے ہیں۔

پر بکلی طور پر بند ہو گئے اور ان لوگوں کا میدانِ کار صرف امامت اور خطابت رہ گیا۔ ان لوگوں میں سے جو لوگ زیادہ ذہین تھے وہ ان اسلامی مدارس میں بطور استاد جگہ پا لیتے جو ہندوستان وغیرہ میں موجود تھے۔ گذشتہ دو سو سال سے یہ فضلاء اسی کسمپرسی کی صورت حال سے دوچار رہے اور مشکل ترین حالات میں زندگی بسر کرتے رہے، لیکن اسلامی تہذیب کو بچانے کے لئے، انہوں نے جو طویل جدوجہد کی اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج پوری دنیا میں پاک و ہند کے مسلمانوں پر دینی رنگ غالب ہے اور ان کی دینی فکر اور دینی سوجھ بمقابلہ دوسرے ممالک کے مسلمانوں کے زیادہ پختہ ہے۔ آج عالمِ اسلام ہند و پاک کے جن دو افراد یعنی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی سے فکری غذا حاصل کرتا ہے، وہ دونوں افراد اسی قدیم نظامِ تعلیم کی پیداوار ہیں۔

اب ہمارے سامنے اہم سوال یہ ہے کہ اس قدیم نظام کے فضلاء کے لیے میدانِ کار کیا ہونا چاہیے۔ تاکہ اس میدان کے تقاضوں کے مطابق ان مدارس کے نظام اور نصاب میں اصلاح کی جائے۔ میرے خیال میں موجودہ میدانِ کار یعنی امامت، خطابت اور اسلامی مدارس میں تدریس کے علاوہ ان فضلاء کو محکمہ قضا، جدید پرائمری، سیکنڈری اور یونیورسٹی لیول کی تدریس کے لئے تیار کیا جانا چاہیے۔ اس کے علاوہ محکمہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اگر قائم ہو، تو اس کے لئے بھی ان فضلاء کو تیار ہونا چاہیے۔ مزید ایک اہم میدانِ کار یہ ہونا چاہیے کہ دعوتِ اسلامی کی عالمی توسیع کے لئے ہر سفارت خانے کے ساتھ تبلیغی اتاشی ہونا چاہئے اور اس کا انتخاب ان فضلاء میں سے ہونا چاہیے۔

ان نئے میدان ہائے کار کو پیش نظر رکھتے ہوئے فضلائے اسلامی مدارس کی تربیت کے لئے جو اہداف متعین ہوتے ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

۱) اسلامی مدارس کے نظامِ امتحانات میں میٹرک، ایف اے اور بی اے اور ایم اے لیول کے درجات کا تعین اور جن فضلاء نے ایسے امتحانات پاس کئے ہوئے ہوں انہیں

ٹیچرز ٹریننگ کالجوں میں تربیت کے لیے داخلہ دیا جانا چاہیے۔

۲) محکمہ قضا میں کام کرنے کی خاطر ان کو شریعت (ایل ایل بی) کورسز میں داخلہ دلایا جائے اور جب تک ان مدارس کے معیارِ تعلیم کے تعین کا فیصلہ نہیں ہو جاتا اس وقت تک ان فضلاء کو داخلہ کے لیے سخت ٹسٹ سے گزارا جائے اور جن لوگوں کو تبلیغ اتاشی کے لئے بھیجا جائے ان کو اسلامک یونیورسٹی یا ایسی ہی دوسری یونیورسٹیوں کے الدَّعْوَہ فیکلٹی سے گذارا جائے۔

میں یہاں ان تاریخی کوششوں پر تنقید کئے بغیر نہیں رہ سکتا جو اہلِ ندوہ اور اہلِ مدرسۃ الاصلاح نے ان فضلاء کو ان مقاصد کے لیے تیار کرنے پر صرف کیں جن کے لئے جدید کالج اور یونیورسٹیاں لاکھوں افراد تیار کر رہی ہیں۔ جن کا خود اپنا نہ مصرف ہے نہ کوئی مقصد اور نہ ان فضلاء کا کوئی معیارِ اخلاق ہے اور نہ کوئی معیارِ دین ہے۔ ان اصلاحی کوششوں کا نتیجہ صرف یہ نکلا۔ ندوہ اور مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر) کے فضلا نے امامت و خطابت بھی چھوڑ دی اور جدید نظام میں (پی سی ایس) یا (سی ایس پی) بھی نہ بن سکے۔ اس لیے میرا خیال یہ ہے کہ موجودہ مدارس کی اصلاح صرف انہی مقاصد کے لیے کی جائے جن کا اُوپر تذکرہ ہوا۔ اصلاح کے زیادہ محتاج جدید مدارس کالج اور یونیورسٹیاں ہیں۔ جن میں لاکھوں سے بڑھ کر اب کروڑوں افراد بے مقصد تیار ہو رہے ہیں۔

دینی مدارس کی اصلاح

اسلامی مدارس کی اصلاح کی بعینہٖ اسی طرح ضرورت ہے جس طرح جدید مدارس اور یونیورسٹیوں کی اصلاح کی ضرورت ہے لیکن اصلاح کا یہ کام اس طرح ہرگز نہ ہو کہ بجائے اصلاح کے موجودہ نظام ہی درہم برہم ہو جائے۔ مثلاً یہ کوئی اصلاحی کام نہ ہوگا کہ مدارس کھولنے پر پابندی عائد کر دی جائے۔ آج کل جدید پرائمری سکول مشروم کی طرح کھل رہے ہیں اور

تجارتی بنیادوں پر کام کر رہے ہیں اور بڑی بڑی فیسیں لیتے ہیں اور ان پر حکومت کی طرف سے کوئی پابندی نہیں ہے لہذا اس بات کے لیے کوئی اخلاقی جواز نہیں ہے کہ اسلامی مدارس جو صرف دین کے جذبے کے تحت کام کرتے ہیں ان پر پابندی عائد کی جائے البتہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن اسلامی مدارس کی جن سندات کو تسلیم کرتا ہے اس کے لیے یہ شرط عائد کی جا سکتی ہے کہ سند کا حامل شخص میٹرک پاس ہو۔ اگر کوئی شخص کوئی ملازمت حاصل کرنا نہیں چاہتا اور امامت و خطابت کے فرائض پر ہی اکتفا کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے کسی قاعدے اور ضابطے کی پابندی کی ضرورت نہیں ہے۔

مدارس کی اصلاح کے سلسلے میں ایک بات محرک بن سکتی ہے وہ یہ کہ حکومت چاروں صوبوں میں ایک معیاری نصاب کے ساتھ کچھ مدرسے قائم کر دے جو داخلی اعتبار سے بالکل آزاد ہوں اور ان میں ایک معیاری نصاب کی تعلیم دی جائے۔ دوسرے یہ کہ حکومت نے رابطہ المدارس یا وفاق المدارس کے نام جو بورڈ تسلیم کر رکھے ہیں۔ اسلامی مدارس کے تین امتحانات وہ لیں اور دورہ حدیث کا آخری امتحان اور ان وفاقوں کا ایک مشترکہ بورڈ لے۔ اس طرح ان وفاقوں کو اعتراض بھی نہ ہوگا اور ان مدارس کے لیے ایک معیار خود بخود سامنے آجائے گا اور جو پورے ملک کے اندر ایک ہوگا۔

فضلائے دینی مدارس اور عہد حاضر کے تقاضے

ایک تصور یہ پایا جاتا ہے کہ اسلامی مدارس کے فضلاء کو ان فضلائے کے بالکل برابر لا کھڑا کر دیا جائے جو مروجہ یونیورسٹیوں میں تیار ہوتے ہیں اور دور حاضر کے تمام تقاضے پورے کرتے ہیں۔ میرے خیال میں اس قسم کی کسی اصلاح کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ موجودہ دور میں تکنیکی تقاضے اور فنی شعبے ایسے ہیں کہ ان میں جو شخص گم ہو جائے وہ پوری زندگی میں اپنے شعبے کے تمام تقاضے پورے نہیں کر سکتا۔ مثلاً ایک انجنیئر ایک ڈاکٹر وغیرہ۔

اب اگر اسلامی مدارس کے فضلاء کو بھی اس منہج پر ڈال دیا گیا تو پھر امامت وخطابت اور اسلامی مدارس یا جدید مدارس میں درس وتدریس کے لئے موزوں افرادِ کار سرے سے دستیاب ہی نہ ہوں گے، اور جن فضلأ کو بہت زیادہ جدید تقاضوں کے مطابق ہم آہنگ کر دیا گیا، وہ اس فنکشن کو بھی پورا نہ کر سکیں گے جو وہ آج کل پورا کر رہے ہیں۔

البتہ ایک تبدیلی ضروری ہے۔ وہ یہ ہے کہ اسلامی مدارس کے نصاب یا نظامِ تربیت میں جنرل سائنس اور جنرل نالج کی تعلیم لازمًا ہونا چاہیے اور جب تک ان مدارس میں علمائ ان چیزوں کو داخل نہیں کرتے اس وقت تک یونیورسٹی گرانٹ کمیشن اسلامی مدارس کی سندات کو داخلہ یا ملازمت کے وقت میٹرک پاس کے ساتھ مشروط کر دے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ان فضلاء میں سے جو لوگ ملازمت میں جائیں گے وہ کافی حد تک جدید تقاضوں سے واقف ہوں گے اور اسلامی مدارس پر بھی اخلاقی دباؤ ہوگا کہ وہ ان ضروری مضامین کو شاملِ نصاب کریں۔

مروّجہ نصابی کتب

اسلامی مدارس میں مروّجہ نصابی کتب ایک طویل عرصہ قبل کی لکھی گئی ہیں۔ گرامر کے میدان میں بعض قواعد ایسے ہیں جن کو پڑھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مثالیں بھی بہت ہی پرانی ہیں مثلاً زید، عمرو بکر پھر مثال کے بعد تمرینات بھی نہیں ہوتیں۔ اسلامی مدارس کے معیار کے مطابق توقع یہ کی جاتی تھی کہ اساتذہ خود مشقیں کرائیں گے۔ بعض مقامات پر درسوں میں یہ عمل ہوتا تھا جسے اجراء کہا جاتا تھا اب اگر کتابوں کو یکسر بدل دیا جائے، تو ایک مشکل ایسی پیش آتی ہے جس کا کوئی حل نہیں ہے وہ یہ کہ جدید کتاب اساتذہ کے لئے مانوس نہ ہوگی اور خود اساتذہ نئی کتاب کو سمجھنے میں دقت محسوس کریں گے۔ اس لیے مناسب یہ ہوگا کہ موجودہ کتابوں کو اسی مواد کے ساتھ اور اسی نام کے ساتھ پڑھایا جائے مگر انہیں سہل بنا دیا جائے۔ مثلاً گرائمر کی مروّجہ کتاب کافیہ جو نہایت ہی مختصر عبارت میں ہے اور اس کے متبادل کتاب الفیہ ابن مالک ہے

جو اشعار میں ہے، اور اس کی شرح ابن عقیل ہے جو ساتھ ساتھ پڑھائی جاتی ہے مناسب ہے کہ ماہرین علماء کا ایک بورڈ ان تینوں کتابوں کو سہل بنا کر گرائمر کی ایک معیاری کتاب بنا دے اور ہر قاعدہ پر فٹ نوٹ کی جگہ کچھ تمرینات دیدے۔ کوشش یہ کی جائے کہ قاعدے کے بیان کے وقت حتی الوسع وہی عبارت استعمال کی جائے جو کافیہ اور ابن عقیل میں موجود ہے اگر مغلق ہے تو بین السطور کے الفاظ کو عبارت میں اضافہ کر دیا جائے تاکہ اساتذہ کے لئے نامانوس نہ رہے۔ یعنی بین السطور کو متن بنا دیا جائے۔

اس ترتیب جدید میں ایسے قواعد سرے سے حذف کر دیئے جائیں جن کی ضرورت نہیں ہے اور متن اور شرح کا نظام بالکل ختم کر دیا جائے۔ اسی طرح تلخیص، مختصر المعانی اور مطوّل کو از سرِ نو تین کتابوں کی ضرورت میں مرتب کر دیا جائے۔ پہلی کتاب میں علمِ بلاغت کے ابتدائی اصول، دوسری میں مفصل اصول یعنی مختصر المعانی کے معیار کے، اور تیسری کتاب میں فصاحت، بلاغت کے اعلیٰ اصول بیان کئے جائیں۔ یہ کام بھی موجودہ وفاقہائے مدارس کے ماہرین کے بورڈ سے لیا جائے اور جب یہ بورڈ کوئی کتاب تیار کرے تو حکومت اس کتاب کو چھاپ کر مفت مہیا کرے اور جو کتاب بھی نئی رائج کی جائے، چاروں صوبوں میں اس کے پڑھانے کے لئے ریفریشر کورسز کرائے جائیں تاکہ طلباء اور اساتذہ مشکلات سے دوچار نہ ہوں۔

اسلامی مدارس اور فرقہ واریت

مسلمانوں میں فرقہ وارانہ اختلاف ابتداً مذہبی تعصب اور جہالت کی وجہ سے تھے۔ دورِ جدید میں تعلیم کے پھیلاؤ اور عوام کے اجتماعی شعور کی وجہ سے یہ فرقہ وارانہ اختلافات کافی حد تک کم ہو گئے ہیں کئی جماعتیں ایسی ہیں جو ایسے اختلافات کو پسند نہیں کرتیں۔ ہمارا پریس بھی انہیں پسند نہیں کرتا اور فرقہ وارانہ اختلافات کے خلاف ایک فضا پائی جاتی ہے۔

لیکن گذشتہ ۲ عشروں سے ان اختلافات نے سیاسی پارٹیوں کی شکل میں

نمودار ہونا شروع کر دیا ہے اور ۔۔۔ انہی کی اساس پر اسلامی مدارس کے بورڈ اور وفاق وجود میں آئے ہوئے ہیں اور ان لوگوں نے والطۃ المدارس کو تسلیم کرنے سے محض اس لئے انکار کیا کہ رابطۃ المدارس کسی فرقے کی نمائندگی نہیں کرتا۔ لیکن فرقہ وارانہ مسائل کی بنیاد جن باتوں پر ہے ان کا تعلق عقائد سے ہے اور عقائد میں سے بھی فروعی عقائد سے درسِ نظامی کے نصاب میں فرقہ وارانہ مسائل کی کوئی کتاب بھی شامل نہیں ہے۔ دیوبندی طلباء بریلوی مدارس میں اسی طرح بریلوی طلباء اہلحدیث کے مدارس میں پڑھتے ہیں اور اس سلسلے میں کبھی کوئی دقت محسوس نہیں کی گئی۔ لہذا اسلامی مدارس کے نظام کا فرقہ وارانہ مسائل سے کوئی تعلق نہیں۔ بعض نصابی کتب ایسی ہیں جو شیعہ مصنفین کی تصنیف ہیں اور صدیوں سے رائج ہیں۔ فرقہ وارانہ اختلافات کو کم کرنا یا زیادہ کرنا زائد از نصاب Extra سرگرمیوں کے زمرے میں آتا ہے اور جوں جوں علماء جدید علوم سے واقف ہوں گے یہ شدت ختم ہوتی جائے گی۔

حکومت اور دینی مدارس

موجودہ دور میں حکومت اور اس کے افسران جس چیز کو بھی اپنے ہاتھ میں لیتے ہیں اسے خراب کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر جو چیز بھی حکومت نے قومی ملکیت میں لی اس کی کارکردگی متأثر ہوئی۔ مثلاً بنک اور قومی مدارس وغیرہ۔ اگر اسلامی مدارس میں بھی حکومت کا عمل دخل زیادہ ہوا تو ان کا موجودہ ڈھانچہ ختم ہو جائے گا اور نیا ڈھانچہ قائم نہیں ہو سکے گا۔

پھر موجودہ مدارس بدلتی حکومت کی اسلام دشمن پالیسی کے خلاف منظم ہوئے تھے اور ان میں ایسی روایات قائم ہو چکی ہیں کہ وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے بھی حکومت کے عمل دخل کو پسند نہ کریں گے۔ اس لیے مالیات، نظم و نسق اور نصابی نظام کے بارے میں وہی پابندیاں مناسب ہوں گی جو یہ مدارس از خود قبول کریں گے۔

دو نظامہائے تعلیم

میں

ایک مکمل اسلامی انقلاب کے بعد تو یہ ممکن ہے کہ ملک کے اندر اسلامی نظریہ حیات کی اساس پر ایک مکمل نظامِ تعلیم رائج کر دیا جائے لیکن جب تک اسلامی انقلاب برپا نہیں ہوتا اس وقت تک عبوری طور پر ان دونوں نظاموں کو باہم مربوط کیا جا سکتا ہے۔ یعنی درسِ نظامی کے فارغ التحصیل طلباء ایم اے اسلامیات کے برابر تصور کیے جائیں (بشرطیکہ میٹرک پاس ہوں) اور انہیں بی ایڈ وغیرہ میں داخلہ دیا جائے یا ایل ایل بی شریعت یا الدعوۃ فیکلٹی میں داخلہ دیا جائے اور اس سلسلے میں داخلے کے لیے باقاعدہ ٹسٹ ہو، اس موضوع کی تفصیلات میرے ایک دوسرے مقالے[1] "نظامِ تعلیم میں جماعتوں کی ازسرِ نو درجہ بندی" میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

---

[1] ملاحظہ ہو "مجلہ تعلیم" اسلامی تناظر میں" شمارہ نمبر ۴ (بابت جولائی۔ دسمبر ۱۹۸۶ء) شائع کردہ انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز۔ اسلام آباد۔

مباحث: اجلاس دوم

مولانا عبدالمالک

اگر آپ دینی مدارس سے مطلوبہ تقاضے پوری نہ ہوتے کی بات کرتے ہیں تو جدید تعلیمی ادارے بھی تو مطلوبہ ضروریات پورا کرنے سے قاصر ہیں باوجودیہ کہ ان جدید اداروں کو مادی وسائل وافر مقدار میں میسر ہیں اور قومی سطح پر ہر قسم کی سرپرستی بھی دستیاب ہے، مگر وہ ناکام ہیں اس کے برعکس دینی ادارے ہر قسم کے سوتیلانہ سلوک کا شکار ہیں اور پوری قوم اس صورت حال پر خاموش ہے اس تشکل میں آپ دینی مدارس سے کیونکر بہت سی توقعات باندھ سکتے ہیں، پہلے سوچ کے قومی اور ریاستی دھارے کو تو تبدیل کیجئے۔

مسلم سجاد

میرا مطلب یہ تھا کہ دینی ادارے اسلامی معاشرے کی تشکیل کے مکمل ادارے ہوں جو ہماری اجتماعی زندگی کی جملہ ضروریات کو پورا کر سکیں۔ میں نے کوئی جدید تعلیمی اداروں کا دفاع نہیں کیا۔

مولانا محمد ناظم ندوی

یہ ادارے اسلامی معاشرے کی کچھ نہ کچھ ضروریات کو تو پورا کر ہی رہے ہیں لیکن جدید تعلیم میں بدقسمتی سے قوم اپنے منتخب یا مقتدر افراد کے ذریعے یہ تسلیم کرانے یا نافذ کرنے کے لئے اب تک تیار نہیں ہو سکی کہ ایک ڈاکٹر یا انجینئر کو دینی فرد بھی ہونا چاہیئے۔

مسلم سجاد

دراصل اسلامی معاشرے کو اپنا اجتماعی نظام چلانے کے لئے انہی اداروں سے مناسب افراد

ملنے چاہئیں۔ یہ ضرورت اس وقت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے جب سیکولر تعلیمی نظام، اسلامی معاشرے کے مطلوبہ اور جائز حق کو تسلیم کرنے یا اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کی راہ میں مسلسل رکاوٹ بن بن گیا ہو، آج جبکہ ہماری سیکولر سیاست، انتظامیہ اور تعلیم دین سے مسلسل بغاوت کرنے والی پود تیار کر رہی ہے تو لامحالہ ایک مجبور مسلمان کی نگاہ دینی اداروں کی طرف اٹھتی ہے کہ وہ اس کی دست گیری کریں۔

مولانا محمد ناظم ندوی

اس وقت معاشرے کا پورا نظام یونیورسٹیوں کے فارغ طلبہ چلا رہے ہیں .... دینی مدارس سے فارغ لوگ تو نہیں چلا رہے۔ یہ بھی طے شدہ امر ہے کہ ابلاغ عامہ کے اداروں کے طفیل ملک میں علماء کی قابل لحاظ قدر و منزلت نہیں ہے۔ دوسری طرف لوگ کہتے ہیں کہ علماء کو جدید تقاضوں اور عصری ضروریات کا علم نہیں، اور وہ مسائل جدیدہ سے نابلد ہیں میرے نزدیک اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ہمیں اپنے دینی نظام تعلیم میں لازماً تبدیلی لانی چاہئیے کیونکہ یہ سچ ہے کہ ہمارے دینی مدارس کے طلبہ معاشرے اور عصر حاضر کی بنیادی معلومات سے بھی بے خبر ہیں اس ضمن میں دینی مدارس کا معیار بلند کیا جائے، علماء یقیناً اسلامی معاشرے کی ضرورت ہیں، اگر بلند معیار کے علماء پیدا نہیں ہو سکیں گے تو اسلامی معاشرے کا خواب پورا نہیں ہو سکے گا۔

مولانا عبدالقیوم ہزاروی

معاشرہ حکومت کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ ۲۰۰ سال پہلے یہاں اسلامی معاشرہ اس لئے قائم تھا کہ اس وقت حکومت اسلامی تھی۔ آپ علماء پر ذمہ داری ڈال کر دیکھیئے کہ وہ کس طرح اس چیلنج کا مقابلہ کرتے ہیں۔ یہ میرا چیلنج ہے کہ درس نظامی کے فاضل فرد پر ذمہ داری ڈالی جائے تو وہ اسے پورا کرے گا۔ میں دیکھتا ہوں کہ ایک طالب علم گیس پیپرز اور خلاصے پڑھ کر جعلی طور پر میٹرک پاس کر لیتا ہے حکومت اس کو اپنے دفاتر میں جگہ دیتی ہے ..... جبکہ ایک عالم دین

تیس علوم پڑھ کر بھی کسی دفتر میں کوئی ملازمت نہیں پا سکتا۔ معاشرہ خود درس نظامی کے فارغ فرد کو اہمیت دینے سے پہلو بچاتا ہے۔ یہ سوچ دراصل فرنگی سوچ ہے جو آج تک ہمارے ہاں راسخ ہے"

مفتی سیاح الدین کاکاخیل

دینی علوم کے طلبہ کو چند لمحوں کے لئے نظرانداز کر دیجئے اور دیکھیئے کہ مقتدرہ انگریزی نظام تعلیم حاصل کرنے والے افراد کے پاس بھی ابتدائی اور بنیادی معلومات نہیں ہوتیں۔

خالد رحمٰن

اس بحث کا یہ مقصود ہے کہ دینی نظام تعلیم کی جو موجودہ کیفیت ہے اسے بہتر کیسے بنایا جائے۔

حافظ نذر احمد

دینی تعلیم کے حاملین کے لئے لازم ہے کہ وہ زندگی کے تمام مسائل میں رہنمائی دے سکیں یہی لوگ اسلام کا اقتصادی نظام مدوّن کریں۔ اور ایسے علماء تیار ہوں جو سیکولر لوگوں کی جگہ لے سکیں۔ یہ ہم عام مسلمانوں کی دردمندانہ اپیل سمجھ لیجئے یا مدتوں کی خواہش ۔۔۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ افغانستان میں کیمونزم کا سیلاب آیا ہوا ہے اور اشتراکی لٹریچر پھیلایا جا رہا ہے۔ گلگت و بلتستان میں آغاخانیوں نے زور پکڑا ہے، بلوچستان میں ذکریوں کا اثر و نفوذ ہے، مسیحیت کا جو سیلاب بلا آیا ہے اس کا تدارک و سدباب کون کرے گا؟ کیا پاکستان کے علماء کی بنیادی تعلیم و تربیت ایسی ہے کہ وہ ان فتنوں کا تدارک اور مقابلہ حکمت تبلیغ اور دلائل و براہین سے کر سکیں۔ اور دین کی پیاسی نسل تک اسلام کے آب حیات کو پیش کر سکیں، مجھے معاف رکھئے۔ میں جب اس پہلو پر سوچتا ہوں تو مجھے مایوسی ہوتی ہے۔

مسلم سجاد

ان جدید فتنوں کے علمی بنیادوں پر ابطال کے لئے تخصص کے ادارے ہونے چاہئیں۔

حافظ نذر احمد

میرا مشاہدہ ہے کہ شیخوپورہ جیل میں چھ یا سات عیسائی قیدی ہیں جنہیں ہفتہ وار پادری ملنے آتے

ہیں اور ان کو پھل فروٹ دیتے ہیں جبکہ وہاں کا کوئی عالم دین جیل جا کر مسلمان قیدیوں سے کم از کم ملاقات کی بھی زحمت گوارا نہیں کرتا۔ خدارا آپ کچھ نہ کچھ کیجئے، ورنہ یہی پادری مجبور قیدیوں میں مسیحیت کا زہر تو پھیلا ہی رہے ہیں۔ صرف مسجد کو آباد کر دینے سے تو ذمہ داری ادا نہیں ہوتی۔ اس لئے جن جن دائروں میں علماء کی ضرورت ہے اس کے لئے تیاری کیجئے، شرعی عدالت کے لئے ججوں کی ضرورت تھی وہ کہاں سے اور کس قدر لائے گئے۔ خدا کرے اگر یہاں مکمل اسلامی معاشرہ قائم ہو گا تو پھر ان ججوں کی جگہ لینے والے کون ہوں گے' ذرا اس حوالے سے نظام تعلیم کو ترتیب دیجئے۔ میں جانتا ہوں کہ علماء کی قربانیاں کسی سے کم نہیں ہیں انہوں نے پُر صعوبت حالات میں دین کا علم حاصل کیا ہے ...... لیکن جو کتابیں اور نصاب وہاں پڑھ رہے ہیں اب صرف ان سے کام نہیں چلے گا۔

مفتی عبدالقیوم ہزاری

جن امور کی جانب حافظ صاحب نے متوجہ کیا ہے ان کی ذمہ داری کس پر ہے ؛ علما کس طرح عیسائی مبلغوں کے مانند جیل میں جا کر فروٹ تقسیم کریں ان بے چاروں کے پاس تو مدرسہ و مسجد چلانے کے لئے بھی اتنے وسائل نہیں ہیں جبکہ عیسائی مشنریوں کی پشت پر امریکہ و یورپ کے فنڈز اور نوکر شاہی کا تعاون بھی شامل ہے۔ میں پھر کہتا ہوں کہ جو اچھا اور صحیح معنوں میں عالم دین ہے وہ اچھا جج، اچھا مصنف، محقق اور مبلغ بھی ہے اور اس کے اثرات ماحول پر ہوتے ہیں اور رہیں۔

مفتی سیاح الدین کاکاخیل

- دینی مدارس کے فاضل افراد کی راہ میں صرف ایک رکاوٹ انگریزی زبان کی ہے۔

فرید احمد پراچہ

جہاں تک علما کے کردار کا تعلق ہے وہ محض خطیب اور امام ہونے کی حد تک ہی نہیں ہے بلکہ ان کا کردار مبلغ اور داعی کا بھی ہونا چاہیئے۔ یہ ضروری نہیں کہ علماء کو سب علوم پر دسترس ہو مگر

دیگر علوم کے مبادیات کا علم تو ان کو بہر حال ہونا چاہیئے۔ اس بات کی گواہی خود درس نظامی میں موجود ہے اس میں یونانی حکمت و فلسفہ موجود ہے چونکہ یہ اس زمانے کے تقاضے اور چیلنج تھے اس لئے ان علوم کو علماء نے بڑی محنت سے حاصل کیا مفتی ہزاروی صاحب نے فرمایا ہے کہ علوم دینی ۲۲ ہیں۔ اگر ضرورت ہو تو ان میں کمی بیشی کی جائے مگر عصری علوم کو جگہ دی جائے۔

معروف شاہ شیرازی

مقالات اور گفتگو سے یہی سامنے آیا ہے کہ لوگ تغیر یا تبدیلی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں' ایک تو وہ تبدیلی ہوگی جب نظام حکومت صالح افراد کے ہاتھوں میں ہوگا، ہمیں تو فکر آج کی ہونی چاہیئے کہ ان حالات میں ہم کیا اقدامات کریں جس کے نتیجے میں اپنا دینی نظام تعلیم بہتر کردار انجام دے سکے۔ ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ اسلامی مدارس کو دو سو سال سے عملی زندگی سے جو علیحدہ رکھا گیا ہے' آیا یہ زندگی کے دھارے سے خود علیحدہ ہوئے یا انہیں جبری طور پر الگ کیا گیا ہے۔ انگریز کے پروردہ لوگ آج بھی ماضی کی طرح دینی اداروں کے لوگوں کو زندگی کے دھارے میں شامل نہیں ہونے دیتے۔

فرید احمد پراچہ

کوئی ایسا نظام وضع کیا جائے جس سے ان دینی اداروں کے افراد کو زندگی کے طاقت ور دھارے میں دوبارہ داخل کیا جا سکے۔ مثلاً تربیت اساتذہ کے اداروں میں ان کو تربیت بھی دلوائی جا سکتی ہے۔ اس طرح ان دینی دفاقوں پر مشتمل ایک مرکزی وفاق ہو جس کے تحت ایک مرکزی امتحان ہو۔ اس طرح ان طلبہ کا معیار بلند ہوگا۔

معروف شاہ شیرازی

اگر دینی مدارس کے نظام میں ایک دم بڑی اور انقلابی تبدیلی لائیں گے تو نمازوں کی امامت قرآن کی تجوید اور مُردوں کو غسل دینے والے بھی شاید نہ مل سکیں گے۔ اس کے لئے تدریج کی ضرورت ہے۔

مولانا عبد المالک

جب تک علما کی مانگ معاشرے کے طاقت ور اداروں میں نہ ہو گی دینی مدارس کے طلبہ کی کوئی حیثیت نہیں بن سکے گی ـــــ علما کو اپنے نظامِ تعلیم کے ذریعے ان اداروں کی ضرورت بن جانا چاہیئے۔

مفتی عبد القیوم ہزاروی

حکومت نے نظامِ "قضا" کے لئے افراد طلب کئے ہیں۔ ہم نے پیش کئے لیکن حکومت نے انہیں نظر انداز بلکہ معطل کر کے رکھ دیا۔

پروفیسر خورشید احمد

ہمیں چاہیئے کہ اس چیلنج کو قبول کریں کہ یہ محض حکومت کی حد تک نہیں بلکہ معاشرہ خود اپنے آپ کو علما پر اعتماد کے لئے تیار پائے۔

حافظ نذر احمد

حکومت کا نظام کار چونکہ استعماری نو آبادیاتی سوچ کے تابع ہے اس لئے وہ یقیناً علماء کو قبول نہیں کرے گی اور نہ انہیں آگے بڑھنے دے گی راستہ تو خود علماء کو نکالنا ہے۔

سلیم منصور خالد

دینی مدارس کے کردار کے تعین میں یہ امر واضح طور پر طے کر لینا چاہیئے کہ وہ اسلامی نظام کے قیام کی جدو جہد میں عوام الناس کو ابھاریں اور منظم کریں اس کے ساتھ ہی ساتھ اسلامی نظریہ حیات کے مخالفین، معاندین، مستشرقین، مستغربین، اور متجد دین کی ریشہ دوانیوں کے علمی اور عملی سطح پر توڑ کے لئے منظم، مربوط اور مثبت جدو جہد کریں۔ نیز عصری تقاضوں سے عہدہ برا ہونے کے لئے معاشرت وسیاست کے میدان کار میں رہنما کردار ادا کریں۔ علاوہ ازیں تقابل ادیان، معاصر تحریکات باطلہ کی حکمت عملی کے مطالعے اور فکری فتنوں کے تجزیہ وتردید کے لئے موثر اقدام کریں۔

مفتی سیاح الدین کاکاخیل

علماء کے کردار کے حوالے سے مدارس میں جو خامیاں ہیں انہیں دور کرنا چاہیئے۔ ہر مدرسے کو ایک جامع ادارہ نہیں قرار دیا جاسکتا اس لئے کام کی تقسیم ہونی چاہیئے۔ مدارس کا اپنا حال بہت پتلا ہے، معیار گرتا جارہا ہے، پرانی کتابوں پر اس لئے بھی زیادہ تنقید ہوتی ہے کہ نئی نسل میں اسے پڑھانے کی صلاحیت مفقود ہورہی ہے محنت کرنے والے اساتذہ اور جی لگاکر پڑھنے والے طلبہ سے مدرسے خالی ہوتے جارہے ہیں باقی اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمیں مستقبل کے ہر چیلنج کا سامنا کرنے کے لئے اپنے مدارس سے افراد کا تیار کرنے ہوں گے لیکن مسائل اور وسائل دونوں غیر تسلی بخش ہیں۔

خالد رحمن

علماء کو بلاشبہ حکومت اور انتظامیہ کوئی مثبت اہمیت یا حیثیت نہیں دیتی اور ان کے معیار کو قبول نہیں کرتی لیکن یہ بھی درست ہے کہ معاشرے کے عام افراد میں بھی تو صورتحال مختلف نہیں ہے اس کا علاج سوچنا چاہیئے کہیں اسلامی روایات اور علم دین کا یہ بنیادی ادارہ بالکل ہی بے اثر نہ ہوجائے جس کے رفتہ رفتہ خدشات اور خطرات تو سامنے آرہے ہیں۔

مولانا یاسین ظفر

دینی مدارس کے وفاق کا نظام منظم کیا جائے جو سند کو جاری کرے اور سندات کے سرقے کو ختم کرے کہ اس روش سے بھی دینی مدارس کی وقعت کو ٹھیس پہنچ رہی ہے۔

مولانا عبدالخالق

ایک فاضل آدمی کے لئے معیار تعلیم کا تعین کیا جائے۔ سندات کی تقسیم اور ان کا معیار بنایا جائے۔ تمام وفاقوں پر مشتمل ایک مرکزی وفاق بنایا جائے اور ایک کمیٹی بنائی جائے جس میں تمام وفاقوں سے دو افراد، حکومت سے تین افراد، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن سے

بھی افراد لئے جائیں اور یہ بورڈ ہی امتحانات، سندات وغیرہ کی نگرانی کرے۔ اسی طرح درس نظامی کو ایم اے اسلامیات کے مساوی سند قرار دینے کے بجائے اسے ایم اے ہی کی سند قرار دینا چاہیئے۔

مفتی عبدالقیوم ہزاروی

حکومت اور عوام میں اگر علماء کے خلاف کوئی چیز پائی جاتی ہے تو یہ باقاعدہ بمنصوبہ بہدف سے عام کی گئی ہے لیکن اگر مدارس کا قریب سے جائزہ لیا جائے تو ان کی یہ صورت نہیں۔ علماء نے عام افراد کی نسبت بہت زیادہ کام کیا ہے۔ سپریم کورٹ اور باقی عدالتی امور میں خود علما ہی فیصلے لکھا کرتے ہیں، اس ضمن میں ملک غلام علی صاحب کے مشاہدات آپ کے سامنے ہوں گے۔

پروفیسر خورشید احمد

بحث کا نچوڑ کچھ یوں بنتا ہے کہ ہمارا فوری ہدف قدیم اور جدید نظام ہائے تعلیم کو باہم ملانا نہیں ہے، اور نہ دینی مدارس حکومت کی سرپرستی میں کام کر سکتے ہیں۔ جہاں تک خرابیوں کا تعلق ہے تو وہ جدید نظام بھی موجود ہیں اسی طرح قدیم نظام تعلیم بھی کمزوریوں سے مبرا نہیں ہے دینی مدارس کو علم دین میں مہارت پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ دوسرے معاشرتی اور عمرانی علوم جو دینی علم کے معاون تھے ان پر غور کرنا چاہیئے اور حالات کے مطابق نصاب میں تبدیلی کی جانی چاہیئے۔ مدارس کے تعلیمی معیار کو بہتر بنایا جائے اور اداروں کی درجہ بندی کی جائے۔ اور ان کے معیار کو جانچنے کا طریقہ وضع کیا جائے اسی طرح علوم اسلامیہ کے ان اداروں کو چند دائرے متعین کر کے طلبہ کی تربیت کے لیے منصوبہ بندی کی جائے، حکومت اور معاشرے کے اعصابی اداروں میں شمولیت کے لئے ضروری ہے کہ اپنے علمی اور عملی معیار کے ذریعے انہیں متاثر کیا جائے۔ زبان کے بارے میں ادب سے کہتا ہوں کہ ہمیں اپنا رویّہ بدلنا ہو گا۔ انگریزی زبان کو سیکھا جائے تاکہ

عصری چیلنج اور استعماری ذہنیت کا مقابلہ کیا جا سکے۔ صحافت اور ابلاغ عامہ (Mass - Comunication) کے دوسرے ذرائع کی طرف توجہ دی جائے۔ خود دینی مدارس میں تخصص کے نظام کو رائج کیا جائے۔ محض وسائل کی کمی کے باعث ہمت نہیں ہارنی چاہئیے۔ سردست ہمارے دائرہ میں تعلیم، صحافت اور قانون کے ادارے ہونے چاہئیں اگلے مرحلے میں انتظامیات کو بھی شامل کیا جائے۔

معروف شاہ شیرازی

صحافت اور تحقیق و تالیف کی طرف خاص توجہ دی جائے۔

مولانا محمد ناظم ندوی

موجودہ دور میں اپنی حیثیت منوانے کے لئے انگریزی زبان کو مفتاح کی حیثیت حاصل ہے اس پر ضرور توجہ دی جائے۔

مفتی سیاح الدین کاکاخیل

انگریزی کی اہمیت سے انکار نہیں ہے لیکن اسے نصاب میں شامل کرنے سے نقصان ہوگا کہ ہمارا طالب علم بیک وقت اتنے بوجھ برداشت نہیں کر سکتا لیکن ہمیں مرحلے کا تعین کر لینا چاہیئے کہ فراغت کے بعد انگریزی کی تعلیم دی جائے گی۔

رپورٹ: حبیب الرحمٰن عاصم، عبدالجبار بیگ

مجلّہ تعلیم ۔ ۴

اسلامی تناظر میں

یکساں نظام تعلیم پر سیمینار کی مکمل روداد

- ...... دینی اور لادینی نظام تعلیم
- ...... دو متوازی نظام تعلیم
- ...... دینی اور لادینی نظام تعلیم کا انضمام
- ...... نظام تعلیم میں دو رنگی کے اثرات
- ...... خواص اور عوام کے تعلیمی ادارے
- ...... ذریعہ تعلیم میں تفریق کا مسئلہ
- ...... مقابلے کا امتحان اور زبان کا مسئلہ
- ...... مروجہ معیار تحقیق
- ...... مثالی نظام تعلیم کے خدوخال
- ...... چیست یاران طریقت
- ...... یکساں نظام تعلیم اہمیت و ضرورت
- ...... خلاصہ بحث
- ...... اعلامیہ سیمینار
- ...... سفارشات

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد

صدارتی کلمات

مفتی سید سیاح الدین کاکاخیل رح

مسلمان کی حیثیت سے ہمارا فرض منصبی اسلامی معاشرے کی تشکیل کے لیے کوشش کرنا ہے لیکن اس فریضہ کی پوری ذمہ داری صرف علما پر نہیں ڈالی جاسکتی۔ سمجھنا چاہیے کہ اس ذیل میں برابر کی ذمہ داری معاشرے اور حکومت پر بھی ہے۔

اس پورے معاملہ میں بلاشبہ بنیادی ذمہ داری علماء اور دینی مدارس کے طلبہ پر آتی ہے اس ذمہ داری کو مدنظر رکھتے ہوئے دینی مدارس کے طلبہ جو بہت بڑی اور اہم قوت ہیں مگر منتشر ہیں ان میں اس ذمہ داری کا احساس پیدا کیا جائے اور اس بات کی تربیت دی جائے کہ وہ معاشرے میں تفہیم شریعت اور نفاذ شریعت کے جدوجہد کریں حکومت اور انتظامیہ پر دباؤ ڈالیں اور رائے عامہ کو مثبت انداز میں بیدار رکھیں۔

دینی مدارس کے طلبہ میں اس ذہن کی تیاری کی جائے کہ وہ علم کے ساتھ ساتھ معاشرے کو بیدار رکھنے کا عمل بھی تیز کریں۔ تبلیغ واصلاح معاشرہ کے لیے دوران تعلیم بھی اور عملی زندگی میں بھی کوشاں رہیں، ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہ بیٹھے رہیں۔ دین حق کی تعلیم کو محض تحفظِ معاش کے لیے نہ اختیار کریں، بلکہ اصل مقصد قرآن وسنت کی عمل داری ہو۔

میرا ذاتی احساس ہے کہ دینی مدارس کے طلبہ کو اس پہلو سے تیار نہیں کیا جاتا، یا پھر یہ پہلو بڑا ہی تشنہ رہتا ہے۔

آباد شاہ پوری

تحقیق کا معلومات افزاء مرقع

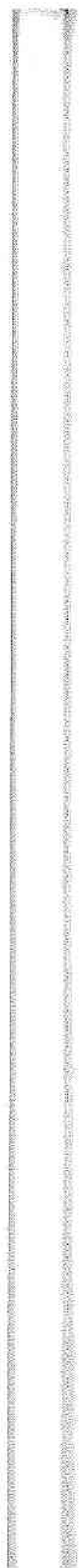
.... مسلم امت

سوویت روس میں

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد


٣





دینی تعلیمی ادارے: افادیت اور مسائل

مولانا سید عبدالخالق گیلانی

مملکت خداداد پاکستان کے شہریوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے ملک کے طول و عرض میں دو طرح کے ادارے سرگرم عمل ہیں۔ حکومت کے مقرر یا منظور کردہ نصاب، طریق کار، قوانین اور نگرانی کے تحت کام کرنے والے ادارے جنہیں حکومتی سرپرستی، قبولیت اور اعانت میسر ہے۔ جدید یا عام تعلیمی ادارے کہلاتے ہیں، یکساں نصاب تعلیم اور اسناد کی مساوی قدروقیمت کی بنا پر یہ نظام تعلیم انتہائی منظم اور تقریباً ہر شعبہ زندگی کے لیے افراد مہیا کرنے کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔

دوسری طرف بعض صاحب عزم علماء کی انفرادی یا چند اہل خیر حضرات کی اجتماعی کوششوں سے وجود میں آنے اور جاری رہنے والے ادارے ہیں۔ جن کے قیام کا مقصد ہی مسلمانوں میں دینی تعلیم کی اشاعت اور آئندہ کے لیے حاملین دین کی تربیت و پرداخت ہے۔ ان اداروں کو نہ تو حکومت کوئی سرپرستی، تعاون یا قبولیت بخشتی ہے۔ نہ ان اداروں کے کارپردازان ہی خود کو کسی حکومتی قانون یا نگرانی کا پابند بنانا پسند کرتے ہیں بلکہ آپس میں بھی ان اداروں میں ایک دوسرے سے وابستگی اور ماتحتی کا کوئی تصور موجود نہیں کہ انہیں کسی منظم تعلیمی کل کا جزو سمجھا جائے اور ان کی جاری کردہ اسناد کے مسلمہ مراتب اور معیار مقرر ہوں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دین کے محدود تصور کے مطابق تعلیم حاصل کر کے جب یہ حضرات معاشرتی زندگی کا خود مختار

جز و بنتے ہیں تو عربی زبان کی تدریس یا دین کی تبلیغ سے متعلق چند مناصب کے سوا زندگی کے کسی شعبے میں ان کی مانگ نہیں ہوتی۔

موجودہ صورتِ حال

پاکستان جیسی نظریاتی مملکت میں جس کی اساس ہی دین ہے۔ حاملین دین کی یہ کس مپرسی اور ملک کے نظام کے لامحدود شعبوں سے ان کی معزولی کسی طرح بھی نہ ملک کے مستقبل کے لیے نیک شگون ہے۔ نہ نفاذ اسلام کے مقصد سے ہم آہنگ۔ اس لیے خود علماء اور حکومت دونوں کو چاہیے کہ اس بُعد کو کم کرنے کی تدبیر کریں اور علماء کی افادیت میں اضافہ کے ذرائع اختیار کریں۔

دینی مدارس کے فارغ التحصیل حضرات اخلاقی لحاظ سے ہمارے معاشرے کا بہترین طبقہ ہیں جس ماحول میں ان کی تربیت اور تعلیم ہوتی ہے اور اس کے دوران جن اخلاقی پابندیوں کا انہیں عادی بنایا جاتا ہے اور امر ونواہی کی تعمیل، خیر وشر میں تمیز، حلال وحرام میں امتیاز، اور حرص وطمع کے بجائے قناعت اور خوف خدا جیسی خوبیوں کی جس طرح انہیں تربیت دی جاتی ہے اس کا اثر ان کے اخلاق وکردار میں پوری طرح موجود ہوتا ہے اور جب وہ اس سلبچے میں ڈھل کر میدان عمل میں آتے ہیں تو ان کا کردار یقیناً قابل اعتماد اور ملک وقوم کے لیے بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔ علماء دیانتداری پابندیٔ وقت، محنت، لگن اور جذبۂ حب الوطنی میں دوسروں پر بہت فوقیت رکھتے ہیں۔ آج ہمارے معاشرے میں رشوت، محکمانہ بددیانتی کام چوری اور دوسرے اخلاقی اور قومی جرائم کی کثرت ہے۔ اگر ان تمام شعبوں میں دوسرے تعلیم یافتہ لوگوں کی طرح دینی مدارس کے تعلیم یافتہ لوگوں سے خدمات لی جائیں تو ان خرابیوں پر بڑی حد تک قابو پایا جا سکتا ہے کیونکہ سکول کالج کے تعلیم یافتہ حضرات کے اذہان میں ان جرائم کی ہیبت ناکی کا وہ تصور اور ان سے پرہیز کا وہ داعیہ ہرگز نہیں ہوتا۔ جو دینی تعلیم کی وجہ سے

علماء میں بہت راسخ ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں جہاں شرح خواندگی پہلے ہی بہت کم ہے۔ خواندہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو اس طرح ملکی خدمات سے الگ کر دینا خود ملکی ترقی کے لیے مہلک ہے۔

زبان کا مسئلہ

پاکستان کی قومی زبان اردو ہے جس میں علماء کی دسترس عام تعلیم یافتہ لوگوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ اگر دفاتر کا کاروبار، عدالتی کارگزاری اور حکومتی خط و کتابت کا ذریعہ قومی زبان کو قرار دیا جائے تو حکومتی محکموں کے آفیسرز، کلرکس، انتظامیہ کے عہدیداروں، قانون اسلامی کے وکلاء اور عدلیہ کے مختلف مدارج کے لیے تعلیم یافتہ لوگوں کی ایک تیار کھیپ علماء کی صورت میں میسر آسکتی ہے۔ ہر محکمہ کے لیے خصوصی تربیت کا اہتمام جس طرح دوسرے تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے کرنا پڑتا ہے علماء کے لیے بھی کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح طب اسلامی جس کی نصابی کتب بھی انگریزی میں نہیں ہیں بلکہ مشرقی زبانوں میں ہیں۔ اس میں داخلہ کے لیے علماء کو اہل نہ سمجھنا اور میٹرک، ایف۔اے وغیرہ کی شرط عائد کرنا انتہائی زیادتی ہے۔ دینی مدارس کے فارغ التحصیل لوگوں کو اس شعبہ میں داخلہ اور تعلیم دلوانے سے ڈاکٹروں کی کمی پر قابو پایا اور ملک میں صحت کا مسئلہ حل کیا جا سکتا ہے نیز علماء کے لئے باعزت روزگار کا موقع مہیا کیا جا سکتا ہے۔

باہم افہام و تفہیم

اب تک کی تمام معروضات سے میرا مطلب یہ تھا کہ دینی مدارس کے فارغ التحصیل لوگوں کے لیے میدان عمل میں وسعت پیدا کی جا سکتی ہے اور ملک و ملت کے لئے ان کی خدمات اور اہلیت سے بہتر طور پر فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ موجودہ حکومت کے بعض اقدامات اور علماء کی طرف سے ان کی قبولیت اس رجحان کی نشاندہی بھی کرتے ہیں لیکن اصلاح احوال اور حاملین

دین کو اپنے معاشرے کا بہترین اور اہم ترین طبقہ بنانے کے لیے یہ یک طرفہ اور نیم دلانہ اقدامات ہرگز کافی نہیں ہیں۔ بلکہ علماء کی طرف سے بھی اس سلسلے میں اقدام اور حکومت کا تعاون اشد ضروری ہے۔ میں ابتداء ہی میں عرض کر چکا ہوں کہ اگرچہ دینی تعلیم کے ادارے ملک بھر کے طول و عرض میں قائم ہیں لیکن نہ ان کا کوئی نظام تعلیم ہے نہ آپس ہی میں ان کا کوئی ربط اور تعاون ہے، ہر ادارہ خود مختار ہے اور کسی خارجی نظم کا پابند نہیں۔ اس لیے ان کے فارغ التحصیل حضرات کیلیے یکساں معیار اہلیت کے مدارج متعین کرنا ممکن نہیں۔ جن کے مطابق ملکی خدمات کے مختلف مدارج کے لیے ان کو اہل سمجھا جائے اور دوسرے تعلیم یافتہ افراد کی طرح وہی خدمات ان کو تفویض کی جاسکیں۔ نصاب تعلیم اگرچہ قریب قریب یکساں ہے یعنی درس نظامی ہی کی جزوی یا کامل تدریس ہوتی ہے لیکن چھوٹے بڑے مدارس میں درجہ بندی کے فقدان، نگرانی اور عمومی امتحانی نظام کی عدم موجودگی اور مدارج تحصیل کی تسلیم شدہ شہادات کے نہ ہونے کی وجہ سے اہلیت کی تعیین ممکن نہیں ہوتی مختلف مکاتب فکر اور مسالک کے فروعی اختلافات بھی اتنی شدت اختیار کر چکے ہیں کہ کسی متفقہ نظام پر سب کو متحد کر لینا خاصا دشوار ہوگیا ہے لیکن ان سب دشواریوں کا حل تلاش کرنا اور اس حل کو عمل میں لانا بھی تو علماء ہی کی ذمہ داری ہے۔ مردے از غیب بروں آید وکارے بکند۔ تو اس مشکل کا حل نہیں ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ کہ اب ملک میں بہت سے ذمہ دار علمائے کرام اس ضرورت کا احساس کر چکے ہیں اور اپنے دلوں میں اصلاح احوال کی تڑپ رکھتے ہیں۔

تجربہ کار اور راسخ فی العلم علماء کرام کے اس باوقار اجتماع میں کسی موضوع کا تجزیہ کر کے نتائج اخذ کرنا اور پھر اپنی رائے اور تجاویز پیش کرنے کی جسارت کرنا اگرچہ سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ لیکن گاہ باشد کہ ―――――― بہ غلط بر ہدف زند تیرے۔ اور اسلام میں تو معیار رد و قبول بھی مَن قال کی بجائے ماقال ہے۔ لہذا میں بھی چند معروضات پیش کرنے کی جرات کرتا ہوں ع گر قبول افتد زہے عز و شرف۔

اب تک کے بیان سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ نظام سرے سے موجود نہیں اور اس کا قیام ضروری ہے۔ نصاب کی اصلاح اور باہمی اختلافات بھی کم بہت اہم ہے اور چونکہ قومی حکومت ملک کے ہر طبقہ کی فلاح کی ذمہ دار ہے لہٰذا اس کا اس معاملے میں مثبت حصہ لینا اس کا فرض ہے۔

نوٹ۔ بسلسلہ سیمینار میں جو نکات پیش کئے گئے ہیں۔ ان میں سے پہلے آٹھ نکات دراصل انہی چیزوں کے تجزیہ پر مبنی ہیں اور چونکہ ان نکات میں کچھ سوالات متعین کر دیے گئے ہیں۔ لہٰذا ان نکات کی ترتیب کے مطابق کچھ کہنا ہی زیادہ مفید اور واضح ہوگا۔

کردار میں وسعت کی ضرورت

جس طرح دنیا بھر میں تعلیم کے دو بڑے حصے ہیں۔ خواندگی یعنی پڑھنے لکھنے کے قابل ہونا اور فنی تعلیم یعنی کسی خاص شعبے میں تعلیم حاصل کرنا۔ اسی طرح ہمارے تعلیم یافتہ لوگ بھی دو ہی طرح کے ہوتے ہیں محض خواندہ لوگ جن کے لیے سب میدان کھلے ہیں اور وہ مزدوری سے لے کر سیاست کے ایوانوں تک ہر میدان کے شہ سوار ہو سکتے ہیں۔ دوسرے ٹیکنیکل لوگ جیسے ڈاکٹر، انجینئر، سائنس دان اور علمائے دین جن کی تعلیم و تربیت ایک خاص شعبہ کے لیے ہوتی ہے اور اگرچہ وہ انسان ہونے کی بنیاد پر بعض دفعہ دوسرے شعبوں میں بھی اپنی صلاحیتوں سے مقام پیدا کر لیتے ہیں خصوصاً سیاست میں، لیکن ان کا اصل میدان وہی ہوتا ہے جس کے لیے انہیں تیار کیا گیا ہوتا ہے۔ علماء کا موجودہ کردار ان کے مقام کے منافی نہیں ہے۔ البتہ اس کا میدان بہت محدود ہو کر رہ گیا ہے جس میں توسیع انتہائی ضروری ہے۔ یہ توسیع اس شرط کی پابندی کے ساتھ ہونی چاہیے کہ صرف وہ میدان منتخب کئے جائیں جن میں تبلیغ دین سے علماء کا رابطہ نہ کٹ جائے اور وہ مناسب روزگار کے ساتھ اپنا فریضۂ منصبی ادا کرتے رہیں۔ ورنہ خواندہ آدمی کی حیثیت سے تو پہلے بھی دنیا ان کے لیے تنگ نہیں ہے۔ وہ اپنی خصوصیت سے

بے نیاز ہو کر کچھ بھی بن سکتے ہیں لیکن اس سیمینار کا مقصد یقیناً ان لوگوں کے لیے مواقع روزگار کی توسیع پر غور کرنا نہیں بلکہ ان کی اپنی خصوصیت کے ساتھ دوسرے شعبہ ہائے حیات میں انہیں مؤثر بنانا اور ان کے میدان عمل کو وسیع کرنا ہے۔ میری نظر میں سول کا پورا دفتری نظام علماء کے موزوں ہو سکتا ہے اور علماء ہر عہدہ پر کام کرنے کے اہل ہیں۔ قانون اسلامی کے عالم ہونے کی وجہ سے عدلیہ کے تمام عہدوں اور وکالت کے لیے موزوں ہیں۔ طب اسلامی سے وابستہ ہو سکتے ہیں اور محکمہ تعلیم کے تدریسی اور انتظامی سب شعبوں میں بہترین کام کر سکتے ہیں۔

قواعد و ضوابط

درسِ نظامی کا موجودہ تعلیمی معیار تسلی بخش نہیں۔ "درس" تو کسی حد تک موجود ہے "نظام" بالکل نہیں ہے اور جب تک یہ شعبۂ تعلیم منظم اور باقاعدہ نہ ہو، حکومت سے اس کی اہمیت تسلیم کرانا بہت مشکل ہے۔ نہ ہی اس کے تعلیم یافتہ لوگوں کے درجات متعین کئے جا سکتے ہیں۔ دوسری طرف علماء اپنی خود مختاری سے دست بردار ہونا اور اپنے اداروں کو غیر ہمدرد حکومتی انتظام کے قبضہ میں دینا پسند نہیں فرماتے۔ اس کے باوجود یہ مسئلہ لاینحل نہیں ہے کیونکہ جدید تعلیمی نظام میں بھی ایسے خود مختار ادارے مثلاً مشنری تعلیمی ادارے اور پبلک سکولز موجود ہیں۔ جو اگرچہ مقرر کردہ نصاب پڑھاتے ہیں لیکن اندرونی طور پر خود مختار اور آمد و خرچ کے اپنے ذرائع رکھتے ہیں۔ ملازمین کی تقرری و معزولی میں آزاد اور اپنی عمارات کے خود ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود حکومت انہیں گرانٹ دیتی اور ان کے تعلیمی درجات کو تسلیم کرتی ہے اور ان کے ذریعۂ تعلیم (تدریس کی زبان) کو اپنے قانون کا پابند نہیں بناتی۔

بالکل اسی طرح اگر دینی مدارس بھی مختلف درجات تحصیل کے لیے مقرر کردہ نصاب کے پابند ہوں اور ان درجات کو حکومت سے تسلیم کرا لیا جائے تو خود مختار رہ کر بھی وہ حکومت کا تعاون اور تدریس کا معیار بہتر حاصل کر سکتے ہیں۔ اور ان کے فارغ التحصیل علماء ایک مقررہ معیار

کے حامل ہو سکتے ہیں۔ اس مقصد کی طرف کچھ پیش رفت بھی ہو چکی ہے۔ یعنی چار وفاقوں اور بعض اداروں کی آخری سند کو حکومت نے تسلیم کر لیا ہے۔ لیکن اس سے نظام میں کوئی بہتری پیدا نہیں ہو سکتی کیونکہ اس سے نچلی سطح پر کوئی معیار یا درجات طے نہیں کیے گئے۔

قواعد و ضوابط کے لئے تجاویز

اس سلسلے میں میری تجاویز یہ ہیں۔

ا) رابطۃ المدارس الاسلامیہ سمیت تمام وفاقوں کے نامزد کردہ دو ارکان اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے دو ارکان اور حکومت کی طرف سے کم از کم تین ارکان پر مشتمل ایک بورڈ تشکیل دیا جائے جو جدید تعلیم کے درجات کے مطابق دینی تعلیم کے نصابی درجات متعین کرے اور نظام امتحان جاری کرے۔ قواعد و ضوابط بنائے اور ان کے نفاذ کی نگرانی کرے۔ ہر اجلاس کے لیے باری باری وفاقوں کے ارکان کو صدر بنایا جائے اور حکومت کے محکمہ تعلیم سے اس بورڈ کا صرف اتنا ہی تعلق ہو کہ ہر درجہ کی "شہادات" کا مرتبہ وہی تسلیم کیا جائے جو متوازی جدید تعلیم کے درجہ کا ہے۔ ایسے خصوصی اور خود مختار بورڈوں اور یونیورسٹیوں کا قیام خصوصی شعبوں میں پہلے ہی حکومت کے قانون میں تسلیم شدہ ہے اور انجنیئرنگ یونیورسٹی، ایگریکلچر یونیورسٹی اور ٹیکنیکل بورڈ اس کی موجود مثالیں ہیں۔

ب) مدارس کے قیام پر پابندی بالکل نہیں ہونی چاہیے کیونکہ یہ ہمیشہ سے آزادانہ قائم ہوتے آئے ہیں اور انہی میں سے بعض نہایت کامیاب ثابت ہوتے رہے ہیں۔ البتہ بورڈ کے ہاں کسی بھی مدرسہ کی منظوری کے لیے کچھ ضوابط مقرر کرنا ضروری ہوگا جن کی پابندی کے بغیر اس مدرسہ کی حیثیت تسلیم شدہ نہ ہوگی۔

ج) تمام منظور شدہ مدارس کے طلبہ اگر ایک مدرسہ سے دوسرے میں جانا چاہیں تو

پہلے مدرسہ کے سرٹیفکیٹ کے بغیر انہیں قبول نہ کیا جائے۔ جیسے جدید تعلیم کے اداروں میں مروج ہے۔

د) سابق تعلیم یافتگان یا ملازمت پیشہ لوگوں کے لیے بورڈ میں پرائیویٹ امتحانات کی رعایت رکھی جائے تاکہ دینی اداروں میں داخلہ نہ لے سکنے والے طالبان علم دین کو بھی اپنے علم میں اضافہ کا موقع مل سکے۔

ہ) مدارس کی بھی درجہ بندی کی جائے اور ہائی سکول، انٹر کالج، ڈگری کالج اور یونیورسٹی کی طرح ان کے بھی مقرر نام ہوں مثلاً مدرسہ۔ دارالعلوم۔ جامعہ وغیرہ۔

نصاب اور موجودہ تقاضے

آج سے کوئی تین سو سال پیشتر جب برصغیر میں موجودہ درس نظامی کا نصاب تجویز کیا گیا تھا۔ یہ نصاب دین و دنیا دونوں کی ضرورتوں کو پیش نظر رکھ کر ترتیب دیا گیا تھا اور وہ تمام غیر دینی مضامین بھی اس میں شامل تھے جن کی اس زمانے میں ضرورت تھی۔ جیسے ریاضی، تاریخ، ہیئت، مساحۃ الارض وغیرہ۔ لہذا فارغ التحصیل لوگ عصری تقاضوں پر پورا اترتے اور دوسروں کی فکری رہنمائی کے لیے موزوں ہوتے تھے۔ حالات بدلنے کے ساتھ ساتھ جب مسلمانوں کے ہاتھ سے قیادت نکل گئی تو سارا زور صرف دینی علوم اور عربی زبان کی تدریس پر رہ گیا۔ پھر جب علماء کے حصے میں صرف امامت و خطابت ہی رہ گئی تو دینی علوم میں کمال حاصل کرنا بھی غیر اہم ہو گیا اور مدارس سے بیشتر ایسے لوگ نکلنے لگے جو نہ مذہب میں اجتہادی نظر رکھتے تھے نہ حالات زمانہ کے مطابق دین کی روشنی میں لوگوں کی رہنمائی کر سکتے تھے ادھر جدید تعلیمی نظام نے مذہب کو دائرہ تعلیم ہی سے خارج کر دیا اور دونوں نظامہائے تعلیم ایک دوسرے کے مخالف بن کر رہ گئے۔ جدید تعلیم یافتہ لوگ علماء کو پسند نہ کرتے اور علماء جدید علوم کو شجر ممنوعہ سمجھتے۔ اب پاکستان میں اور بعض دوسرے اسلامی ممالک میں اس غلطی کا احساس کر لیا گیا ہے اور جہاں جدید تعلیمی نصاب میں

کچھ دینی معلومات لازم قرار دی گئی ہیں وہاں علماء بھی جدید علوم کی اہمیت کو تسلیم کرنے لگے ہیں۔ اس لیے اب ضروری ہو گیا ہے کہ درس نظامی کا نصاب بھی از سر نو ترتیب دیا جائے۔ دونوں مقاصد یعنی حصول علم دین اور جدید علوم سے واقفیت کے لیے کتابوں کا انتخاب اور ان کی درجہ بندی مجوزہ بورڈ کے ذریعہ ہو سکتی ہے۔

نصاب کے بارے میں تجاویز

اس سلسلے میں چند رہنما تجاویز یہ ہو سکتی ہیں۔

ا) ابتدائی درجوں کے لیے دینی مدارس میں بھی وہی نصاب رائج ہو جو جدید مدارس میں ہے۔ یعنی نوشت و خواند، روزمرہ ریاضی، پاکستان اور عالم اسلام سے واقفیت اور عام سائنس کی ابتدائی معلومات۔ جن دینی مدارس میں اس کا انتظام نہ ہو وہ اس درجے کے تعلیم یافتہ بچوں کو داخلہ کے لیے منتخب کریں۔

ب) ثانویہ عامہ یعنی میٹرک تک کے لیے ایسا نصاب تجویز کیا جائے جس میں دینی معلومات کو آرٹس کے علوم کے برابر قرار دیا گیا ہو۔ جدید اداروں میں سائنس اور آرٹس کے طلبہ میٹرک ہی میں الگ ہو جاتے ہیں اور آرٹس کے بہت سے علوم میں سے کوئی سے منتخب مضامین کا امتحان پاس کرنے والے میٹرک کی سند اور تمام حقوق کے مستحق ہوتے ہیں چونکہ انگریزی، عربی، فارسی غیر ملکی زبانوں کا خود مضامین کی تدریس سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لیے انگریزی پڑھنے والوں یا عربی پڑھنے والوں میں سند کے استحقاق میں کوئی فرق نہ ہونا چاہیے۔ انگریزی کو لازمی قرار دیے رکھنا اور ہر سال سکولوں کے ہزاروں بچے فیل کرنا توسیع تعلیم کے مقاصد کے قطعاً خلاف اور قوم پر ظلم ہے۔

ج) ثانویہ خاصہ یعنی انٹرمیڈیٹ اور عالیہ یعنی گریجوایشن میں بھی آرٹس والوں کی طرح دینی مدارس کے طلبہ کو دینی علوم کی بنیاد پر امتحان دینے اور شہادات حاصل کرنے

کا حق دیا جائے۔

۵) یہ شہادات وہی ہوں جو جدید اداروں کے طلبہ کو جاری کی جاتی ہیں الگ سند جاری کر کے اسے دوسروں کے برابر قرار دینا ایک مذاق ہے اور صاحب شہادت کو اچھوت بنا دیتا ہے۔

۵) دینی مدارس اپنے ہاں ریاضی، عام سائنس، علم التعلیم، تاریخ اور معاشیات کی تدریس کا درجہ بدرجہ بندوبست کریں اور اسلامی نقطۂ نظر سے ان علوم کی تدریس کریں۔ فلسفہ مطلقاً اور منطق اصطلاحات کے سوا خارج کر دیے جائیں۔

۶) تفسیر، حدیث اور فقہ میں مروجہ کتابیں بھی موزوں ہیں اوران کا بدلنا ضروری نہیں اگرچہ موزوں تر کا انتخاب کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اصول فقہ، معانی و بیان اور نحو میں پیچیدہ مباحث والی کتابوں کی بجائے ایسی کتابیں مقرر کی جائیں جو نفس مضمون کو عام فہم انداز میں پیش کرتی ہیں۔ مشکل پسندی کا زمانہ گذر گیا اور مقصد علم حاصل کرنا ہے نہ کہ کوئی خاص کتاب سمجھنا۔ ایسی کتب دستیاب بھی ہیں اور جہاں ضروری ہو از سر نو مرتب بھی کی جاسکتی ہیں۔

طریق تدریس و تربیت اساتذہ

تدریسی معاونات سے استفادہ انتہائی ضروری ہے جس کی کم از کم صورت تختہ سیاہ کا استعمال ہے اور زیادہ جتنا مالی حالات اجازت دیں۔ اسی طرح پرانے طریق امتحان کی بجائے یا اس کے ساتھ جائزہ کے جدید طریقے استعمال کرنا مفید ہے۔ وقت کی بچت، نتائج کا زیادہ یقینی ہونا اور جائزہ کی وسعت ان کے فوائد ہیں۔

اساتذہ کے ریفریشر کورسز ان کے علم میں اضافہ اور طریقہ ہائے تدریس میں بہتری کا باعث ہوتے ہیں۔

چھوٹے درجے کے مدارس کے اساتذہ کو جامعات میں کورس کرائے جائیں نیز جامعات میں علم التعلیم آخری درجوں میں لازمی ہو یا مجوزہ تعلیمی بورڈ کے زیر انتظام تربیتی اداروں کا اہتمام ہو جو محض تدریس کی فنی تربیت اور ریفریشر کورسز کے لیے ہوں۔

اختلاف مسالک

اختلاف مسالک اگرچہ فروعی ہے لیکن اس میں اتنی شدت آچکی ہے کہ اس کو کسی دباؤ سے کم نہیں کیا جا سکتا البتہ چونکہ مجوزہ بورڈ تمام مسالک کے نمائندوں پر مشتمل ہوگا اور ان کی منظوری ہی سے متحدہ نصاب جاری کیا جا سکے گا لہٰذا خود ان کی وجہ سے بھی افہام و تفہیم کی فضا ہموار ہوگی اور ایک ہی نصاب کے فارغ التحصیل لوگوں میں اختلافات کی شدت نہیں رہے گی اس لیے آئندہ کے لیے بہتری کی اُمید کی جا سکتی ہے۔

حکومت و مدارس میں تعلق

اس پر تفصیل سے بحث اگرچہ کی جا چکی ہے پہلے تو حکومت اور دینی مدارس کا سرے سے کوئی تعلق ہی نہ تھا اب حکومت بہت سے اداروں کو زکوٰۃ سے امداد بھی دیتی ہے اور ان کی آخری شہادت (دورہ حدیث) کو بھی دل سے تسلیم بھی کر چکی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ صرف نصاب اور معیار تعلیم میں حکومت اور دینی اداروں میں اتفاق ہو تاکہ شہادات حقیقی قدر و قیمت میں دوسرے اداروں کی طرح ہوں اور حکومت دینی اداروں کو برابر یہ تعلیم کے پرائیویٹ اداروں کی طرح گرانٹ بھی دے لیکن نظم و نسق میں دخل نہ دے بلکہ تمام ممکنہ تعلقات مجوزہ علماء بورڈ کے سپرد کر دے۔

دو متوازی نظام

جب یہ پوچھا جاتا ہے کہ آیا آپ درس نظامی کو بتدریج جدید نظام تعلیم میں ضم کرتے

بالکل ختم کر دینے کے حق میں ہیں کیونکہ ایک ہی ملک میں دو نظام بیک وقت رائج رہنا نہ مفید ہو سکتا ہے نہ مطلوب۔

میں اپنی اس جرات پر بڑی معذرت کے ساتھ یہ واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اوّل تو یہاں دو نظام ہیں ہی نہیں بلکہ ایک طرف ایک نظام ہے اور دوسری طرف فنی تعلیم کے چند ادارے جن کا کوئی نظام نہیں۔ لیکن اگر دو یا زیادہ نظام موجود بھی ہوں تو یہ کوئی غیر مفید صورت نہیں بلکہ تخصص کی ایک صورت ہے۔ جو ایک ہی نظام کے تحت مختلف شعبوں میں بھی ہو سکتا ہے اور الگ الگ نظاموں کے تحت بھی۔ کیا ہمارے ملک کے الگ الگ صوبوں کے محکمہ ہائے تعلیم اور یونیورسٹیاں ایک ہی نظام کے تحت چل رہے ہیں یا ہر ایک کا اپنا نظام اور اپنے بائی لاز موجود ہیں۔ نظام ہائے تعلیم کوئی سیاسی نظام نہیں ہیں کہ ایک ملک میں صرف ایک ہی چل سکے۔ اب تک کا جائزہ اور آئندہ کے لیے تجاویز نیز باہمی رابطہ کے حدود گزشتہ نکات پر بحث کے دوران ذکر ہو چکے ہیں۔

دیگر مسلم ممالک میں سے مصر، سعودی عرب اور مالدیپ نے اس سلسلے میں کچھ اقدامات کیے ہیں لیکن ہم لوگ ان کی تفصیلات سے پوری واقفیت نہیں رکھتے البتہ سعودی عرب کے نظام تعلیم سے متعلق ہم اتنا جانتے ہیں کہ وہاں ثانویہ عامہ تک ساری تعلیم ایک ہی ہے جو اپنی زبان میں ہے اور اس کا بہت اہم حصہ دینی تعلیم پر مشتمل ہے۔ اس سے آگے جدید تعلیم کا شعبہ الگ ہو جاتا ہے جس میں دینی تعلیم آخر تک شامل رہتی ہے اور دینی تعلیم کا شعبہ جامعہ اسلامیہ اور جامعہ امام کی صورت میں الگ ہو جاتا ہے جس میں محض دینی تعلیم ہوتی ہے اس کے باوجود شہادات کا درجہ ایک ہے اور ایم اے اور ڈاکٹریٹ کے حقوق سب کو حاصل ہیں اور میری اب تک کی پیش کردہ تجاویز کا حاصل بھی یہی ہے۔ سوائے اس فرق کے کہ سعودیہ میں یہ سب کچھ ایک ہی نظام کے دو شعبوں کی صورت میں ہے جبکہ ہمارے ہاں فی الحال ایسا کرنا ممکن نہیں۔ اس لیے اس کو الگ رکھ کر جدید زمانے کی ضرورتوں سے ہم آہنگ کرنا ہوگا۔ وما علینا الا البلاغ۔

دینی نظامِ تعلیم: عملی اقدامات

مولانا عبدالغفار حسن

دینی تعلیم کی اصلاح کے ضمن میں ایک جرأت مندانہ قدم اٹھانے کی ضرورت ہے، یا شاہ ولی اللہؒ کی اصطلاح میں "فکِّ کلِّ نظامٍ" کے بغیر کام نہیں چل سکتا تاکہ ہمارے تعلیمی نظام میں قدیم و جدید باہمہ گیر ایک خوبصورت وحدت اختیار کر سکیں اور نظامِ نو کے تحت ایسے علماء دین پیدا ہو سکیں جو عصری تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے امتِ مسلمہ کی صحیح راہنمائی کر سکیں اور ایسے فنی ماہرین (ڈاکٹر، انجنیئر، سائنسدان وغیرہم) مہیا ہو سکیں جو اپنے فن میں مکمل مہارت کے ساتھ ساتھ قرآن و حدیث کا وافر علم رکھتے ہوں اور جو آیاتِ قرآن و آیاتِ کونیہ میں پائی جانے والی مماثلت اور ہم آہنگی کو اسلام کی حقانیت کا عنوان بنا سکیں۔

اس مقصد کا حصول طویل المیعاد منصوبہ بندی کا محتاج ہے لیکن عبوری مرحلہ کے لیے مراسلہ میں اٹھائے گئے نکات کی روشنی میں میری معروضات درج ذیل ہیں۔

اوّل دینی مدارس سے فارغ التحصیل طلبہ کا امامت، خطابت یا تدریسی مشاغل تک محدود رہنے کے اسباب کا علم میں آنا انتہائی ضروری ہے۔ میرے خیال میں چونکہ یہ طلبہ غریب گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے فراغت حاصل کرتے ہی ملازمت اختیار کر لیتے ہیں تاکہ اپنے اہلِ خانہ کی مناسب کفالت کر سکیں۔ اُن کے اپنے وسائل اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں اور اس میدان میں کوئی نمایاں حیثیت اختیار کر سکیں۔ اس کا بہترین حل یہ ہے کہ مجوزہ مثالی درسگاہ میں، کہ جس کا قائم کرنا مراسلہ میں اٹھائے

گئے نکات کی روشنی میں ایک ضروری امر قرار پاتا ہے، ایسے طلبہ کو وظائف دیے جائیں اور ان میں امتیازی پوزیشن حاصل کرنے والے حضرات کو عربی ممالک میں مزید تعلیم کے لیے بھیجا جائے۔

دوم عربی مدارس کی موجودہ صورتحال انتہائی مایوس کن ہے جسے ہرگز صحتمند نہیں قرار دیا جاسکتا اور موجودہ فرقہ وارانہ ذہنیت کو دیکھتے ہوئے اس کا مستقبل قریب میں بدلا جانا بھی ممکن نہیں۔ خود طلبہ بھی دلجمعی سے تعلیم حاصل نہیں کرنا چاہتے۔ وہ جلد سے جلد دورہ حدیث کے مرحلہ تک پہنچ جانا چاہتے ہیں تاکہ مدرسہ سے فراغت حاصل کرتے ہی عصری تعلیم کے لئے کچھ وقت نکال سکیں جس کے نتیجہ میں انہیں معاشرہ میں باعزت مقام حاصل ہو سکے۔

موجودہ مدارس کے نصاب تعلیم کو تبدیل کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں جو کہ بارآور ثابت نہیں ہوئیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومتی یا نیم حکومتی سرپرستی میں ایک مستقل درسگاہ قائم ہو جس میں نکتہ نمبر ۳ کی روشنی میں نصاب کا اہتمام کیا جائے یا موجودہ مدارس میں سے کسی ایک مدرسہ کو منتخب کر کے اس میں ایک تجرباتی درسگاہ قائم کی جائے۔

موجودہ مدارس کی بتدریج اصلاح کی جاسکتی ہے۔ نئے مدارس کے لئے رجسٹریشن لازمی قرار دی جائے اور اس وقت تک کسی مدرسہ کو رجسٹرڈ نہ کیا جائے جب تک عمارت، اساتذہ اور تعداد طلبہ کے اعتبار سے مدرسہ کی کیفیت تسلی بخش نہ ہو۔ لیکن یہ ضروری ہوگا کہ ہر رجسٹرڈ مدرسہ کا گاہے بگاہے معائنہ ہوتا رہے اور وزارتِ اوقاف کی طرف سے اُسے باقاعدہ امداد دی جائے۔

سوم اس میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ مدارس سے فارغ التحصیل طلبہ دینی اور عصری قیادت کے تقاضے کما حقہ پورا کرنے سے قاصر ہیں۔ نصاب میں جدید و قدیم کے حسین امتزاج کی شدید ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں میری تجاویز حسب ذیل ہیں۔

مجوّزہ نصابی حکمتِ عملی

ثانوی (میٹرک) تک تعلیم ہر طالب علم کے لیے لازمی قرار دی جائے عام اس سے کہ یہ

تعلیم کسی اسکول میں مہیا کی جائے یا کسی مدرسہ میں۔

ابتدائی مرحلہ میں قرآن ناظرہ کی تعلیم لازمی ہو تاکہ بچے بجائے اس کے کہ شام کے اوقات میں قرآن کی تعلیم حاصل کریں، اسکول یا مدرسہ ہی میں قابل قراء کی نگرانی میں قرآن کی تعلیم حاصل کرسکیں۔

حفظ کے لیے موجودہ طریقہ برقرار رکھنا پڑے گا یعنی حفظ کے خواہشمند طلبہ شام کے اوقات میں مساجد میں حفظ کا اہتمام کریں، اگر مدرسہ ہی میں حفظ کی مستقل کلاسیں رکھ دی جائیں تو وہ زیادہ بہتر ہوگا۔ ثانوی مرحلہ میں عربی زبان اور تجوید لازمی ہونی چاہیے تاکہ طلبہ قرآن کو صحیح مخارج سے ادا کرسکیں، ثانوی سے فراغت کے بعد عام طور پر طلبہ اپنی استعداد اور خواہش کے لحاظ سے تعلیم کی راہ متعین کرتے ہیں۔ دینی تعلیم کے خواہشمند طلبہ اس مرحلہ میں کسی بھی دینی مدرسہ میں داخلہ لے سکیں گے اور جیسے میٹرک کے بعد عام طور پر چھ سال میں ایک طالب علم ایم اے کی ڈگری حاصل کرلیتا ہے، اسی طرح دینی مدارس کا نصاب بھی چھ سالہ ہو اور اس کی آخری ڈگری ایم اے کے برابر تسلیم کی جائے۔

اس چھ سالہ نصاب کی نمایاں خصوصیات یہ ہوں گی۔

ا۔ منطق وفلسفہ کو بالکل حذف کردیا جائے۔

ب۔ پہلے سال میں عربی نحو صرف اور بلاغت پر زور دیا جائے تاکہ آئندہ سالوں کے لئے مضبوط بنیاد فراہم ہوسکے اور اس سلسلہ میں مروّجہ کتب کے بجائے النحو الواضحة، ابن ھشام کی قطر الندیٰ اور شرح اُلفیہ ابن مالک رکھی جائیں۔

ج۔ پورے قرآن کی تفسیر کم از کم تین سال میں ضرور ختم کی جائے۔ مختصر تفاسیر میں ”جامع البیان“ مناسب رہے گی۔ شوکانی کی ”فتح القدیر“ کے منتخبات بعد کے مرحلہ میں پڑھائے جاسکتے ہیں۔

د۔ احادیث کی کتابوں میں بخاری، مسلم، ابوداؤد اور ترمذی پر قناعت کی جائے۔

ہ۔ فقہ میں قدوری، شرح وقایہ اور ہدایہ کی تعلیم ہو۔

و۔ اصولِ تفسیر، اصولِ حدیث اور اصولِ فقہ پر ایک ایک کتاب زیرِ تعلیم رہے۔

ز۔ عقائد۔ فرائض اور سیرت و تاریخ کے اسباق رکھے جائیں۔

ہ۔ بی اے تک انگریزی زبان کا کورس شامل ہو تاکہ طلبہ انگریزی میں مطالعہ کی کافی استعداد پیدا کر سکیں۔

ط۔ چونکہ مذکورہ نصاب میں تقریباً بارہ مضامین شامل ہیں اس لیے چند جدید مضامین کا باضابطہ اضافہ ممکن نہ ہوگا لیکن ان کی کمی ایسے پوری کی جاسکتی ہے کہ معاشیات، سیاسیات، وضعی قانون اور تاریخ التشریع الاسلامی پر ان چھ سالوں میں متعدد لیکچر رکھے جائیں جن میں ان مضامین کے اساتذہ کو باقاعدہ مدعو کیا جائے حجۃ اللہ البالغہ میں سے تتمہ کے تحت پانچ ابواب (باب اسباب اختلاف الصحابۃ والتابعین .... الخ) پر مشتمل لیکچرز یا دروس کا بھی اہتمام کیا جائے۔ اس ضمن میں امام ابنِ تیمیہ کی "رفع الملام عن الأئمۃ الاعلام" سے بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

چہارم نصابی کتب کی ازسرِنو تحریر کے بجائے عالم عرب یا سعودی عرب کے مناہج میں داخل عہدِ حاضر کی تحریر شدہ کتب اپنائی جاسکتی ہیں۔ خاص طور پر اصول حدیث (مصطلح) اور اصول فقہ کی کتب سے استفادہ کیا جاسکتا۔

پنجم اساتذہ کی فنی تربیت کی افادیت کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ جس طرح مڈل سے لے کر بی اے تک فنی تربیت کے کورسز معروف ہیں ایسے ہی دینی مدارس کے فارغ التحصیل اساتذہ کو بھی ان کورسز میں داخلہ دیا جائے تاکہ وہ بہتر طریقہ سے طلبہ کی رہنمائی کر سکیں۔

ششم پاک و ہند میں اختلافِ مسالک کی تاریخ بہت مختصر ہے۔ گو موجودہ صورت حال کو یک قلم ختم نہیں کیا جاسکتا لیکن حکومت کی سرپرستی اور نئے سلیبس کی حامل درسگاہ کا وجود آہستہ آہستہ موجودہ صورت حال میں خوش آئند تبدیلی لانے کا باعث ہوگا۔

مختلف مسالک میں تقریب پیدا کرنے کے لیے شاہ ولی اللہ کے اختیار کردہ مسلک کی زیادہ

سے زیادہ اشاعت مناسب ہوگی۔

ہفتم حکومت اور دینی مدارس میں تعلقات انتہائی معمولی سطح پر پائے جاتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ موجودہ تین طرح کے وفاق ہائے مدارس کی آخری سند کو ایم اے کے برابر تسلیم کیا جا چکا ہے لیکن جہاں تک ملازمت کا تعلق ہے، ان کی سند کو عملاً تسلیم نہیں کیا جاتا۔ صرف کالجوں میں داخلہ کی حد تک قابل قبول سمجھا جاتا ہے۔ یہ امر افسوس ناک ہے کہ جب سے وفاق کی اسناد کو ایم اے کے برابر تسلیم کیا گیا ہے جعلی سندات بکثرت گردش میں آگئی ہیں جس سے دینی مدارس کی شہرت واقدار ہوگئی ہے۔

جب سے حکومت نے وزارتِ اوقاف کی جانب سے مدارس کو زکوٰۃ کی رقم دینا شروع کی ہے اس تعلق میں قدرے اضافہ ہوا ہے۔ گو مدارس کی ضروریات کے لحاظ سے مقررہ امداد ناکافی معلوم ہوتی ہے۔

ہشتم ملک میں بیک وقت دونوں نظاموں کا موجود رہنا کسی بھی صورت مستحسن قرار نہیں دیا جا سکتا لیکن اس صورت حال میں بتدریج ہی تبدیلی لائی جا سکتی ہے جس کی ایک شکل کا تذکرہ اوپر کی سطور میں آ چکا ہے یعنی ایک مثالی درسگاہ کا قیام یا موجودہ دینی مدارس میں سے کسی ایک مدرسہ کو انتخاب کر کے اس تجربہ کا آغاز کیا جائے۔

آج کل درس نظامی کے طلبہ مدرسے کے امتحانات کے ساتھ ساتھ مڈل، میٹرک، ایف اے اور بی اے کے امتحانات کی بھی تیاری کرتے ہیں اور چونکہ دونوں نظاموں میں امتحانات کی تاریخیں مختلف ہوتی ہیں اس لیے طلبہ کا دُھرا حرج ہوتا ہے۔ اس صورت حال کے تدارک کے لیے وفاق اور حکومتی اداروں کے امتحانات کے مابین توافق پیدا کرنے کی سعی کی جائے اور جہاں دینی مدارس کے نصاب میں جدید مضامین پر مشتمل لیکچرز اور دروس کے اہتمام کی تجویز پیش کی گئی ہے۔ وہاں موجودہ کالجوں کے نصاب میں قرآن و حدیث کی تعلیمات پر مشتمل ایک مضمون کا اضافہ ناگزیر ہوگا۔

نہم دیگر مسلم ممالک میں سے سعودی عرب کے نظامِ تعلیم کے بارے میں ذاتی مشاہدے

کی روشنی میں چند باتیں عرض ہیں۔

سعودی عرب میں چونکہ دینی تعلیم کو بھی حکومت کی سرپرستی حاصل ہے اس لئے وہاں ملازمت کے سلسلہ میں وہ پریشانیاں نہیں پائی جاتیں جو ہمارے فارغ التحصیل طلبہ کو پیش آتی ہیں۔ وہاں کے عدالتی نظام (قضاء) میں بھی ایک کثیر تعداد کھپ جاتی ہے۔

ثانوی مرحلہ میں وہاں دونوں قسم کے نظام رائج ہیں یعنی ہمارے اسکولوں کی طرز پر عصری تعلیم کے مدارس، لیکن اُن کے نصاب میں قرآن وحدیث، عقائد وفقہ وتجوید پر مشتمل کافی مواد شامل ہے، دوسرے معاہد دینیہ جن میں خالص دینی علوم پڑھائے جاتے ہیں۔

ثانوی کے بعد مزید دینی تعلیم حاصل کرنے کے خواہشمند طلبہ کلیہ شریعہ یا کلیہ اصول الدین میں داخلہ لیتے ہیں جہاں لیا ؟ (بی اے) ماجستیر (ایم اے) اور دکتوراہ (ڈاکٹریٹ) تک کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے۔

عصری تعلیم کے لیے متعدد جامعات بھی قائم ہیں۔

ہم ثانوی اور اعلیٰ دونوں مراحل میں وہاں کی نصابی کتب میں سے مناسب کتب کا انتخاب کر سکتے ہیں۔

فی الحال ان چند گذارشات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اسلامی مدارس کی نصابی روایت اور فارسی

پروفیسر سید محمد سلیم

ہندوستان کے قدیم مدارس میں جو نصابِ تعلیم رائج ہے اس کی امتیازی خصوصیت نصابِ تعلیم کا فارسی حصہ تھا۔ نصابِ تعلیم کا ایک حصہ عربی تھا جو اسلام کا ورثہ تھا جو عالم اسلام سے ہندوستان میں منتقل ہوا تھا۔ دوسرا حصہ فارسی تھی جو اہلِ عجم کا ورثہ تھا جو ایران توران سے ہندوستان میں منتقل ہوا تھا۔ ہندوستان میں اسلامی حکومت کے قیام کے ساتھ ہی نصابِ تعلیم کے یہ دونوں حصے یہاں ہندوستان میں منتقل ہو گئے تھے۔ یہاں کے قدیم دینی مدارس میں یہ دونوں حصے پڑھائے جاتے تھے۔ تعلیم کا آغاز فارسی حصہ سے ہوتا تھا اور تعلیم کی تکمیل عربی حصہ سے ہوتی تھی۔ کوئی شخص اہلِ علم اس وقت تک شمار نہیں ہوتا تھا جب تک کہ اس نے عربی زبان اور دینی علوم کی تحصیل نہ کر لی ہو۔ فارسی حصہ اور عربی حصہ یعنی علوم اور دنیوی علوم کی تحصیل سے فارغ ہو کر طالب علم کوئی ہنر سیکھتا تھا کوئی ذریعہ معاش ڈھونڈتا تھا۔ عربی نصاب کی تحصیل کرنے والے کو عالم اور فارسی نصاب کی تحصیل کرنے والے کو فاضل کہتے تھے اور دونوں نصابوں کی تکمیل کرنے والے شخص کو عالم فاضل کہتے تھے۔

برصغیر پاک و ہند میں سلطان محمود غزنوی (۱۰۳۰ء) کے وقت سے فارسی مملکت کی زبان رہی ہے۔ ساری دفتری کارروائی، ساری سرکاری مراسلت فارسی زبان میں ہوتی تھی۔ اسلامی عہدِ حکومت کے بعد مرہٹوں اور سکھوں کے دورِ اقتدار میں بھی فارسی کی یہ حیثیت برقرار رہی۔ البتہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت نے ۱۸۳۵ء میں فارسی زبان کی سرکاری حیثیت ختم کر

ڈالی۔ اس کے بعد سے برصغیر ہند و پاک میں فارسی کی اہمیت ختم ہوتی گئی۔

عہدِ اسلامی میں چھوٹے بچے کی تعلیم کا آغاز ۴ سال ۴ ماہ ۴ دن کی عمر میں ہو جاتا تھا اور قرآن مجید کی تعلیم کے فوراً بعد فارسی کی تعلیم کا آغاز ہو جاتا تھا۔ بلادِ عجم۔ ایران، ترکستان اور برصغیر ہند و پاک ــــ میں فارسی زبان کا غلبہ تھا۔ اس لیے یہاں ایک نصابِ تعلیم فارسی زبان میں بتدریج ارتقا پذیر ہو گیا تھا۔ معمولی تغیرات اور مقامی اضافوں کے ساتھ وہ ان ممالک میں پڑھایا جاتا تھا۔ تقریباً سارا نصاب تعلیم دنیا داری کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے وضع کیا گیا تھا اس لیے سارا نصاب دنیوی علوم سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نصابِ تعلیم کو پڑھنے کے بعد ایک شخص معاملہ فہم، کارداں اور حکومت اور دفتری مراسلات سے واقف ہو جاتا اور ایک عملی انسان بن جاتا تھا۔ سیاسی اور معاشرتی زندگی کے تقاضے بخوبی سمجھتا تھا اور ان سے متعلق امور سرانجام دینے کا اہل بن جاتا تھا۔

اکبر بادشاہ کے وزیر ابوالفضل نے "آئینِ اکبری" میں فارسی نصابِ تعلیم کے حسب ذیل مضامین گنائے ہیں۔ دینی علوم کا تعلق عربی نصاب سے ہے اس لیے ان کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ اخلاق

حساب، سیاق (بہی کھاتہ حساب رکھنا) زراعت، مساحت (پیمائش زمین)

ہندسہ، فلکیات، تدبیرِ منزل، سیاستِ مُدن، طب، منطق، علومِ طبیعی، علومِ الٰہی (مابعد الطبیعات) تاریخ، ہندوؤں کے لئے نیائے بیدانت پاتنجلی (ج اوّل ص ۲۰۲)

چندر بھان برہمن شاہجہان بادشاہ کا میر منشی تھا۔ وہ اپنے بیٹے تیج بھان کو مندرجہ ذیل فارسی کتابوں کے مطالعہ کا مشورہ دیتا ہے۔ اس سے اس دور کے نصاب کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

"اگرچہ فارسی علوم کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ سب کا احاطہ کرنا کسی بشر کے لیے ممکن نہیں ہے۔ آغاز میں برکت کے لئے گلستان، بوستان، رقعات ملاجا کی نہایت ضروری

ہیں، اور جب مزید توفیق ملے تو کتبِ اخلاق۔ اخلاقِ جلالی، اخلاقِ ناصری وغیرہ اور کتبِ تواریخ ـــــ حبیب السیر، روضۃ الصفا، روضۃ السلاطین، تاریخ گزیدہ، ظفر نامہ اکبر نامہ وغیرہ کا پڑھنا نہایت ضروری ہے۔ ان سے سنجیدگی اور متانت پیدا ہوتی ہے اور دنیا اور دنیا والوں کے حالات سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ مجلسوں اور محفلوں میں ان کی ضرورت پیش آتی ہے۔ شعرا کے دواوین اور مثنویاں جو اس نیاز مند نے عنفوانِ شباب میں پڑھی تھیں، وہ یہ ہیں۔ حدیقہ حکیم سنائی، مثنوی مولانا روم، منطق الطیر خواجہ فرید الدین عطار، دیوانِ شمس تبریز وغیرہ۔

اے فرزند! جس قدر کاموں سے فرصت میسر آئے ان بزرگوں کی تصانیف کا مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ برکت اور راحت حاصل ہو، تاکہ لیاقت اور قابلیت پیدا ہو، تاکہ کلام میں لذت حاصل ہو۔"

سات سالہ نصاب

فارسی نصاب سات سالہ تھا اور سات مضامین کی کتابیں داخلِ نصاب ہوتی تھیں۔

۱) تحصیل فارسی۔ ۲) فارسی ادب۔ ۳) نثر اور شاعری۔ ۴) عقائد اور عبادات۔ ۴) اخلاق و تصوف۔ ۵) تاریخ و واقعات۔ ۶) حکمت و دانائی۔ ۷) انشاءات اور رقعات۔ کل کتابیں ۴۶ ہوتی تھیں۔ تکمیل کی کتابیں اس کے علاوہ تھیں۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ نصاب برسوں کی بجائے کتابوں سے وابستہ تھا۔ بعض طلباء سات سال میں اس نصاب کو ختم کر لیتے تھے بعض اور جلدی ختم کر لیتے تھے۔ بعض مزید تاخیر سے ختم کر پاتے تھے۔ اصل اہمیت کتابوں کی تھی۔ دن میں دو وقت مدرسہ لگتا تھا۔ شام کا وقت دہرانے کے لئے اور تحریر و کتابت کے لئے مخصوص تھا۔ ہر طالب علم پر استاد انفرادی توجہ دیتا تھا۔ مرکز تعلیم طالب علم ہوتا تھا۔ چند اوراق کے چھوٹے چھوٹے رسالے نصاب میں شامل ہوتے

تھے۔جو جلدی جلدی ختم ہو جاتے تھے اور بچے کا ذوق تازہ رہتا تھا۔نئی کتاب شروع کرنے پر بچے کو خوشی ہوتی تھی۔نفسیاتِ اطفال کے ماہرین آج بتاتے ہیں کہ وقت کا تصور بچے کے نزدیک بالغ انسان کے تصور وقت سے تیز رفتار ہوتا ہے۔جلد جلد نئی نئی اشیاء اس کے سامنے سے گذرتی رہنا چاہیئے۔طویل گھنٹوں سے اس کی طبیعت اکتا جاتی ہے۔ہمارے قدیم بزرگوں کو بچوں کی نفسیات کا یہ گر معلوم تھا اس کے مطابق ہی انہوں نے بچوں کی نصابی کتابیں تیار کی تھیں جو عام طور پر دس پندرہ دن میں ختم ہو جاتی تھی۔

فارسی زبان کا علم

برصغیر ہند و پاک کے لوگوں کے لیے فارسی غیر ملکی زبان تھی۔اس لئے تعلیم کا پہلا مرحلہ زبان کی تحصیل تھا۔اس میں اصول تدریج کو سامنے رکھ کر کتابیں تیار کی گئی تھیں سب سے اول بچوں کے لئے امیر خسرو سے منسوب کتاب خالق باری پڑھائی جاتی تھی۔جس میں عام استعمال ہونے والے فارسی، عربی اور ہندی کے الفاظ جمع کر دیئے گئے ہیں۔یہ کتاب اشعار میں ہے۔

خالق باری سرجن ہار   واحد ایک بدا کرتار

تحصیل فارسی کے لئے قواعد وغیرہ کی اچھی خاصی کتابیں پڑھنا پڑتی تھیں۔تحصیل کے بعد ضروری تھا کہ فارسی زبان میں مہارت حاصل ہو۔تحریر و تقریر پر قدرت حاصل ہو۔اس کے لئے نثر اور نظم کی ایک معقول تعداد کتب پڑھنا پڑتی تھیں۔اس کے بعد عام طور پر وہ طالب علم فارسی تحریر و تقریر پر رواں ہو جاتا تھا۔بعض لوگوں کی تحریریں تو بڑی معیاری ہوتی تھیں۔اہل ہند کے فارسی نثر و نظم میں یہ چھوڑے ہوئے آثار قلم اہل زبان سے خراج تحسین وصول کرتے ہیں۔نظم میں امیر خسرو، فیضی اور غالب کا کلام اور نثر میں ابوالفضل اور عنایت اللہ لاہوری کی نگارشات کو اہل ایران بھی تسلیم کرتے تھے۔حالانکہ ان لوگوں کی مادری زبان فارسی نہیں تھی۔

اس نصاب میں ایک حصہ کتب عقائد و عبادات سے متعلق ہے۔اس کی ضرورت اس

لیے تھی تاکہ آغاز سے ہی بچہ کا ذہن اسلامی خطوط پر استوار ہو، یہ ایک بنیادی ضرورت تھی۔ دینی تعلیم کے ذیل میں اخلاق و تصوف کے زیرِ عنوان کتابوں کا ایک سلسلہ تھا جو طالب علم پڑھتا تھا۔ آسان سی کتاب نام حق سے یہ سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ کریما۔ پند نامہ عطار، تحفۃ الاحرار جامی اور مثنوی مولانا روم تک وسیع تھا۔ اس لئے کہ صرف مسائل خشک انداز میں جان لینا کافی نہیں ہے۔ مسلمان وہ ہے جس کی ذہنیت اور جس کی فکر مسلمان ہو چکی ہو، جس کے غور و فکر کا نہج اور رخ متعین ہو چکا ہو، تشکیل ذہنیت کا معاملہ اتنا آسان نہیں ہے۔ سادہ انداز میں خشک طریقے سے عقائد گنوا دینے سے یا مسائل بیان کر دینے سے ذہنیت تشکیل پذیر نہیں ہوتی بلکہ آیات قرآنی اور احادیث کے ترجمے، سبق آموز حکایات اور قصے، پند و نصائح، اشعار سب مل کر ذہن کی تشکیل کرتے ہیں اور پھر استحکام بخشتے ہیں۔

اس کے بعد کتبِ اخلاق اور کتبِ فہم معاملات پڑھائی جاتی تھیں۔ اس میں اخلاق محسنی، اخلاق ناصری اور اخلاق جلالی شامل تھیں۔ ان کتب سے دینی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے انسانی زندگی کے معاملات پر گفتگو کی جاتی تھی۔ انسانی زندگی کو ان کتابوں میں چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ تہذیبِ اخلاق (تدبیرِ فرد) حسنِ معاشرت، تدبیرِ منزل (افراد خاندان کے معاملات) تدبیرِ مُدن (شہری زندگی کے معاملات) اور تدبیرِ ریاست و حکومت ان شعبوں میں ہمارے جدید دور کے بہت سے عمرانی علوم کا بیان آ جاتا تھا۔ مثلاً عمرانیات، اقتصادیات، سیاسیات اور سب سے بڑھ کر اخلاق اور حکمت اور دانائی کا بیان ہوتا تھا۔ ان علوم پر مختلف نقطۂ نظر سے گفتگو کی جاتی تھی۔ مختلف فاضل تر افراد کے افکارِ علمیہ ان کے سامنے پیش کیے جاتے تھے۔ اس طرح دینی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے انفرادی اور اجتماعی معاملات کو حل کرنے اور چلانے کی صلاحیت طلبہ میں پیدا ہو جاتی تھی۔

انشاءات اور رقعات

فارسی نصاب کا قابلِ قدر اور اہم ترین حصہ انشاءات اور رقعات کی تعلیم پر مشتمل ہوتا تھا۔ یہ اس نصاب کا امتیازی حصہ تھا۔ لوگ خطوط سمجھ کر ان کو لائق توجہ نہیں سمجھتے۔ ان رقعات کا کسی نے سنجیدگی سے مطالعہ نہیں کیا۔ نہ ان کے پس پردہ حکمت و دانائی کو واضح کیا۔ رقعات کی خاصی طویل فہرست ہے جو فارسی کے طلبہ مطالعہ کرتے تھے۔ مثلاً رقعاتِ نظامیہ۔ انشائے دلکشا، انشائے فائق، انشائے بہار عجم، انشائے خلیفہ امان اللہ حسینی، رقعاتِ عالمگیری، انشائے منیر، انشائے مادھورام، انشائے فیض رساں، رقعاتِ بیدل، پنج رقعات، ارادت خاں، رقعات ابوالفضل، انشائے طاہر وحید، انشائے طغرا ....

مغل دورِ حکومت میں سلاطین اور نوابین ہوں، صوبوں کے امراء ہوں یا اضلاع کے والی ہوں سب کے یہاں سرکاری مراسلت کے لئے دفتر قائم ہو گیا تھا۔ مراسلت لکھنے والے منشی یا دبیر ہوتے تھے۔ جس قسم کی تحریرات ہوتیں اور رقعات لکھے جاتے ان سب کی نقول رکھی جاتی تھیں۔ پھر وہ منشی اپنے قلم کی لکھی ہوئی تمام تحریرات کی نقول کو جمع کر کے شائع کر دیتا تھا۔ یہ دراصل ان امراء، نوابین اور والیوں کی مراسلات اور احکام ہوتے تھے جو منشی اپنے نام سے شائع کرتے تھے۔ انشائے بہار عجم کے معنی یہ ہیں کہ منشی ٹیک چند بہار نے اپنے حاکم اور آقا کے لئے جو خطوط لکھے، جو مراسلت کی یہ ان سب کا مجموعہ ہے۔ مادھورام فائق، خلیفہ امان اللہ حسینی یہ سب منشیوں کے نام ہیں جنہوں نے مکاتیب کے یہ مجموعے تیار کئے ہیں۔

یہ خطوط سکھاتے تھے کہ مختلف مواقع کے لئے اور مختلف مقاصد کے لئے کس قسم کی تحریریں اور نگارشات لکھی جاتی تھیں۔ نجی خطوط، اعتذار و معذرت نامے، سپاس گذاری اور سپاسنامے کس طرح لکھے جاتے تھے۔ سرکاری مراسلت اور قانونی دستاویزات کس طرح تیار کی جاتی تھیں۔ پھر یہ خطوط مختلف اسالیبِ بیان سکھاتے تھے۔ قوت استدلال اور زور بیان سکھاتے تھے۔ ان میں رقعات ابوالفضل بھی ہیں، جو اکبر بادشاہ کا وزیر تھا اور مشہور اہل قلم اور انشاء پرداز تھا۔ اس کے زورِ بیان کی قوت اس کے دشمن بھی تسلیم کرتے تھے۔ بلخ کے حکمران نذر محمد نے ایک مرتبہ کہا تھا۔

ہیں اکبر کے سپہ سالار خانخاناں کی تلوار سے اتنا خائف نہیں ہوں جتنا ابوالفضل کے قلم سے خائف ہوں۔ یہ خطوط معذرت اور معافی کا انداز سکھاتے تھے۔ دفتری امور میں یہ خطوط حساب وکتاب سیاق نویسی تخمینہ آمد وخرچ اور محاسبہ، سارے امور کی تعلیم دیتے تھے۔ ان سب سے بڑھ کر یہ کہ خطوط سے نجی زندگی کا حال معلوم ہوتا ہے۔ یہ مغل دور کی انتظامیہ پر فائز افراد کے خطوط ہیں۔ اس سے ان کی نجی زندگی عیاں ہو جاتی ہے یعنی وہ کس قدر با اخلاق اور متقی تھے کس حد تک عدل و انصاف کا پاس و لحاظ رکھتے تھے یا کہ وہ بد اخلاق اور بدعہد تھے۔ مغل انتظامیہ کا یہ ایک آئینہ ہے۔ اصل زندگی کے واقعات یہاں عریاں نظر آتے ہیں۔

یہ خطوط اپنے سے بالا حکام اور افسروں کے نام ہیں۔ اپنے برابر والوں کے نام ہیں اور اپنے زیر دستوں کے نام ہیں اور اپنے اعزہ اقربا کے نام ہیں۔ ان خطوط میں سرکاری رپورٹیں ضابطے، ہدایت نامے، احکام، مالی امور، آمد و خرچ کے تخمینے سب شامل ہیں۔ ان میں صلح و جنگ، ناراضگی اور معافی، اعتذار و معذرت، عذر خواہی اور تعزیت، سپاس گذاری اور توصیف شعراء کے کلام پر تقریظیں خانگی امور پر مشورے، خفگی ہر قسم کے معاملات درج ہیں۔ ان خطوط میں ضرب الامثال بیان کی گئی ہیں۔ موقع و محل کی مناسبت سے اشعار بیان کیے گئے ہیں۔ مناسب حکایات بیان کی گئی ہیں۔ واقعات سے استشہاد کیا گیا ہے۔ حکماء کے مقولے درج کر لیے گئے ہیں۔ احادیث اور آیات قرآن کا ذکر ہے۔ یہ خطوط مغل امراء و نوابین اور والیان اضلاع کے کردار گفتار کا آئینہ دار ہیں۔ ان سے ان کے انداز فکر اور مبلغ علم کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے اور ان سے ان کی نجی اور شخصی زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

امورِ مملکت کی تربیت ۔ عملی طریقہ

امورِ سلطنت و نظام حکومت کی تعلیم و تربیت دینے کے دو طریقے ہو سکتے ہیں ایک نظری۔ دوسرا عملی۔ نظری تعلیم یہ ہے کہ انفرادی معاملات، اخلاق و کردار، معیشت و معاشرت

سیاستاً و حکومت، جنگ و صلح پر باقاعدہ تصنیف شدہ کتابیں طالب علموں کو اور امیدواروں کو پڑھائی جائیں۔ نظری طریقے سمجھائے جائیں۔ قواعد و ضوابط بتائے جائیں۔ یہ طریقہ ہمارے زمانے میں رائج ہے۔ اعلیٰ درس گاہ ہو یا فنی درس گاہ، سبھی میں یہی طریقہ رائج ہے۔ دوسرا طریقہ عملی ہے: ایک انسان کو امور ریاست و حکومت میں جن جن مسائل سے سابقہ پیش آتا ہے اور جس طرح ایک شخص ان کو حل کرتا ہے ان امور کو ان کے فطری پس منظر میں رکھ کر سمجھایا جائے۔ یہ انشاءات و رقعات سرکاری خطوط، سرکاری مراسلات، سرکاری احکام و دستاویزات اس پس منظر میں پیش کرتے ہیں جن کو پڑھ کر ایک طالب علم پہلے مسئلہ کی سنگینی اور دشواری کو سمجھتا تھا پھر جو حل اختیار کیا گیا اس کو سمجھتا تھا۔ اس طرح اس کی تربیت عملی انداز میں ہوتی تھی۔ ایک امیر کی ساری مراسلت اور تحریرات اس کے سامنے سے گذر گئیں، گویا اس امیر کا سارا طرزِ عمل سارا کردار اور حکمتِ عملی سب عیاں ہو کر سامنے آگئی۔ اس طرح دس بارہ رقعات کے مجموعے پڑھنے کے معنی یہ ہیں کہ دس بارہ اعلیٰ مناصب پر فائز امراء کے کردار سامنے آگئے۔ حکومت کے لیے اہل کار اور افسران کی تعلیم و تربیت کا یہ ایک نہایت اچھا طریقہ تھا۔ ہمارے زمانے میں 'نیپا' کی تربیت سے اس کو تشبیہ دی جا سکتی ہے۔

سول سروس کی تعلیم کا نصاب

دراصل یہ مغل دورِ حکومت میں سول سروس کی تعلیم و تربیت کا نصاب تھا۔ نصابِ تعلیم کا یہ فارسی حصہ تھا جس سے معاملہ فہم، کاروان اور امور مملکت سے واقف لوگ پیدا ہوتے تھے۔ اس نصاب کو پڑھ کر ایک طالب علم حکومت کے اعلیٰ ترین منصب کے لیے تیار ہو جاتا تھا۔ بڑی سے بڑی ذمہ داری کو پورا کرنے کا اہل بن جاتا تھا۔ یہ نصاب حکومتِ وقت کو مردانِ کار مہیا کرتا تھا۔ اس نصاب کو پڑھ کر چنیوٹ کے ایک ملا کا بیٹا نواب سعد اللہ خاں شاہ جہاں بادشاہ کا وزیرِ اعظم بن گیا تھا۔ ایسا وزیر اعظم جس کا شمار عالمِ اسلام کے چوٹی کے وزراء میں ہوتا ہے۔

جس کا شمار نظام الملک طوسی، نصیر الدین محقق عرسی، محمود کاواں کے زمرہ میں ہوتا ہے۔
اس نصاب تعلیم نے گزشتہ زمانہ میں اس کے علاوہ بھی بڑے لائق اور فائق افراد پیدا کئے۔
عبدالرحیم خانخاناں سپہ سالار، ابوالفضل چیف سیکرٹری منعم خان گورنر علی مردان خاں مہندس معمار شالامار باغ لاہور، اور نہر چاندنی چوک دہلی، استاد احمد لاہوری معمار روضہ تاج محل آگرہ اور جامعہ مسجد دہلی۔ خیراللہ خان دہلوی ماہر فلکیات مہندس زیچ محمد شاہی جنتر منتر نئی دہلی عبدالقادر بدایونی مورخ احمد امین رازی جغرافیہ دان، علامہ تفضل حسین کاشمیری لکھنوی ہفت زبان عربی فارسی، ترکی، انگریزی، یونانی، لاطینی۔

ہندوستان میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت قائم ہوئی (۱۷۵۷ء-۱۸۵۷ء) اس وقت مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت پوری طرح کارفرما تھا۔ اس سے مردان کار تیار ہو رہے تھے۔ بعض انگریز مصنفوں نے مسلمانوں کی حسن لیاقت اور حسن کارکردگی کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔
ولیم ہنٹر لکھتا ہے۔

"حقیقت یہ ہے کہ جب یہ ملک ہمارے قبضہ میں آیا تو مسلمان یہاں سب سے اعلیٰ قوم تھی، نہ صرف جرات اور قوت بازو میں برتری رکھتی تھی بلکہ سیاسی تنظیم اور عملی سیاست میں بھی سب سے آگے تھی۔

(Hunter, "Our Indian Mussalmans" p. 145)

ایک دوسرا انگریز ہنری ہیرنگٹن لکھتا ہے۔

"عزم و ہمت، تعلیم اور ذہنی صلاحیتوں کے اعتبار سے مسلمان ہندوؤں سے کہیں زیادہ فائق ہیں۔ ہندو ان کے سامنے طفل مکتب معلوم ہوتے ہیں علاوہ ازیں مسلمانوں میں کارگذاری کی اہمیت بھی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے سرکاری ملازمتیں زیادہ تر انہی کو ملتی ہیں"۔

(Henry Herrington Thomson, "Indian Rebelion and our Policy" 1857, p. 135)

اس نصاب میں مردم سازی کی بڑی عظیم الشان صلاحیت تھی۔ اس سے جامعہ الصفات قسم

کے افراد پیدا ہوتے تھے۔ آخر زمانہ تک جامع حیثیت کے افراد پیدا ہوتے رہے ہیں۔ سرسید احمد خاں علامہ شبلی، سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا مودودی ایسے لوگ تھے جو مختلف علوم پر یکساں قدرت کے ساتھ قلم اٹھاتے تھے۔

غیر مؤثر کیوں ہوا

یہ تفصیلات سن کر بعض لوگوں کے دل میں ضرور سوال پیدا ہوگا کہ ایسے فاضل لوگ پیدا ہونے کیوں بند ہوگئے۔ اس کا آسان جواب یہ ہے کہ "زوالِ حکومت اور انگریزوں کی معاندانہ کارروائیاں"۔ انگریزوں نے سلطنت مسلمانوں سے حاصل کی تھی، اگر اندیشہ ہو سکتا تھا تو مسلمانوں کی طرف سے ہو سکتا تھا۔ لارڈ ایلن بارو ۱۸ جنوری ۱۸۴۳ء کے خط میں لارڈ ویلنگٹن کو لکھتا ہے۔

میں اس حقیقت سے آنکھیں بند نہیں کر سکتا کہ یہ نسل (مسلمان) بنیادی طور پر ہماری دشمن ہے۔ اس لئے ہماری صحیح پالیسی یہ ہے کہ ہندوؤں کو خوش کیا جائے۔

(Lal Rajput Rai, "Unhappy India" p. 400)

اس لئے انگریزی حکومت کی مشینری نے مسلمانوں کو معاشرہ میں پست، ذلیل اور ناکارہ بنانے کا ایک طویل المیعاد منصوبہ بنایا اس کے اہم اجزا تین تھے۔

۱) مسلمانوں کو مفلس و قلاش بنا دیا جائے ان کا سارا وقت دو وقت کی روٹی حاصل کرنے میں صرف ہو جائے۔ مذہب و سیاست ملک ملت کے اعلیٰ تصورات ان کے ذہنوں سے محو ہو جائیں۔

۲) مسلمانوں کو جاہل اور پسماندہ بنا دیا جائے۔ Resumption Act 1828. کے ذریعہ برصغیر میں سارے اوقاف پر حکومت نے قبضہ کر لیا۔ تمام دینی مدارس کے سرچشمے سوکھ گئے۔ مدارس بند ہو گئے۔ مزید برآں دینی تعلیم کے خلاف اور ملا کے خلاف پروپیگنڈہ کر کے ایک فضا پیدا کر دی تاکہ کوئی صاحب حیثیت خاندان کا فرد ادھر کا رخ ہی نہ کرے۔

۳) جدید مغربی تعلیم کا ڈھانچہ ہندوؤں، عیسائی مشنریوں کی مرضی کے مطابق تیار کیا گیا، اور

مسلمانوں کو دیدہ و دانستہ پیچھے دھکیلا گیا تاکہ وہ آگے نہ بڑھیں۔

اس دور کے بعض فہمیدہ افراد کو انگریزوں کی اس پالیسی کا شعور ہو گیا تھا۔ وہ اس کو "ٹھنڈی چھری" اور "میٹھا زہر" کہتے تھے جیسا کہ سرسید احمد خان نے ان کا قول نقل کیا ہے۔ درحقیقت یہ Slow Poisoning کا طرزِ عمل تھا اور کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ کامیاب نہیں ہوا۔

فارسی نصاب درحقیقت مغل دورِ حکومت کا سول سروس کا نصاب تعلیم و تربیت تھا برطانوی دور میں یہ متروک ہو گیا۔ لارڈ ہارڈنگ نے ۱۱۔ اکتوبر ۱۸۴۴ء کو حکم نامہ جاری کیا اور غیر انگریزی خواں افراد پر ملازمت کے دروازے بند کر دیے۔ ۱۸۶۰ء میں فارسی کو کو ہائی کورٹ میں تبدیل کر دیا اور وہاں بھی انگریزی زبان رائج ہو گئی۔ ۱۸۶۴ء میں قاضی ایکٹ منظور ہوا جس کے تحت مسلمانوں کے شخصی معاملات (طلاق و وراثت وغیرہ) میں مسلمان قاضی کی ضرورت نہیں رہی۔ ان پے در پے حملوں کے بعد مسلمانوں کی حالت یہ تھی کہ بقول سرسید "اب ہائی کورٹ میں جاکر علماء علوم مشرقی (وکلاء) کا حال دیکھو۔ ان کے منہ پر مکھیاں بھنکتی ہیں"۔ (مقالات سرسید احمد خاں، حصہ ہشتم، ص۔ ۴۶۔ مجلس ترقی ادب لاہور۔ ۱۹۶۲ء) افلاس کی مار نے مدارس کو فنا کر دیا اور مسلمانوں کی کمر توڑ دی۔

۱۸۵۷ء کی جنگ میں بھی انتقام انگریزوں نے مسلمانوں سے لیا۔ بقول سرسید:

"غدر کیسا ہوا۔ ہندوؤں نے شروع کیا۔ مسلمان دل جلے تھے وہ بیچ میں کود پڑے۔ ہندو گنگا نہا کر جیسے تھے ویسے ہو گئے مگر مسلمانوں کے تمام خاندان تباہ و برباد ہو گئے (حیات جاوید از الطاف حسین حالی۔ ص ۲۸) ......

۱۸۵۷ کی جنگ آزادی میں بڑے پیمانے پر تباہی ہوئی۔ جنگ کے بعد سات ہزار علماء اور معاملہ فہم سربرآوردہ لوگوں کو انگریزوں نے پھانسی پر چڑھا دیا۔ اس طرح صرف عوام الناس باقی رہ گئے۔ سردارانِ قوم فنا ہو گئے۔ ان جاں گسل حالات کا تقاضا محسوس کر کے سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کے تحفظِ وجود کے لئے کوشش کی ان کو افلاس اور ادبار کے گڑھے سے نکالا اور مولانا قاسم نانوتوی نے مسلمانوں کے دینی اور علمی سرمایہ کو محفوظ کرنے کی کوشش کی، اور دارالعلوم دیو بند قائم کیا۔ انہوں

نے تو فارسی حصہ بھی جوں کا توں محفوظ رکھا مگر ظاہر ہے کہ بدلے ہوئے حالات میں نہ فارسی زبان کی حکمرانی رہی نہ مغلوں کا نظامِ حکومت رہا۔ بتدریج فارسی کی تعلیم گھٹتے گھٹتے اب بالکل ختم ہو گئی۔ اب دینی مدارس میں صرف عربی حصہ باقی رہا اور فارسی حصہ ختم ہو گیا۔ برصغیر کے مسلمانوں کے ہفت صد سالہ نصاب تعلیم کا دنیوی حصہ ختم ہو گیا۔ دینی مدارس میں اب صرف دینی حصہ باقی رہ گیا، اور امتدادِ زمانہ سے اب تو یہ شعور بھی باقی نہیں رہا کہ موجودہ نصاب تعلیم ناقص ہے۔ آدھا ہے۔ اس کا دنیوی حصہ باقی نہیں رہا۔ عام طور پر دینی مدارس میں موجودہ عربی حصہ کو کافی اور وافی سمجھ لیا گیا ہے۔ ان کا نصاب زیادہ تر بلکہ اب تو تمام تر دینی علوم سے متعلق ہے۔ فارسی نصاب کی تعلیم بالکل ختم ہو چکی ہے، جس کا غالب حصہ دنیوی علوم سے متعلق ہوتا تھا۔ جس میں عمرانی علوم، ریاست و حکومت، حکمت و دانائی کی تعلیم ہوتی تھی اس لیے آج کل دینی مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ دینی علوم کے فہم کو حاصل کر لیتے ہیں، لیکن دنیوی علوم سے بالکل کورے ہوتے ہیں۔ ابتدائی شد بد بھی نہیں ہوتی ہے۔ دوسری جانب جدید مغربی طرز کی درس گاہوں میں سارا زور دنیوی علوم پر ہے۔ معاشرتی علوم میں یا طبعی علوم، دنیوی علوم کے دائرہ کار میں گذشتہ دو صدیوں میں وسعت اور عمق کے اعتبار سے انقلاب عظیم برپا ہو چکا ہے۔ علوم و فنون کی ایک نئی دنیا جلوہ گر ہو گئی ہے۔ ادھر حال یہ ہے کہ قدیم دو سو سال والے معاشرتی علوم بھی موجودہ دینی طلبہ کی دسترس میں نہیں ہیں۔ اب صورت حالات یہ بن گئی ہے کہ قدیم مدارس اور جدید کالج ایک دوسرے کے مخالف سمتوں میں سفر کر رہے ہیں۔ دونوں کے درمیان تعلق و ارتباط کے لئے کوئی مشترکہ میدان باقی نہیں ہے۔ در حقیقت جدید کالجوں کے تعلیم یافتہ اصحاب اور قدیم مدارس کے تعلیم یافتہ علماء کی مبلغ علم مختلف ہے۔ جو ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھتے ہیں جو ایک دوسرے کی ذہنیت سے بیگانے اور ناآشنا ہیں۔

ملت اسلامیہ کا یہ بہت بڑا المیہ اور سانحہ ہے کہ برطانوی دور غلامی میں نافذ ہونے والے تعلیمی نظام نے قدیم اور جدید کے درمیان خلیج پیدا کر دی ہے۔ اس کو پاٹے بغیر ملت کی کشتی

بھنور سے باہر نہیں نکل سکتی۔ ملتِ اسلامیہ کے مسائل حل نہیں ہو سکتے اور مزید المیہ اس بات کا ہے کہ اس خلیج کی شدت اور سنگینی کا شعور عام نہیں ہے۔ گویا عوام مسلمان اپنے اصل مرض سے ناواقف ہیں۔ اس لیے مرض کو دُور کرنے کی کوشش جس پیمانہ پر ہونی چاہیے تھی وہ کہیں نظر نہیں آتی۔ وقت کی ضرورت یہ ہے، ملت کا تقاضا یہ ہے کہ کوئی غزالی وقت آگے بڑھے، مغربی علوم کو مسلمان کرے پھر دینی اور دنیوی اجزاء کو ملا کر ایک جدید نصاب تعلیم ترتیب دے اور رائج کرے۔

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے۔

وسطی ایشیاء میں مسلمانوں

پر سوویت استعماریت

اور مسلم حریت پسندوں کی

تحریک مزاحمت کا تحقیقی مطالعہ

ترکستان میں مسلم مزاحمت

آباد شاہ پوری

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد

دینی نصاب تعلیم اور نظم و نسق

پروفیسر عبداللطیف انصاری

نزول قرآن کریم کا آغاز جن آیات مقدسہ سے ہوا ان میں قراۃٔ علم و تعلیم اور قلم و کتاب خصوصیت سے مذکور ہیں۔ جس سے علم کی فضیلت اور عظمت واضح ہوتی ہے۔

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ۔ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۔ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ۔ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۔ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۔

دین کی تعلیم و اشاعت اور تبلیغ اہم ترین فریضہ ہے۔ معلم کامل حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔ انا بعثت معلماً (مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے) اور ارشاد ربانی یتلوا علیہم ایاتہ و یزکیہم و یعلمہم الکتاب والحکمۃ کی روشنی میں قرآن کی تلاوت تزکیہ اور تعلیم کتاب و حکمت آنحضور صلعم کے فرائض نبوت میں سے ہیں۔

ان الدین عند اللہ الاسلام کے مطابق اسلام اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کے آخری پیغمبر ہیں۔ اب نہ کسی دین کا نزول ہوگا اور نہ کوئی نبی مبعوث ہوگا۔ تکمیل دین اور ختم نبوت کے بعد دین حق کی تعلیم و تبلیغ کا فریضہ بحیثیت مجموعی امت مسلمہ کی ذمہ داری ہے۔

خلفاء راشدینؓ اور صحابہ کرامؓ دین اسلام کی تعلیم و تبلیغ کے لیے وقف تھے۔ بعد کے ادوار میں خلفاء اور سلاطین نے بھی فروغ تعلیم کو دینی فریضہ گردانتے ہوئے عظیم الشان درسگاہیں تعمیر کیں اور ان کے انتظام و انصرام کے لیے اوقاف و معافیات کا نظام قائم کیا۔ اسلامی نظام تعلیم کا ہمیشہ

سے، ہی یہ طرہ امتیاز رہا ہے کہ تعلیم ابتداء سے انتہا تک بالکل مفت دی جاتی رہی ہے۔ طلباء کو رہائش خوراک اور کتب وغیرہ کی تمام سہولتیں مفت فراہم کی جاتی ہیں اور ان سے کوئی فیس نہیں لی جاتی۔

برعظیم پاک وہند میں انگریزی تسلط سے قبل کاروبار حکومت فارسی زبان میں ہی چلتا تھا اور دینی درسگاہوں کے فارغ التحصیل ہی دینی خدمات کے ساتھ ساتھ حکومت کے تمام شعبوں میں نہایت کامیابی سے فرائض سرانجام دیتے تھے اور درس نظامیہ کا نصاب بنیادی طور پر "سول سروس" کا نصاب تھا۔ مگر انگریزوں نے ملک پر تسلط حاصل کرتے ہی آہستہ آہستہ فارسی اور عربی زبان کو حکومت کے زیر اہتمام چلنے والے تعلیمی اداروں سے نکال کر ان کی جگہ انگریزی زبان کو رائج کرنے کے اقدامات شروع کر دیے۔

ان حالات میں دینی اور ملی حمیت سے سرشار علماء حق نے ایک طرف تو دینی درسگاہوں کو جدید علوم اور انگریزی زبان وتہذیب سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی اور دوسری طرف ان تمام مضامین کو بتدریج نصاب سے خارج کرنے کی پالیسی شروع کر دی۔ جن سے طلباء میں نظام حکومت کے مختلف شعبوں میں خدمات سرانجام دینے کی اہلیت پیدا ہوتی تھی۔

اس صورت احوال کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابتداء زمانہ سے علوم دینیہ کی درسگاہوں سے فارغ التحصیل طلباء دینی علوم پر بالغ نظر اور دسترس رکھنے کی بناء پر دینی شعبہ جات کی محافظت کی خدمات تو بطریق احسن سرانجام دیتے ہیں۔ مگر عصری علوم وفنون سے کسی حد تک ناواقف ہونے کے سبب وقت کا ساتھ دینے سے قاصر رہتے ہیں۔

وطن عزیز پاکستان میں اسلامی نظام حیات کے قیام کے پیش نظر شدت سے محسوس کیا جا رہا ہے کہ علوم دینیہ کی درسگاہوں کے نصاب تعلیم اور نظم ونسق اور نظام کے دیگر پہلوؤں کا جائزہ لے کر اس انداز سے استوار کیا جائے کہ ان اداروں سے فارغ التحصیل ہونے والے طلباء کو اسلام کے نصب العین کے مطابق معاشرے کے تمام شعبہ جات کی رہنمائی کے قابل

بنایا جاسکے اور طلباء کی ہمہ جہتی تربیت اس نہج پر کی جائے کہ وہ اخلاق و کردار کے لحاظ سے بھی اور ذہنی صلاحیتوں کے اعتبار سے بھی مغربی طرز کے نظام تعلیم سے فارغ ہونے والوں کی نسبت فائق تر ہوں تاکہ اسلامی ریاست کے مختلف شعبوں کی بطریق احسن رہنمائی کا فریضہ سرانجام دے سکیں۔

نصاب تعلیم میں اصلاح کے لئے راہنما اصول

۱۔ رائج الوقت دینی مدارس کے نصاب میں زیادہ تر زبانی تعلیم دی جاتی ہے اور درس و تدریس کے سلسلہ میں کتب پڑھنے اور پڑھانے تک تدریسی سرگرمیوں کو محدود کیا جاتا ہے اور تحریر پر زیادہ زور نہیں دیا جاتا جس کی بناء پر درس نظامیہ سے فارغ التحصیل طلبا تحریر میں کمزور پائے گئے ہیں۔

تجویز ہے کہ دینی درسگاہوں میں تحریری مشق پر زیادہ توجہ دی جائے۔

۲۔ درس نظامیہ کے رائج الوقت نصاب میں مندرجہ ذیل علوم کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔

الف : منطق و فلسفہ

ب : علم الکلام و العقائد

ج : صرف و نحو

منطق فلسفہ علم الکلام و عقائد کے مضامین کے نصاب کی مقدار کم کر کے اصطلاحات اور ابتدائی کتب پر ہی اکتفا کیا جائے۔

صرف و نحو کی قدیم کتب ترک کر کے جدید طریقہ ہائے تدریسی پر مبنی کتاب کو نصاب میں شامل کیا جائے۔ جن میں مشق و تمارین بھی دی گئی ہوئی ہیں اور مشق و تمارین اور ترجمتین کی مقدار اس انداز سے بڑھا دی جائے تاکہ صرف و نحو کے اصولوں سے واقفیت کے ساتھ ساتھ عربی زبان میں علمی استعداد بھی پیدا ہو سکے۔ اس طرح صرف و نحو کی قدیم مروجہ کتب کی ضرورت خود بخود

ختم ہو جائے گی۔

۳۔ عربی زبان و ادب کی تدریس کا اہتمام اس طرح کیا جائے کہ طلباء کو عربی تحریر و تقریر پر قدرت حاصل ہو جائے۔ اس مقصد کے لیے جدید طریقہ ہائے تدریس کو اپنایا جائے اور جدید طریقہ ہائے تدریس پر مبنی کتب شامل نصاب کی جائیں۔

۴۔ اسلامی نظام حیات کے مختلف پہلوؤں پر مبنی لٹریچر تمام درجات میں طلباء کی ذہنی استعداد کو مدنظر رکھتے ہوئے شامل نصاب کیا جائے تاکہ طلباء اسلام کو بحیثیت دین اور نظام حیات کے بخوبی سمجھ سکیں۔

۵۔ فقہ اسلامی کا رائج شدہ نصاب اس کی تدریس اور فارغ ہونے والوں میں اتنی استعداد نہیں ہوتی کہ انہیں منصب قضاء پر مامور کیا جا سکے۔

اس منصب کے دو پہلو ہیں:

الف: فقہی جزئیات پر تفصیلی نظر

ب: عملی تربیت برائے شعبہ قضاء

الجز (ا) سے متعلقہ مضامین/علوم کی تعلیم کا اہتمام مروجہ نصاب تعلیم کے دوران ہی ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ فقہ حنفی کی موجودہ مستند متداول کتب کو بالغ نظری کے ساتھ مکمل کرنے کے علاوہ بقیہ آئمہ ثلاثہ کی فقہ سے متعلق بھی واقفیت بہم پہنچائی جائے۔ جس کے لیے ذیل کتب بالخصوص "بدایۃ المجتہد، الفقہ علی المذاہب الاربعہ" اور اس "فقہ السنۃ" نوع کی دیگر کتب کو شامل نصاب کیا جا سکتا ہے۔ اگر ضروری ہو تو اس کے لیے مدت تعلیم کو بڑھانا بھی مناسب ہوگا۔

دوسرے "ب" جزو پر عملی تربیت کے لیے انہی خطوط پر اور عملی تربیت کا اہتمام کیا جائے جس طرح ایل ایل بی کے طلباء کے لیے قانون کے کالجز میں کیا جاتا ہے تاکہ طلباء کو فریقین کی طرف سے دلائل پیش کرنے سننے سمجھنے اور فیصلہ تحریر کرنے کی عملی تربیت کا موقع مل سکے۔

آزاد کشمیر میں ۱۹۷۳ء قاضیوں کا تقرر عمل میں لایا گیا ہے لیکن عملی طور پر محسوس کیا گیا ہے

کہ قاضیوں کے لیے تقرری سے قبل علم فقہ کے ساتھ قضاء کی عملی تربیت بھی ضروری تھی۔

۶) درسگاہوں میں فنی اور پیشہ وارانہ نوعیت کے مندرجہ ذیل شعبہ قائم کئے جائیں۔

۱) طب

۲) کتابت

۳) دیگر موزوں اور مناسب ٹیکنیکل مضامین کے بارے میں بھی غور کیا جاسکتا ہے۔

۷) اندرونی امتحانات کا انعقاد اور نتائج کی ترتیب و تدوین

طلباء کی تعلیمی ترقی کو جانچنے اور مسابقت کا جذبہ پیدا کرنے نیز درس و تدریس کی سرگرمیوں میں تنظیم کے لیے ضروری ہے کہ ہر سہ ماہی کے اختتام پر تحریری امتحان منعقد کیا جائے۔ امتحان میں طلباء کی کارکردگی کا باضابطہ ریکارڈ مرتب کیا جائے۔ طلبہ کی تعلیمی ترقی کی رپورٹ والدین کو بھی ارسال کی جائے اور تعلیمی سال کے آخر میں سالانہ امتحان کا انعقاد کیا جائے۔

درجات نصاب تعلیم (دینی مدارس کی درجہ بندی)

پاکستان کے ہر شہر اور گاؤں میں کسی نہ کسی نوعیت کے دینی تعلیم کے ادارے قائم ہیں جن میں قرآن حکیم ناظرہ سے لے کر درس نظامی کی تکمیل تک تعلیم کا انتظام ہے لیکن سوئے اتفاق کہ ان مدارس کے ناموں کے ذریعہ یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ ان میں کس درجہ تک تعلیم دی جاتی ہے ابتدائی درجہ کے مدارس بھی اپنے نام کے ساتھ "جامعہ" اور "دارالعلوم" کے الفاظ استعمال کرتے ہیں جو موجب اشتباہ ہیں۔ جبکہ اس کے مقابل میں سرکاری تعلیمی اداروں میں درجات کو اس طرح معنون کیا گیا ہے کہ صرف نام لینے سے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس ادارہ میں پرائمری تک تعلیم ہوتی ہے یا مڈل یا میٹرک و اعلیٰ ہذا القیاس عربی مدارس میں درجات کے عدم تعین کی وجہ سے ان کی مالی امداد میں مشکلات کا سامنا ہوتا ہے بعض ادارے اپنے نام سے بہت عظیم معلوم

ہوتے ہیں ۔ حالانکہ عملاً ان کی حیثیت ابتدائی ہوتی ہے جبکہ بعض دوسرے ادارے جن میں انتہائی کتب کی تدریس ہوتی ہے اور اقامتی بھی ہوتے ہیں لیکن ایک نام سے ابتدائی درسگاہ ہونے کا شبہ ہوتا ہے اس لیے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دینی تعلیم کے تمام اداروں کو درجات میں تقسیم کر دیا جائے ۔

مختلف نوعیت کے مدارس کے لئے بزیل نام تجویز کئے جاتے ہیں

۱ - مدارس تدریس القرآن

الف) مدرسہ ناظرہ قرآن سے مراد وہ مدرسہ ہے جس میں صرف ناظرہ قرآن پڑھایا جاتا ہو ۔

ب) مدرسہ تجوید القرآن سے مراد وہ مدرسہ ہے جس میں قرآن کریم کو تجوید کے ساتھ پڑھانے کا انتظام ہو ۔

ج) مدرسہ تحفیظ قرآن سے مراد وہ مدرسہ ہے جس میں قرآن کریم حفظ کرانے کا اہتمام ہو ۔

۲ - مدارس علوم دینیہ

الف) مدرسہ تحتانی سے مراد وہ مدرسہ ہے جسمیں قرآن کریم ناظرہ حفظ و تجوید کے علاوہ عربی و علوم دینیہ کی ابتدائی کتب کی تدریس کا انتظام بھی کیا گیا ہو ۔

ب) مدرسہ وسطانی سے مراد وہ مدرسہ ہے جس میں درس نظامی کی ابتدائی مروجہ کتب کی تعلیم و تدریس کا انتظام ہو ۔

ج) مدرسہ فوقانی سے مراد وہ مدرسہ ہے جس میں موقوف علیہ تک کتب یا فاضل عربی کا نصاب پڑھایا جاتا ہے ۔

د) دار العلوم سے مراد وہ ادارہ ہے جس میں درس نظامی کی مکمل تدریس بمعہ دورہ

تفسیر حدیث کا انتظام ہو اور اس کا الحاق پاکستان کے وفاق المدارس تنظیم المدارس اور رابطۃ المدارس وحدۃ المدارس السلفیہ پاکستان یا رابطہ المدارس العربیۃ میں سے کسی ایک ادارہ کے ساتھ ہو۔

۵) جامعہ سے مراد وہ تعلیمی ادارہ ہے جس میں مروجہ درس نظامی کی تکمیل کے بعد تخصص کا انتظام بھی ہو۔

سندات کا اجراء اور معاملہ سندات

کسی نظام تعلیم کے تحت امتحانات کے انعقاد اور ان میں طلباء کی شرکت کا اہم مقصد حصول سند ہوتا ہے۔ سند اس امر کا ثبوت ہوتی ہے کہ اس کا حامل کس درجہ کا تعلیم یافتہ ہے۔ عام سکولوں اور کالجوں میں زیر تعلیم طلبا جب تعلیم کا سلسلہ منقطع کرتے ہیں یا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے ہیں تو اپنے سکول یا کالج سے سکول/کالج چھوڑنے کا سرٹیفکیٹ حاصل کر کے کسی دوسرے تعلیمی ادارہ میں داخلہ لے سکتے ہیں۔ اسی تعلیمی سرٹیفکیٹ کی بناء پر روزگار حاصل کرنے میں بھی سہولت حاصل ہوتی ہے۔

علوم دینیہ کی درسگاہوں کو بھی تعلیمی سلسلہ منقطع کرنے والے طلباء کو مدرسہ چھوڑنے کا سرٹیفکیٹ جاری کرنا چاہیے۔ جس میں طلباء کی تعلیمی استعداد کا مناسب انداز میں اندراج ہونا چاہیے۔

مدارس کی عمومی بہبودی کی تجاویز

۱- مدرسہ میں داخل ہونے والے ہر طالب علم کا مفصل ریکارڈ مرتب کیا جائے۔ جس میں تاریخ پیدائش اور رجسٹریشن کے دیگر لوازم کا اندراج ضرور کیا جائے۔ طلباء کی باقاعدہ حاضری لی جائے۔ اس سلسلہ میں ثانوی مدارس کی بجائے کالجوں کا طریقہ اپنایا جائے یعنی بجائے ایک دفعہ حاضری لینے کے ہر استاد اپنی جماعت کی حاضری لگائے تاکہ معلوم ہو کہ کون سا طالب علم جماعت سے غیر حاضر رہتا

ہے اور کونسا حاضری کا پابند ہے۔

۲۔ طلباء کی ریاضت جسمانیہ اور ورزش کا بھی اہتمام کیا جائے۔ تاکہ تعلیمی اور ذہنی ترقی کے ساتھ ساتھ جسمانی نشو و نما پر بھی بخوبی توجہ دی جا سکے۔ طلباء کی جسمانی صحت کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ اس مقصد کے لیے ایک قابل ڈاکٹر کی خدمات حاصل کر لینا چاہئیں۔ ہر مہینے ہر طالب علم کا طبی معائنہ کرتا رہے اور اس کے ذاتی کارڈ پر اس کا اندراج کرتا رہے۔

۳۔ دار الاقامہ میں بڑے بڑے کمرے بنوانے کے بجائے ایسے چھوٹے چھوٹے کمرے زیادہ تعداد میں بنوائے جائیں۔ جن میں چار سے آٹھ طلبہ تک اقامت اختیار کر سکیں۔

۴۔ مطبخ اور کھانے کے کمرے ایک طرف تعمیر کئے جائیں اور مطبخ کی صفائی اور حفظان صحت کے اصولوں کے مطابق دیکھ بھال ہونی چاہیے۔

۵۔ طلباء کو تین وقت کھانا ضرور ملنا چاہیئے۔ یعنی ناشتہ ظہرانہ اور عشائیہ اور کھانا وقت مقررہ پر ملنا چاہیے اور طلباء کی عزت نفس کو برقرار رکھنے کے لیے انہیں مطبخ کا پکا ہوا کھانا ہی کھلانا چاہیے۔ گھروں سے مانگ کر کھانے لانے اور قرآن خوانی کے معاوضے کے طور پر کھانا کھانے کی ممانعت ہونی چاہیے۔

۶۔ طلباء میں عزت نفس اور متانت پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ملک کے عام پبلک سکولوں کی طرح درس نظامیہ کے طلباء کے لیے بھی یونیفارم کے انداز میں ایک جیسا لباس مقرر کیا جائے۔ جس کے لئے کوئی سادہ با وقار لباس تجویز کیا جا سکتا ہے۔ طلباء کا لباس بہر صورت صاف ستھرا ہونا چاہیے۔

دینی مدارس میں عملی اصلاحی اقدامات

فرید احمد پراچہ

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ کسی بھی اجتماعیت کی اصل روح اس کے ادارے ہوتے ہیں اداروں کی زندگی معاشرت کو زندگی کی حرارت اور ان کی حرکت و فعالیت معاشرے کو توانائی و تابندگی فراہم کرتی ہے جب ادارے مضمحل ہوتے ہیں اور ان سے زندگی کی علامتیں رخصت ہو جاتی ہیں تو پھر معاشرہ بھی ـــــ آہستہ روی سے اجتماعی ہلاکت کی راہوں پر چل نکلتا ہے۔ اسلامی معاشرت کی ہیئت ترکیبی میں خاندان، مسجد اور ریاست کے ساتھ ساتھ اہم ترین عنصر مکتب ہے۔ یہ شروع ہی سے اسلامی معاشرت کا اہم جزو رہا ہے اور اسے ہر دور میں کسی نہ کسی انداز میں قوت حاکمہ کی حیثیت حاصل رہی ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ ان دینی مدارس نے تدوین علم کے فرائض بھی انجام دیے اور تدریس علم کے بھی۔ اشاعت علم و عرفان کا ذریعہ بھی بنے اور تزکیہ و تربیت کا سبب بھی۔ کبھی یہ ادارے محض علمی جامعات تھے۔ کبھی یہ تحقیقی مرکز بنے۔ کبھی انہوں نے سائنسی رصدگاہوں کی شکل اختیار کی۔ کسی دور میں دینی مدارس ہی ملٹری اکیڈیمیاں تھے اور کبھی دور بادشاہت کے ظلمت کدوں میں یہی دینی مدارس ملت اسلامیہ کی مؤثر حزب اختلاف کی صورت میں مینارہ نور تھے۔ فتنۂ تاتار ہو یا سقوط بغداد۔ عروج امت کا دور ہو یا زوال اندلس کا سانحہ سیاسی غلبے کا زمانہ ہو یا اجتماعی غلامی کا عرصہ نحوست سقوط مشرقی پاکستان ہو یا جہاد افغانستان کے روح پرور مواقع۔ ہر دور اور ہر مرحلہ

پر ملت اسلامیہ کی رہنمائی و نمائندگی کا فریضہ بھی ادارے انجام دیتے رہے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں بھی یہ دینی مدارس ہی تھے جنہوں نے ترویج علم و عرفان کے ساتھ ساتھ قیادت ملک و ملت کی ذمہ داری بھی ادا کی۔ غیر ملکی آقاؤں کے دور غلامی میں جب آج کے برسر اقتدار سیاسی خاندانوں کی پہلی نسل انگریز کی فوج کو سپاہی فراہم کر رہی تھی۔ دینی مدارس کے طلبہ و اساتذہ نان جویں پر گذارہ کر کے انگریز کی گولیاں کھا رہے تھے اور آزادی وطن کی جنگ لڑ رہے تھے لیکن پھر یہ بھی ایک ناقابل تلافی سانحہ ہے کہ اسنتنے عظیم الشان تاریخی کردار ادا کرنے والے ادارے آہستہ آہستہ غیر مؤثر ہوتے چلے گئے حکمرانوں کی ساحری نے انہیں عین میدان جہاد میں سلا دیا اور دشمنوں کی سازش نے انہیں افتراق و انتشار اور فروعات و روایات میں الجھا دیا۔ اس طرح ان مدارس کی ایک تعداد اس کردار کو ادا کرنے سے قاصر رہی جو ان اداروں کا اصل مقصد وجود ہے۔

تاہم حالات میں مایوسی کی ان علامتوں کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دینی ادارے "میرا سبو چہ غنیمت ہے اس زمانے میں" کے مصداق اپنی تمام تر کوتاہیوں اور رکاوٹوں کے باوجود ابھی تک معاشرے میں علم دین کی شمع روشن رکھے ہوئے ہیں اور ان کے ہی دم قدم سے دین کی علامتیں زندہ و تابندہ ہیں۔ تاہم یہ امر واقعہ ہے کہ آج الحاد و بے دینی کی قوتیں جس تیز رفتاری سے غالب آ رہی ہیں نیکی کی قوتیں اس کے مقابلہ میں اتنی ہی غیر فعال غیر منظم اور مرعوب و منتشر ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ دینی و دنیاوی دونوں طرح کے تعلیمی اداروں میں انقلابی تبدیلیاں عمل میں لائی جائیں۔ اسلامی نظام کی صورت میں مثالی تعلیمی انقلاب کی منزل ابھی دور ہے اور پھر اسلامی نظام تعلیم کے نفاذ کے باوجود دینی مدارس کی علیحدہ ضرورت و اہمیت کسی صورت ختم نہیں ہو سکتی جس طرح میڈیکل کالج انجنیئرنگ یونیورسٹیاں کامرس کالجز ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹس وغیرہ قائم رہیں گے اور ان کے نصاب و رجحانات تبدیل کر دیئے جائیں گے اسی طرح آئیڈیل اسلامی نظام تعلیم میں بھی دینی مدارس قائم رہیں گے اور معاشرے کو متوازن فکر عالم دین اور آئمہ حضرات فراہم کرتے رہیں گے دینی مدارس کا بنیادی مقصد ہی داعی و مبلغ تیار کرنا اور آئمہ و خطباء فراہم کرنا ہے چونکہ یہ مقاصد بذات خود نہایت ارفع و

داخلی ہیں بلکہ امت مسلمہ کی بعثت کی غرض وغایت رہی ان مقاصد کی تکمیل ہے اس لیے ناگزیر ہے کہ دینی مدارس کے نظام ونصاب میں ایسی بنیادی انقلابی تبدیلیاں عمل میں لائی جائیں جن کے بعد ان ہی اداروں سے عصری قیادت کی اہلیت رکھنے والے علمائے کرام میسر آسکیں اور ایسے حاملان علم فارغ ہوں جو پیچ وتاب رازی اور سوز وساز رومی کے امین اور وراثت انبیاء کے اہل ہوں۔ نصاب ونظام میں ان تبدیلیوں کی ترتیب وار نشاندہی سے پہلے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ان نکات پر بھی کچھ اظہار خیال کروں جن کی طرف منتظمین سیمینار نے توجہ دلائی ہے۔

درس نظامی میں تعلیمی انحطاط ہمارے ملک کے ہمہ گیر تعلیمی انحطاط ہی کا ایک حصہ ہے تعلیم سے توجہ ہٹانے والے عوامل میں تعلیم کی عمومی ناقدری۔ مادیت پرستی کی حوصلہ افزائی، روح عصر (Spirit of the Age) کے تقاضے بے روزگاری کے بڑھتے ہوئے منحوس سائے، عمومی اخلاقی انحطاط، زوال پذیر معاشرتی اقدار، ناقص تعلیمی پالیسیاں وغیرہ سرفہرست ہیں۔ ان عوامل کی اصلاح اور ملک میں علم ومعلم کا وقار بلند کرنے سے جب عام تعلیم کا معیار بلند ہوگا تو درس نظامی کے تعلیمی معیار میں بھی خوشگوار تبدیلی وقوع پذیر ہوگی جب جدید درس گاہیں اپنی بالادستی [illegible] قبول عام اور حکومتی سرپرستی کے باوجود عصری قیادت کے تقاضوں کو پورا نہیں کر رہیں تو دینی درس گاہیں اپنی کسمپرسی مغلوبیت، غیر مقبولیت استحقار اور حکومتی سرپرستی سے محرومی کی حالت میں کیسے قیادت کے لیے رجال وابطال مہیا کر سکتی ہیں۔

دینی مدارس کے اجراء وآغاز پر کسی بھی طرح کی پابندی عائد کر کے کسی صورت معقول ومطلوب نتائج سامنے نہ آسکیں گے اس لیے کہ دینی مدارس کھولنا اور چلانا ویسے ہی کار رواروہے' اور اسے بلاشبہ ان ذلک من عزم الامور میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ نامساعد حالات حوصلہ شکن ماحول' پریشان کن معاشی احوال، تدریسی تنظیمی اور فراہمی وسائل کی سہ پہلو ذمہ داریوں کی بیک وقت ادائیگی طعن وطنز اور تحقیر وتنقید کی عمومی فضا کے باوجود جو حضرات ان اداروں کو چلا رہے ہیں وہ یقیناً کار جہاد سرانجام دے رہے ہیں اور انتہائی قابل قدر ہیں۔ ملک میں جو ادارے ایک طویل

عرصہ سے قائم اور روبہ عروج ہیں ان کی تعداد زیادہ اور محض دنیاوی مقاصد کے تحت کام کرنے والے اداروں کی تعداد انتہائی قلیل ہے ۔ اس قلیل تعداد کے پیش نظر کثیر تعداد پر کسی بھی طرح کی پابندی عائد کرنا قرین مصلحت نہیں جب دنیوی تعلیم کے مدارس کھولنے کے لیے کوئی قواعد و شرائط نہیں اور ایسے مدارس ہر گلی کوچے سے موسم برسات کی کھمبیوں کی طرح اگ رہے ہیں تو پھر دینی مدارس کے اجراء کے لیے قواعد و شرائط کی پابندی بھی نہیں ہونی چاہیے کسی بھی طرح پابندیوں کی صورت میں ہم ان مدارس سے بھی محروم ہو جائیں گے جو اس وقت کسی نہ کسی انداز میں موجود ہیں۔

تاہم مختلف مسالک کے دینی مدارس کی جو اجتماعی تنظیمیں اس وقت وفاق المدارس ، تنظیم المدارس رابطۃ المدارس وغیرہ کی صورت میں کام کر رہی ہیں۔ وہ ایسے قواعد و ضوابط ترتیب دے سکتی ہیں جن کے تحت غلط مقاصد کے لیے کام کرنے والے اداروں کا محاسبہ کیا جا سکے، جہاں تک موجودہ صورت حال میں دونوں نظام ہائے تعلیم (جدید و قدیم) کی مکمل ہم آہنگی کا تعلق ہے تو یہ ناممکن اور ناقابل عمل ہے۔ اس لیے کہ یہ دونوں نصاب اپنے طور پہ اتنے مکمل وسیع اور مشکل ہیں کہ عمومی ذہانت کے طالب علم کے لیے کسی ایک نصاب کی ہی تکمیل دشوار ہے۔ چہ جائیکہ دونوں نصاب مکمل گہرائی و گیرائی کے ساتھ حاصل کیے جائیں سطحی تعلیم یا امتحانی نقطہ نظر سے تو شاید تیاری ممکن ہو جائے لیکن علم کے نقطہ نظر سے یہ تجویز کسی صورت قابل عمل اور قابل ترجیح نہیں۔

مستحسن صورت یوں ہے کہ درس نظامی کے نصاب میں موثر تبدیلیاں عمل میں لائی جائیں اور یہاں بعض جدید علوم کو متعارف کرایا جائے ۔ اسی طرح جدید مدارس میں بی اے تک مکمل قرآن مجید با ترجمہ، اسلامیات اور عربی زبان کی تعلیم لازم قرار دی جائے۔ مڈل کی سطح تک نصاب تعلیم یکساں ہو سکول میں جو تعلیم مڈل تک پڑھائی جائے اس میں قرآن حدیث اور عربی کے مضامین رکھے جائیں عربی کی تعلیم میں گرائمر اور صرف و نحو کی کتب بھی شامل کی جائیں۔ مڈل کے بعد عام تعلیم کے طلبہ سکولوں کالجوں یا پیشہ وارانہ اداروں میں چلے جائیں گے اور درس نظامی حاصل کرنے والے طلبہ دینی مدارس میں داخلہ حاصل کریں گے درس نظامی کا یہ نصاب آٹھ سالوں پر محیط ہو اس میں طلبہ کو اصلاً دینی تعلیم مکمل توجہ و

محنت سے پڑھائی جائے اور ضمناً مڈل کے بعد تسلسل کے ساتھ انگریزی کی تعلیم جاری رکھی جائے یہ طلبہ پہلے چار سال تو دنیوی تعلیم کا کوئی امتحان نہ دیں اور مکمل توجہ دینی علوم کی تحصیل پر صرف کریں، چار سال کے بعد ان کو میٹرک کا امتحان دلوایا جائے، پھر مزید چار سال دینی علوم کی تکمیل کریں، اس طرح مڈل پاس طالب علم آٹھ سالوں میں مکمل عالم دین بن جائے گا، اور دنیاوی لحاظ سے میٹرک بھی ہوگا۔ مزید برآں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے فیصلہ کے مطابق اسے ایم اے اسلامیات کے برابر بھی سمجھا جائے گا۔

یہاں میں یہ واضح کردوں کہ میں دینی مدارس میں میٹرک سے زائد دنیاوی تعلیم کا اہتمام کرنے کا بوجوہ مخالف ہوں اولاً تو طلبہ کی زیادہ توجہ دنیاوی تعلیم پر ہو جائے گی، اور دینی تعلیم کی تحصیل محض ضمنی حیثیت اختیار کر جائے گی۔ دوم طلبہ کسی ایک بھی علم میں دسترس حاصل نہ کر سکیں گے اور آدھا تیتر آدھا بٹیر والا معاملہ ہوگا۔ سوم فراغت کے بعد طلبہ مساجد و مدارس کی بجائے سکول و کالج یا دیگر ملازمتوں کا رخ کریں گے اور اس طرح مساجد کے لیے آئمہ و خطباء کی مطلوبہ تعداد دن بدن کم ہوتی چلی جائے گی اور اگر آئمہ و خطباء میسر بھی آئیں گے تو وہ علم دین سے کماحقہ آگاہ نہ ہوں گے، محض مقرر و خطیب ہوں گے۔ چہارم دین کی خدمت کرنے کا خالص جذبہ اور تبلیغ و دعوت کے فریضہ کی ادائیگی کی فکر بھی مفقود ہوتی چلی جائے گی۔

جہاں تک درس نظامی کے نصاب میں تبدیلیوں کا تعلق ہے تو یہ ایک ایسا موضوع ہے جس کی اہمیت و افادیت سے کسی کو انکار نہیں اور اس امر پر قریباً اتفاق رائے ہے کہ درس نظامی کے نصاب میں بعض تبدیلیاں عمل میں لائی جائیں۔ اصولاً تو ان تبدیلیوں کا فیصلہ علمائے کرام کا کوئی بورڈ ہی کر سکتا ہے۔ تاہم ایک طالب علم کی حیثیت سے میں نے جو کچھ محسوس کیا ہے تجاویز کی شکل میں حضرات علمائے کرام کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ ان تجاویز سے پہلے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اجمالاً اس تاریخی تسلسل کا تذکرہ کروں جو دینی مدارس میں نصاب تعلیم کو حاصل رہا ہے۔ عہد نبوی میں تعلیم کا تعلق قرآن و سنت رسول اللہؐ سے تھا اور اس زمانے میں اہل علم سے مراد ہی قرآن و حدیث کے عالم لیے جاتے تھے، پھر جب مکہ اور مدینہ کے علاوہ کوفہ، دمشق بغداد اور فسطاط بھی علمی مراکز بن گئے۔ تو نصاب تعلیم میں قرآن و حدیث

کے علاوہ فقہ اور قواعد وادب عربی بھی شامل ہوگئے۔ عراق کی ہی درس گاہوں میں امام ابو حنیفہ اوران کے صاحبین کے ہاتھوں احکام شرعیہ کی تدوین کا اہم کام انجام پایا اس مرحلہ پر معانی و بیان اور تجوید وتفسیر کے علوم کا آغاز ہوا۔ حضرت سعید بن المسیب حدیث وتفسیر کے علاوہ اپنے حلقہ درس میں اشعار پر بھی بحث کرتے تھے۔ الطبری کے بیان کے مطابق انہوں نے جامع عمرو بن عاص قاہرہ میں الطرماح کی نظموں کو املا کرایا۔

جامعہ بنی امیہ دمشق جامع ابن طولون وغیرہ میں بھی اسی نصاب کے مطابق تعلیمی سلسلہ جاری رہا۔ اموی دور کے نظام تعلیم میں علوم وفنون کے لیے تالیف وتصنیف اور ترجمے کا سلسلہ قائم ہوا۔ اساتذہ و طلبہ کے لیے وظائف مقرر کیے گئے۔ زبانی تعلیم کے علاوہ املا کا طریقہ بھی رائج کیا گیا۔

عباسی دور میں دینی تعلیم نے زیادہ منظم صورت اختیار کی اور اسے حکومت کی سرپرستی صرف مالی وانتظامی انداز کی ہی نہیں علمی انداز کی بھی حاصل ہوگئی۔ اسی دور میں یونانی فلسفہ شامل نصاب ہوا۔ چوتھی صدی ہجری کے اواخر میں مدارس کے لیے علیحدہ اور مستقل عمارت بنانے کی ابتداء ہوئی۔ پہلی عمارت نیشاپور میں ناصرالدولہ نے امام ابوبکر محمد بن حسبن کے لیے بنائی۔ نظام الملک طوسی نے اپنی وزارت کے دوران نیشاپور میں ایک مدرسہ امام الحرمین کے لیے تعمیر کرایا تھا غرضیکہ ایک طویل عرصہ تک تعلیم کا مطلب صرف دینی تعلیم خیال کیا جاتا تھا۔ پھر امتداد زمانہ سے نصاب تعلیم میں قرآن وحدیث کے علاوہ دیگر علوم اسی طرح شامل ہوتے گئے تھے کہ کل جزو بن گیا اور جزو پھیل کر کل بن گئے۔

برصغیر پاک وہند میں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہی دینی مدارس کا آغاز ہوگیا۔ ابتدائی دور میں منصورہ (سندھ) اور ملتان اسلامی علوم کے مراکز تھے۔ اس زمانے میں بھی نصاب تعلیم میں قرآن، تفسیر، حدیث، فقہ عربی ادب اور تاریخ کے مضامین شامل تھے۔ غزنوی دور میں لاہور پونے دو سو سال تک علماء وفضلا کا مرکز رہا ہے۔ غوری خاندان کے عہد میں یہ حیثیت اجمیر کو حاصل رہی ہے اور یہاں مساجد و مدارس قائم ہوئے، خاندان غلامان (۱۲۰۶ - ۱۲۸۷ء) کے عہد میں بختیار خلجی نے بنگال میں رنگپور کا شہر آباد کیا اور یہاں دینی مدارس قائم کیے۔ التمش نے دہلی اور بدایوں میں علمی مراکز

استوار کیے۔ ان تمام ادوار میں نصاب تعلیم میں غالب قرآن و حدیث کے علوم ہی رہے اور عربی زبان کو خصوصی اہمیت حاصل رہی۔ سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء نے اپنی خانقاہ میں ایک مختصر لیکن جامع یک سالہ نصاب جاری کیا جس میں قرآن مجید باترجمہ اور قدوری کو اہمیت حاصل رہی۔ فیروز شاہ نے ۷۵۳ ہجری میں فیروز آباد اور دہلی میں مدارس قائم کیے۔ اسی طرح لودھی خاندان (۱۴۵۱ تا ۱۵۲۶ء) کے عہد میں ہندوؤں نے بھی ان مدارس سے تعلیم حاصل کرنا شروع کی اور یوں نصابِ تعلیم میں فارسی زبان کی تدریس کو اولیت اور دینی علوم کو ثانوی حیثیت حاصل ہونے لگی۔ سلاطین مغلیہ نے بھی ملک بھر میں دینی مدارس کو فروغ عطا کیا۔ بابر نے دہلی میں جو مدرسہ قائم کیا اس کے صدر مدارس شیخ حسن تھے۔ اس موقع پر نصاب میں علم ہئیت اور جغرافیہ بھی شامل کیے گئے۔

ہمایوں نے دہلی، شیر شاہ سوری نے پٹیالہ اور اکبر نے فتح پور سیکری میں مدارس قائم کیے۔ عہد جہانگیری میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے دہلی کو ہمیشہ کے لیے علوم دین کا دارالسلطنت بنادیا۔ ان کے نصاب میں قرآن و حدیث مبارکہ کو خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ خود انہوں نے ایک سو سے زیادہ کتب تصنیف کیں، جن میں سب سے زیادہ مشہور مشکوۃ کی عربی اور فارسی شرحیں ہیں۔ شاہجہان (۱۶۴۸-۱۶۵۹ء) کے عہد میں دلی کی جامع مسجد کے ساتھ دارالبقاء کے نام سے مدرسہ موجود تھا۔ جہاں مفتی صدرالدین آزردہ تعلیم دیتے تھے۔ عہد شاہجہانی میں سیالکوٹ میں ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کا مدرسہ زیادہ مشہور تھا اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں لکھنؤ میں مدرسہ فرنگی محل کی بنیاد پڑی۔ مدرسے کے بانی ملا نظام الدین تھے جن کے انتساب سے درس نظامی مشہور ہوا۔ اس نصاب میں نحو، منطق و فلسفہ فقہ اور اصول فقہ پر خاص زور دیا گیا ہے۔ اس نصاب سے پہلے مغلیہ سلطنت کے زوال تک ہندو مسلمان اکٹھے عام مکاتب میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اس نصاب میں زیادہ تر کتب فارسی مثلاً پندنامہ عطار، کریما، مامقیاں، اخلاق محسنی، گلستان، بوستان، سہ نثر ظہوری، اخلاق ناصری، سکندر نامہ، یوسف زلیخاں وغیرہ کتابیں شامل تھیں۔ اس کے علاوہ ابتدائی تعلیم میں خوشخطی، نوشت و خواند اور ابتدائی حساب بھی جزو نصاب تھا۔ یہ صورت حال انیسویں صدی کے آخر تک رہی۔

۱۷۷۱ء میں وارن ہیٹنگز نے کلکتے میں مدرسہ عالیہ کے نام سے مدرسہ کھولا اس کے نصاب میں فارسی و عربی کو بنیادی اہمیت حاصل تھی، لیکن اس کو اس انداز میں ترتیب دیا گیا کہ طلباء کا علم محض زبان دانی تک محدود رہے۔ ۱۷۹۱ء میں بنارس میں ہندو سنسکرت کالج کا افتتاح کیا گیا۔ ۱۸۰۰ء میں لارڈ ولزلی نے فورٹ ولیم کالج قائم کیا۔ ۱۸۲۲ء میں آگرہ کالج اور ۱۸۲۷ء میں دہلی کالج قائم ہوئے۔ جبکہ ۱۸۷۰ء میں علوم مشرقیہ کی تعلیم کے لیے لاہور میں اورنٹیل کالج کا قیام عمل میں لایا گیا۔ یوں درسِ نظامی اور دنیاوی تعلیم کے راستے یکسر مختلف ہوگئے۔ حکومتی سرپرستی میں علوم شرقیہ کی تعلیم میں بھی بنیادی اہمیت لسانیات کو ہی حاصل رہی اور سکول کالج اور یونیورسٹیوں سے اس تعلیم کا اہتمام ہوا۔ جس کی ضرورت زمانے کی مارکیٹ میں تھی۔ ادھر دینی مدارس سرکاری سرپرستی سے محروم ہوکر اسی درسِ نظامی پر سختی سے کاربند ہوگئے۔ جو صدیوں سے رائج تھا۔

میں معذرت خواہ ہوں کہ میں نے نصاب تعلیم میں تبدیلی کے تاریخی تسلسل کو ذرا وضاحت سے بیان کیا ہے۔ تاہم اس تاریخی تسلسل سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ ہوتے ہیں۔

۱۔ نصاب تعلیم میں ہمیشہ وہی تبدیلی موثر رہی جسے کسی موثر ادارے یعنی کسی استاد یا اساتذہ یا علمائے کرام کے بورڈ کی سرپرستی حاصل تھی۔

۲۔ ملت اسلامیہ کے اجتماعی زوال نے دینی تعلیم کے نصاب کو بھی متاثر کیا جیسے جیسے سیاسی غلبہ کمزور ہوا اور معاشرتی انحطاط رونما ہوا۔ دینی تعلیم کا نصاب بھی بدلتا چلا گیا اور نسبتاً کم اہمیت کے مضامین بنیادی اہمیت اختیار کرتے چلے گئے۔

۳۔ نصاب تعلیم کی تبدیلی سے دینی اداروں سے فارغ التحصیل ہونے والے افراد کا معیار بھی متاثر ہوا۔

۴۔ علوم پر لسانیات کو ترجیح دینے کا عمل جو دور انحطاط میں معاشی ضروریات کی وجہ سے پیدا ہوا تھا کم ہونے کی بجائے بڑھتا چلا گیا۔

چنانچہ ناگزیر ہے کہ درسِ نظامی کے نصاب پر ازسرنو غور کیا جائے اوران میں ترمیم و اضافہ اور

تنقیص و اصلاح کو عمل میں لایا جائے ۔ درسِ نظامی کے نصاب میں جو چند تبدیلیاں ضروری ہیں ان کے سلسلہ میں میری طالب علمانہ تجاویز حسب ذیل ہیں ۔

اصل علوم قرآن و حدیث ہیں ۔ اور باقی علوم ۔ علوم آلیہ ہیں یعنی ۔ عہ چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے۔

قرآن پاک

میرے نزدیک درسِ نظامی کے موجودہ نصاب میں سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس میں پورا قرآن مجید شامل نصاب نہیں ۔ قرآن پاک علوم کا مرکز و محور بلکہ منبع و مصدر ہے ۔ سرمایہ حیات اور نور بصیرت ہے ۔ اس کا مطالعہ انسان کو علم کی اوج گاہیں بھی عطا کرتا ہے اور کردار کی عظمت بھی چنانچہ ضروری ہے کہ درسِ نظامی کے نصاب میں پورا قرآن مجید با ترجمہ و تفسیر شامل ہو اور اسے آٹھ سالوں پر تقسیم کر دیا جائے نیز خصوصی مباحث الگ پڑھائے جائیں ۔

تفسیر قرآن پاک

موجودہ نصاب میں سورۃ بقرۃ تک قرآن مجید با تفسیر پڑھایا جاتا ہے ۔ تفاسیر میں جلالین اور تفسیر بیضاوی شامل نصاب ہیں ۔ یہ تفاسیر نہایت اہم ، موثر اور علوم و فنون کا خزانہ ہونے کے باوجود دورِ حاضر کی ضروریات کے پیش نظر کماحقہ رہنمائی فراہم کرنے سے قاصر ہیں ۔

جبکہ موجودہ زمانے کے کئی نامور مفسرین کی عربی تفاسیر زبان و بیان اور مطالب و مفاہیم کے جملہ تقاضے پورا کر سکتی ہیں ۔ علامہ سیوطی کی الاتقان فی علوم القرآن بھی رائج کی جا سکتی ہے ۔ قدیم تفاسیر میں سے تفسیر قرطبی اور جدید تفاسیر میں سے فی ظلال القرآن کو شامل کرنا بھی مفید رہے گا۔

فقہ و اصول فقہ

نصاب میں شرح وقایہ ، نور الایضاح ۔ کنز الدقائق ۔ ہدایہ ، نور الانوار ، سراجی ۔ اصول الشاشی ۔

حسامی، توضیح، مسلم الثبوت وغیرہ شامل ہیں۔اس میں کتاب کے اضافہ وکمی کی تو ضرورت نہیں البتہ ضروری ہے کہ دورِ جدید کے مسائل مثلاً بلا سود بنکاری عائلی قوانین وغیرہ کو الگ مباحث کے طور پر پڑھایا جائے ___ ان موضوعات پر عربی زبان میں کتب دستیاب ہیں۔اصولِ فقہ (Jurisprudence) کے انداز میں پڑھایا جائے۔نیز فقہ کو بھی Codifide طرز پر مرتب کرنے کی کوشش کی جائے۔

اس کی ضرورت اس دور میں اس لیے بھی اور بڑھ گئی ہے کہ اب شرعی عدالتوں کی صورت میں عدلیہ کے لیے ایسے افراد ناگزیر ہیں جو علوم دین کے ماہر ہوں اور فقہ کو جدید انداز میں سمجھتے ہوں۔

منطق و فلسفہ

منطق میں ایسا غوجی۔صغریٰ کبریٰ۔مرقات۔سلم۔قال اقول، شرح تہذیب قطبی جیسی کتب شامل نصاب ہیں۔یہ کتب دور از کار بحثوں پر مشتمل ہیں اور طلبہ کی صلاحیتوں کا ایک بڑا حصہ ان کتب کو محض سمجھنے پر صرف ہوتا ہے جبکہ اس منطق کی پوری عملی زندگی میں کہیں ضرورت نہیں پڑتی۔ اسی طرح یونانی فلسفہ بھی Out - dated ہو چکا ہے۔آج کے دور میں اس کی حیثیت ایک تاریخی تسلسل کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔ترمیم شدہ نصاب میں سے منطق و فلسفہ دونوں یکسر ختم کر دیے جائیں، ان کی جگہ اسلام اور سائنس کا مضمون متعارف کرایا جائے۔اس موضوع پر عربی و اردو دونوں زبانوں میں کتب میسر ہیں۔بہتر ہو گا کہ اردو میں نئے سرے سے ایک کتاب مرتب کی جائے جس میں سائنس، اس کے اصول، سائنسی قوانین و نظریات، سائنسی ایجادات وغیرہ کا مختصر اور آسان تعارف کرایا جائے۔قدیم مسلمان سائنس دانوں کی خدمات کا جامع تذکرہ ہو، چونکہ مغرب اب ایٹمی توانائی کے دور سے بھی آگے بڑھ رہا ہے اور ہمارا اصل حریف مغرب ہے اس لیے مغربی فکر و فلسفہ کو شکست دینے کے لیے سائنسی علوم کا مطالعہ یقیناً مفید رہے گا ______

صرف و نحو

موجودہ درسِ نظامی میں میزان، زبدہ، فصول اکبری، شافیہ، نحو میر، شرح مائۃ عامل ہدایۃ النحو،

کافیہ اور شرح ملا جامی وغیرہ کتب شامل ہیں۔ یہ کتب بلا شبہ نہایت جامع اور مفید ہیں لیکن ان میں گرائمر کی بجائے گرائمر کے فلسفہ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ کیا ہے؟ کی بجائے کیوں ہے؟ کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ عرب دنیا میں گرائمر کی جدید کتب نہایت سائنٹیفک انداز میں مرتب کی گئی ہیں ان سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً النحو الواضح، البلاغۃ الواضحہ اسی طرح کافیہ اور شرح جامی کی جگہ المغنی یا ابن عقیل وغیرہ شامل کی جا سکتی ہیں۔

عربی ادب و بلاغت

اس میں نفحۃ العرب، سبعہ معلقہ، دیوان متنبی، دیوان حماسہ، مقامات حریری، مفید الطالبین مختصر المعانی، تلخیص المفتاح، مطول وغیرہ کتب شامل نصاب ہیں۔ ان کتب میں سے مقامات کو خارج کیا جا سکتا ہے ان کی جگہ جدید عربی لٹریچر میں سے کوئی کتاب شامل کی جائے عربی بول چال اور تحریر کو بنیادی اہمیت حاصل ہو کتنی بد قسمتی ہے کہ ہمارے علماء کرام عربی زبان کے ماہرین ہونے کے باوجود عربی میں ایک جملہ بھی بولنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ عربی بول چال کے کیسٹ اور وڈیو کیسٹ سے مدد لی جا سکتی ہے۔ اسی طرح عربی ترجمے کی مشق خصوصی پروگرام کے تحت کروائی جائے عربی رسائل و جرائد بآسانی میسر آجاتے ہیں۔ اساتذہ و طلبہ ان کے مطالعہ کی عادت بنائیں تو عربی زبان کی تحصیل مزید آسان ہو سکتی ہے۔ کمرہ جماعت کی زبان عربی ہو تاکہ خود بخود بول چال کی مشق ہوتی رہے۔

علم کلام

علم کلام کو درس نظامی میں خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے لیکن جن فرقہ باطلہ کا ردو استیصال اس علم کے ذریعہ سکھایا جاتا ہے ان کا اب کہیں وجود نہیں۔ معتزلہ، خوارج، جبریہ، قدریہ وغیرہ جس جہالت کی نمائندگی کرتے ہیں اب وہی قدیم جہالت نئے انداز اور نئے ناموں کے ساتھ میدانِ

شکل میں موجود ہے چنانچہ اب اس مضمون کو "اسلام اور مذاہب عالم" کا نام دے کر اس کے ذریعہ عیسائیت، یہودیت، بدھ مت، ہندومت، کمیونزم، سرمایہ دارانہ نظام، صیہونیت، قومیت پرستی وغیرہ کا تقابلی جائزہ اور مسلمان ممالک میں موجود فتنوں مثلاً انکار حدیث، قادیانیت وغیرہ کا رد وغیرہ سکھایا جائے تاکہ ہمارے علمائے کرام جدید دور کے فتنوں سے آگاہ ہوں اور ان کا مقابلہ دلائل و براہین کے ہتھیاروں سے کر سکیں۔

سابقہ مضامین میں ان تبدیلیوں کے علاوہ مندرجہ ذیل مضامین کا اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے۔

انگریزی

انگریزی زبان کے غلبہ و حاکمیت سے انکار و مفر ممکن نہیں۔ قدیم دور میں یونانی (جو ایک مغربی زبان ہی تھی) کو سیکھنے کا چلن ہوا تو علمائے کرام نے اس کو رد کرنے کی بجائے، دیگر معاشرے سے بڑھ کر اسے اپنایا متعدد علمائے کرام نے زبان میں مہارت حاصل کی اور یونانی علوم کو عربی میں منتقل کیا۔ اسی طرح آج علوم کی زبان انگریزی ہے تو اسی سے راہ فرار اختیار کرنے کی بجائے ضروری ہے کہ دینی مدارس کے طلبہ کو اس سے آگاہ کیا جائے تاکہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے مقابلے میں ان کی ذہنی مرعوبیت کا خاتمہ ہو، طلبہ کو امتحان تو بلاشبہ صرف میٹرک کا دلایا جائے تاہم انگریزی زبان کی تعلیم و تحصیل تمام عرصہ جاری رہے۔ ایک عملی صورت یہ ہے کہ فارغ التحصیل حضرات کم از کم دو سالہ نصاب انگریزی شروع کیا جائے۔ دو سال میں اگر پوری محنت و توجہ سے پڑھایا جائے تو طلبہ جدید تعلیم یافتہ حضرات سے زیادہ انگریزی پڑھنے لکھنے اور بولنے پر قادر ہو سکتے ہیں۔

عالم اسلام

ہمارے علمائے کرام اسلامی ممالک اور عالم اسلام کے بڑے بڑے مسائل وغیرہ سے قریباً نابلد ہوتے ہیں۔ اس مضمون کی اہمیت آج کے دور میں اور بھی زیادہ ہے۔ ضروری ہے کہ دینی

مدارس کے طلبہ کو سبقاً سبقاً عالم اسلام کے سیاسی معاشی و معاشرتی احوال سے آگاہ کیا جائے پھر بالخصوص مطالعہ پاکستان کو اسی طرح نصاب کا حصہ بنایا جائے کہ پاکستان کی نظریاتی اساس طلبہ پر اچھی طرح واضح ہو جائے۔

تاریخ اسلام

تاریخ اسلام بالخصوص سیرت النبی اور تاریخ خلافت راشدہ کا مطالعہ انتہائی ضروری ہے۔ اس کے لیے کوئی مختصر کتاب مقرر کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح تاریخ دعوت کو حضرات انبیاء کرام سے دور حاضرہ تک نصاب کا حصہ بنایا جاسکتا ہے۔

اسلامی نظریہ حیات

اگرچہ سارا نصاب ہی اسلامی نظریہ حیات سے متعلق ہے تاہم ساتویں سال اسلامی نظریہ حیات کو اس انداز میں سبقاً سبقاً پڑھایا جائے کہ اسلام کا معاشی نظام، مبادیات معاشیات کی تشریح و توضیح کے ساتھ۔ اسلام کا سیاسی نظام جدید سیاسی نظریات کے تقابل کے ساتھ اسلام کا معاشرتی نظام جدید معاشرتی افکار کے ہمراہ۔ بالکل واضح ہو جائے، اور طلبہ کو اسلام کی جامعیت اور اس کے کامل ترین ضابطہ حیات ہونے کا کماحقہ علم حاصل ہو اور وہ پڑھے لکھے طبقہ میں اسلامی نظام کے تمام پہلوؤں کو اچھی طرح اجاگر کر سکیں نیز انہیں معاشیات کی اصطلاحیں مثلاً زر مبادلہ، کرنسی کا پھیلاؤ۔ روپیہ کی قیمت بجٹ وغیرہ اچھی طرح سے سمجھ آجائیں اور مغربی جمہوریت و دیگر نظام ہائے حکومت سے بھی مکمل آگاہی حاصل کر سکیں۔

نصاب کی تبدیلی کا یہ عمل بذریعہ وفاق ہائے مدارس عربیہ اگر ہو گا تو اپنی نتیجہ خیزی اور قبولیت کے لحاظ سے زیادہ بہتر رہے گا۔

کتب کی تیاری

یہ امر واقعہ ہے کہ دورِ حاضر میں طباعت کی جدید ترین سہولتوں کے باوجود ابھی تک درس نظامی کی بیشتر کتب قدیم طرز تحریر اور انداز میں طبع ہوتی ہیں اسی طرح حواشی درحواشی کے سلسلہ کی صورت میں کتاب کی ایسی صورت بن جاتی ہے کہ اس سے استفادہ کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو جاتا ہے کتب کو نئے سرے سے طبع کروایا جائے چونکہ حواشی انتہائی ضروری اور مفید ہیں طلبہ اور اساتذہ دونوں کے لیے موجب رہنمائی ہیں اس لیے تمام حواشی کو ترتیب وار، صفحہ نمبر اور حوالہ نمبر کے ساتھ کتاب کے آخر میں یکجا کر کے شامل کر دیا جائے۔ اس طرح اصل تحریر کا حسن بھی باقی رہے گا، اور حواشی سے استفادہ بھی ممکن ہوگا۔ نیز قدیم کتب کی تبویب کی جائے اور ہر باب کے آخر میں سوالات اور تمرینات کو تحریر کیا جائے تو زیادہ بہتر رہے گا۔

اسی طرح کوئی ادارہ ان مضامین پر کتابوں کی تیاری کا فریضہ انجام دے جو پہلے شامل نصاب نہیں۔ مثلاً اسلام اور سائنس، عالم اسلام انگریزی، اسلامی نظریہ حیات، عرب ممالک سے یہ کتب بزبان عربی بھی میسر آسکتی ہیں اور انہیں اردو میں بھی مرتب کیا جا سکتا ہے۔

تحریری مشق

بیشتر دینی مدارس میں طرز تدریس صرف تقریری ہے اور اس میں تحریر کو بہت کم عمل دخل حاصل ہے۔ ضرورت ہے کہ پہلے سال سے ہی تحریر کی عادت ڈالی جائے۔ اساتذہ باقاعدہ نوٹس لکھوائیں۔ طلبہ کو ہوم ورک دیا جائے اور ان کی کاپیاں چیک کی جائیں اس طرح طلباء میں تحریر کی صلاحیت پیدا ہوگی اور آموختہ پر بھی ان کی گرفت مضبوط رہے گی۔

تحقیقی کام

ہمارے دینی مدارس تحقیقی مراکز بھی ہوا کرتے تھے اور ان سے متعلق اساتذہ کرام نے ہزاروں گرانقدر تحقیقی کتب تصنیف کیں لیکن ایک عرصہ ہوا ہماری بدقسمتی سے ان اداروں میں تحقیق کے سوتے

خشک پڑے ہیں۔ ہمارے قریبی دور میں شاہ عبدالحق محدث دہلوی سو سے زیادہ کتب کے مصنف تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں علمائے کرام نے قانون سازی کا عظیم الشان کارنامہ فتاویٰ عالمگیری کی شکل میں سرانجام دیا۔ مولانا نورالحق محدث دہلوی نے تیسیر القاری کے نام سے صحیح بخاری شریف کی جامع شرح لکھی۔ شاہ ولی اللہ کے علمی کارناموں سے ایک دنیا واقف ہے۔ مولانا محمود الحسنؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا انور شاہؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ۔ مولانا سید سلمان ندویؒ، مولانا احمد رضا خان بریلوی، مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا ابوالحسن ندوی، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور دیگر متعدد علمائے کرام نے تحقیقی ذمہ داریاں ادا کیں اور ملت اسلامیہ کی بھرپور رہنمائی فرمائی اب بھی مدارس کو تحقیقی اداروں کے طور پر بھی اپنے فرائض سرانجام دینے چاہئیں۔

کتب خانہ

دینی ادارے کے لیے کتب خانے کا وجود ازبس ضروری ہے۔ زمانہ قدیم سے کتب خانے دینی مدارس کا جزو لاینفک رہے ہیں۔ پہلے مسجدوں کے ساتھ کتب خانہ کے لیے الگ کمرے ہوتے تھے۔ شیراز میں مقدسی کا بڑا کتب خانہ جسے عضد الدولہ نے قائم کیا جہاں خزانۃ الکتب ڈائریکٹر، معاون اور مشرف وغیرہ کے عہدے موجود تھے۔ فہرست کتب بھی ترتیب دی گئی تھی عباسیوں کا بیت الحکمت تو علمی دنیا میں نمایاں مقام رکھتا تھا۔ قاہرہ میں فاطمیوں کے عہد میں چالیس کمروں پر مشتمل لائبریری موجود تھی جہاں صرف علوم قدیمہ پر اٹھارہ ہزار کتب رکھی گئی تھیں۔

موجودہ دور میں ہمارے دینی مدارس میں کتب خانہ اتنے منظم اور بھرپور نہیں بعض جگہ کتابوں کے قدیم اور بوسیدہ نسخے ہی موجود ہیں جبکہ کتابوں کی تعداد انتہائی قلیل ہے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ دینی مدارس اپنے کتب خانوں کو ازسرنو ترتیب دیں کتب میں اضافہ کیا جائے اور انہیں دور حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جائے۔

نظام امتحانات

ایک عرصہ سے دینی مدارس میں اجتماعی سلسلہ امتحانات شروع کیا گیا ہے جو یقیناً ایک مستحسن قدم ہے۔ اس سے معیار تعلیم میں واضح اضافہ ہوا ہے۔ امتحانات کے لیے یہ اجتماعی تنظیمیں جو وفاق المدارس، تنظیم المدارس، رابطۃ المدارس وغیرہ کے نام سے قائم ہیں۔ یقیناً اچھے انداز میں کام کر رہی ہیں ان کو مزید منظم و مربوط کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں میری تجاویز حسب ذیل ہیں۔ (۱) مدارس میں ماہانہ ٹسٹ کو رواج دیا جائے اسطرح طلبہ زیادہ توجہ و محنت سے تعلیم حاصل کریں گے، اور ان کا اعتماد بھی قائم رہے گا۔ (۲) سہ ماہی ششماہی اور نوماہی امتحان کا سلسلہ بھی مفید رہے گا۔ (۳) وفاق وغیرہ کے تحت دو سالوں کی بجائے ایک سال کے بعد امتحان لیا جائے اس طرح طلبہ زیادہ اچھی طرح تیار کر سکیں گے۔ (۴) معروف اساتذہ کی نگرانی میں باقاعدہ شعبہ امتحانات قائم کیا جائے اور اس سلسلہ میں یونیورسٹی اور ثانوی تعلیم بورڈوں کے نظام امتحانات کا جائزہ لے کر نظام مرتب کیا جائے۔

سمعی و بصری آلات تعلیم

اگرچہ سمعی و بصری آلات تعلیم سے خود سرکاری تعلیمی اداروں میں بھی کما حقہ استفادہ نہیں کیا جا رہا۔ تاہم ان کی اہمیت و افادیت کسی سے مخفی نہیں۔ دینی مدارس میں ان کا استعمال اس لیے بھی آسان و ممکن ہے کہ یہاں کسی بھی دینی مدرسے میں طلبہ کی محدود تعداد طویل عرصہ تک اقامت پذیر رہتی ہے۔ اس لیے یہ طلبہ وی سی آر سلائیڈز اور کیسٹ وغیرہ کے ذریعہ جدید انداز میں اپنی دینی و دنیاوی معلومات بڑھا سکتے ہیں۔ اس کا ایک ضمنی فائدہ یہ بھی ہو گا کہ علمائے کرام میں جدید ذرائع ابلاغ کی مرعوبیت بھی ختم ہو گی اور ان کا مثبت و مفید پہلو بھی ان پر واضح ہو گا۔

تعلیمی سیاحت

سال میں ایک مرتبہ تعلیمی سیاحت کو بھی رواج دیا جاسکتا ہے تمام طلبہ کو اجتماعی انتظام میں معروف لائبریریاں، جامعات اور تاریخی مقامات وغیرہ کی سیر کرائی جائے۔ اس طرح علمی معلومات میں بھی اضافہ ہوگا اور طلبہ میں وسعت نظر بھی پیدا ہوگی۔ نیز تفریح کے فطری تقاضے کو بھی مثبت انداز میں پورا کیا جاسکے گا۔

صباحی خطاب

بیشتر دینی مدارس میں صباحی خطاب (اسمبلی) کا کوئی اہتمام نہیں۔ مناسب رہے گا کہ اگر صبح کا آغاز اجتماعی شکل میں کیا جائے۔ مدرسہ کے تمام طلبہ کسی ایک مقام پر جمع ہوں۔ ہر روز کوئی نہ کوئی استاد منتخب موضوعات پر درس قرآن مجید دیں طلبہ سے باری باری تقاریر کروائی جائیں تاکہ ان کو بھی فن خطابت میں مہارت حاصل ہو۔

لازمی فوجی تربیت

جس طرح کالجز میں این سی سی کی ٹریننگ کا سلسلہ ہے اسی طرح حکومت سے رابطہ کر کے دینی مدارس کے لیے بھی یہ سہولت حاصل کی جائے تاکہ دینی مدارس کے طلبہ جہاد کی عملی مشق حاصل کر سکیں اور ملک و قوم پر خدانخواستہ کوئی کڑا وقت آئے تو علمائے کرام ہراول دستہ بن کر جہاد میں حصہ لے سکیں۔

عملی کام

یورپ و امریکہ وغیرہ میں بھی ہفتہ میں ایک روز عملی کام یا فیلڈ ورک شامل نصاب ہوتا ہے۔

لازم کرایا جائے کہ دینی مدارس کے طلبہ بھی مہینہ میں دو مرتبہ عملی کام کریں گے۔ ان کاموں میں خود مدرسے کے کام، کھیتی باڑی، رنگ و روغن، تعمیر و مرمت، یا فیلڈ میں دعوت و تبلیغ اور خدمت خلق کے کام شامل ہو سکتے ہیں۔ اس طرح طلبہ مستعد رہیں گے۔ ان کی صحت بھی قابل رشک ہو گی۔ ان سے روایتی سستی و کاہلی اور آرام طلبی کے طعنے بھی دور ہو سکیں گے۔ مدارس نے اب جو اپنے طلبہ کو بہتر سہولتیں فراہم کرنی شروع کی ہیں تو ان کا ایک منفی نتیجہ یہ بھی نکلا ہے کہ مدارس کے طلبہ نازک مزاج اور چھوئی موئی سے بن گئے ہیں۔ چنانچہ ضروری ہے کہ ان کو عملی کام کرنے کی بھی تربیت دلائی جائے۔

ماحول

اس کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں کہ ماحول بھی تعلیمی پروگرام پر مثبت و منفی دونوں نقوش ڈالتا ہے۔ دینی مدارس کے ماحول کو بھی اسی نقطہ نظر سے ترتیب دینا چاہیے کہ طلبا میں صحت مند خیالات پرورش پائیں اور ان کی سیرت و کردار کی اسلامی سانچے تعمیر ہو۔ اس کے لیے مندرجہ ذیل اقدامات کی طرف اجمالاً اشارہ کرتا ہوں۔

۱) مدرسہ کی عمارت کھلی ہوا دار اور صاف ستھری ہو۔ تنگ و تاریک اور پر گھٹن ماحول میں پرورش پانے والے ذہنوں میں بھی تنگ نظری تاریکی اور گھٹن پیدا ہو جاتی ہے۔

۲) طلبہ میں صفائی کے مقابلے کروائے جائیں۔ ان کے کمرے صاف ستھرے ہوں بستر ترتیب وار ہوں۔ کپڑے صاف اور اُجلے ہوں، جوتے پالش ہوں، یہ چیزیں ایمان کا حصہ ہیں لیکن انہیں دینی مدارس کے طلبہ نے اپنے لیے شجر ممنوعہ سمجھ رکھا ہے۔

۳) طلبہ کی تربیت کا خصوصی اہتمام کیا جائے۔ ناظم صلواۃ، ناظم صفائی، وغیرہ مقرر ہوں۔ ان کا نظام الاوقات مقرر کر کے اس پر سختی سے عملدرآمد کروایا جائے۔

اساتذہ

ویسے تو دنیا کے ہر نظام تعلیم میں بنیادی حیثیت استاد کو حاصل ہے لیکن دینی تعلیم کا تو تمام تر انحصار ہی استاد پر ہے۔ استاد کی شخصیت ہی رازی وغزالی اور جنید و بایزید پیدا کرتی ہے اس لیے ضروری ہے کہ دینی مدارس کے اساتذہ کا انتخاب بڑی احتیاط کے ساتھ ہو۔ تاریخ اسلام کے تمام ادوار میں اساتذہ کا بڑا مرتبہ و مقام رہا ہے حجاج بن یوسف جیسے حکمران نے بھی اپنے بچوں کو پڑھانے کے لیے استاد کا انتخاب کرنا چاہا تو ایک نسبتاً لائق فائق لیکن بے دین استاد پر ایک دیندار استاد کو ترجیح دی۔ اساتذہ کے لیے ریفریشر کورسز کا انعقاد بہت ضروری ہے اس کا اہتمام کوئی بھی ادارہ کرے اس کی افادیت سے انکار نہیں۔ یہ چند گذارشات تجاویز کی صورت میں حضرات علمائے کرام کی خدمت میں اس لیے پیش کی ہیں کہ وہ ان پر غور فرمائیں، اگر تجاویز میں کوئی خامی ہو تو اصلاح فرمائیں اور اگر کوئی پہلو افادیت کا ہو تو ان سے استفادہ کیا جائے اس لیے کہ حکومتی سطح پر تو تبدیلیوں کا عمل قبولیت سے لے کر عملدرآمد کے مرحلے تک ایک طویل عرصے کا متقاضی ہے۔

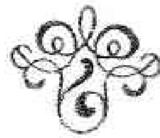
تو انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر
جو ہو سکے تو ابھی انقلاب پیدا کر

پاکستان کے سیاسی افق

پر پھیلنے والی بے یقینی کیفیت کا قابل عمل حل

جمہوری عمل اور متناسب نمائندگی

پروفیسر خورشید احمد



انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد

مباحث: اجلاس سوم

معروف شاہ شیرازی

اس نشست کے ان تمام مقالوں میں نصاب کی تبدیلی پر زور دیا گیا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا دینی مدارس کے افرادِ کار اور مالیات کے موجودہ حالات اس تبدیلی کے متحمل ہو سکتے ہیں؟ میرے خیال میں یہ کام دینی مدارس کے موجودہ حالات میں بے حد مشکل ہے۔ طریقۂ تدریس میں تبدیلی لانے کے لئے کوشش سے بھی دقت پیدا ہو گی۔ ہمارا طریقۂ تدریس بنیادی طور پر حفظ کا ہے۔ ایک ایک متن کو زبانی یاد کروایا جاتا ہے۔ تدریس کے اس طریقے کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ موجودہ کتب کو تحریر جدید کے عمل سے گذارنا چاہیئے۔ علماء کا ایک بورڈ بنا کر ان سے یہ کام لیا جا سکتا ہے متن اور حاشیے کے فرق کو اڑا دیا جائے۔ لیکچر کا طریقہ رائج کرنے کی ضرورت ہے۔ فارسی کا ایک قیمتی نصاب تھا مگر یہ ہمارے موجودہ نصاب میں ایک بڑی کمی اور خلا ہے۔

مفتی سیاح الدین کاکاخیل

یہ سب خواہشیں ہیں ایسی باتیں کی جائیں، جو قابل عمل بھی ہوں۔ صوبہ سرحد کے علماء اس قدر سرعت انگیز تبدیلیاں گوارا نہیں کریں گے پنجاب کے تعلیمی اداروں میں عموماً قدیم علوم کو پڑھنے کا ذوق نہیں ہے قدیم طرز یہ تھا کہ فن کی مشکل سے مشکل کتاب کو پڑھایا جاتا۔ آسانی کے لئے کتاب صرف و نحو کافی ہے لیکن یاد رہنا چاہیئے کہ مشکل کتب پڑھانے کا مقصد

یہ تھا کہ وہ مشکل علوم پر عبور حاصل کر سکیں جس سے طالب علم کی ذہنی تمرین اور مشق ہو جائے۔ عربی ادب و بلاغت کے حوالے سے جن تبدیلیوں کا ذکر ہوا ہے میرے خیال میں اس کو پڑھ کر نا ممکن ہے کہ طالب علم روح المعانی کی ایک سطر بھی سمجھ سکیں۔ یہ بالکل بدیہی بات ہے کہ فقہ تو منطق کے بغیر سمجھا اور پڑھا ہی نہیں جا سکتا۔ باقی ہمارے پاس پاس وسائل ہی نہیں کہ ہم کتابیں لکھوا سکیں اور پھر ان کو چھپوا سکیں۔ البتہ یہ ہماری خواہش ہے کہ جدید فلسفے اور جدید نظریات پر مدارس کی ضرورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے، مارکس، ڈاروِن، فرائڈ اور سارتر وغیرہ کے نقطہ نظر پر اردو کتب تیار ہوں ہم وہ پڑھائیں گے۔ تاریخ اسلام اردو اور معاشیات کی بنیادی چیزیں بھی اور سائنس کے بنیادی حقائق سے متعلق معلومات بھی نصاب میں شامل کی جا سکتی ہیں مگر اس حد تک کہ بوجھ نہ پڑے۔ یاد رہے کہ دینی مدارس کو صحیح پڑھانے والے بڑی مشکل سے مل رہے ہیں مجھے اندیشہ ہے کہ مستقبل میں دینی مدارس کے لئے پڑھے لکھے استاد ہی ناپید نہ ہو جائیں۔

پروفیسر خورشید احمد

مقالوں میں ایک اور بات آئی ہے کہ مدارس کے نصاب میں اہتمام کے ساتھ قرآن کی تعلیم دینے کا سلسلہ نظر انداز ہے۔

مفتی سیاح الدین کاکاخیل

مختلف حضرات مختلف محفلوں یا تحریروں میں یہ اعتراض وارد کرتے ہیں کہ دینی مدارس میں تو قرآن کی تعلیم کا اہتمام ہی نہیں، حالانکہ یہ مبالغہ آمیزی ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ درس نظامی اور دینی مدارس کی ساری تعلیم بنیادی طور پر اس استعداد کو بہم پہنچانے کے لئے ہے جو قرآن فہمی میں معاون ہو۔ درس نظامی کی تعلیم مضبوطی سے طالب علم کے ذہن میں راسخ ہو جائے تو اس میں فہم قرآن کی استعداد پیدا ہو جاتی ہے۔ باقی اب مدارس میں ترجمہ قرآن بھی شامل ہے۔ جلالین اور تفسیر بیضاوی پڑھنے کے بعد قرآن سمجھنا دشوار نہیں رہتا۔

حافظ نذر احمد

یہ امر واقعہ ہے کہ قرآن کریم نصاب میں شامل نہیں ہے۔ طالب علم وہی پڑھے گا جو نصاب میں شامل ہوگا۔

مولانا عبدالمالک

اب نصاب میں شامل ہے۔

پروفیسر خورشید احمد

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ بہت ساری جوہری تبدیلیاں اگر تمام مدارس میں نہیں لائی جا سکتیں تو کم از کم چند منتخب مدارس ہی کسی خاص خاص چیز کو لے لیں اور اس میں تجربہ کریں یعنی تخصص کے درجہ میں اور ثانوی درجہ میں تبدیلی کریں اور پھر نتائج کو دیکھ کر کسی بڑی تبدیلی کا خاکہ سوچیں مجوزہ مرکزی وفاق اس سلسلے میں بڑی خدمت انجام دے سکتا ہے۔

مولانا عبدالمالک

اس وقت ہمارے دینی مدارس کا نصاب دراصل علوم اسلامیہ کا نصاب ہے۔ علاوہ ازیں اگر کوئی مضمون ہے تو وہ محض معلومات کے طور پر ہے علم یا فن کے طور پر نہیں ہے۔

ڈاکٹر منصور علی

ایک مقالے میں یہ بات سامنے آئی تھی کہ مدارس کے نظام تعلیم کا زیادہ وقت عربی سیکھنے پر صرف ہو جاتا ہے نتیجتہً دینی علوم پڑھنے کو وقت کم ملتا ہے اس سلسلہ میں یہ توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ آج کل زبانوں کا بنیادی فہم بہم پہنچانے کے لئے ایسے سائنسی طریقے اور آلات موجود ہیں جن سے طالب علم بڑی آسانی سے اور بہت جلد یہ مقصد حاصل کر لیتا ہے۔ اس لئے ان ذرائع کو استعمال کیا جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ وقت علوم کی تدریس میں صرف ہو۔

معروف شاہ شیرازی

عربی کی نصابی کتب بڑی مغلق ہیں۔ اگر فقہ مشکل زبان میں پڑھایا جائے گا تو کچھ حاصل نہ ہوگا

البتہ طالب علم سارا دن لسانیات کے چیستان میں کھویا رہے گا اس لئے فنون کو سہل انداز سے پڑھانے کی ضرورت ہے۔

مولانا عبدالخالق

ہمارے فاضل ساتھی نے جن کتب کی جانب اشارہ کیا ہے وہ اب ہمارے مدارس میں نہیں پڑھائی جاتیں۔ یہ محض ایک تاثر ہے۔

مولانا یاسین ظفر

عربی کے ساتھ ساتھ اردو کی کتب کو بھی شامل نصاب کیا جائے اور عام علوم میں کچھ نہ کچھ تبدیلی کی جائے ایک ہی موضوع کی مختلف کتب کو بار بار نہیں پڑھایا جائے۔ احادیث کی کتب سے مختلف کلاسوں اور درجوں کے لئے ابواب مختص کردیئے جائیں۔ اس کے نتیجہ میں طلبہ کے اندر مثبت تبدیلی پیدا ہوگی اور استعداد میں بھی اضافہ ہوگا۔ درس نظامی کو بہر صورت کسی نہ کسی حال میں برقرار رکھا جانا چاہیئے، جدید علوم، عالم اسلام کے مسائل و معاملات کو لیکچرز اور نوٹس کی شکل میں مہیا کیا جائے۔ "طریقۂ تعلیم" پڑھایا اور عملی تجربہ بھی کروایا جاتا ہے۔ معاشیات کا بھی پیریڈ ہو اور قابل اساتذہ سے لیکچر دلوائے جاتے رہیں اس کا باقاعدہ امتحان بھی لیا جائے۔ لیکچرز اردو میں ہوں اس نہج پر بتدریج تبدیلی ممکن ہے فوری طور پر کوئی حل نہیں نکل سکتا ہے۔ جدید عربی زبان کی تدریس کے لیے سعودی اور مصری کتب کو یہاں رائج کیا جاسکتا ہے۔

مولانا عبدالخالق

تبدیلی کا احساس سب افراد میں موجود ہے ابتدائی حصے کو آسان زبان میں کردیا جائے لیکن تخصص بہر صورت لازمی ہونا چاہیئے۔ تمام اداروں میں نہ سہی چند ایک اداروں میں لازماً ہونا چاہیئے۔ اسی طرح مدارس کے علاوہ نصاب کے اندر بھی درجہ بندی بھی ضروری ہے۔ اس سے خاصی سہولت ہوسکتی ہے ہائی سکول، انٹر، ڈگری اور یونیورسٹی کے انداز میں دینی

مدارس کے بھی درجات ہونے چاہئیں۔ یہ ادارے دوسرے بڑے ادارے سے ملحق ہو سکتے ہیں۔ جیسے مختلف تعلیمی ادارے ایک یونیورسٹی سے منسلک ہوتے ہیں۔ یونیورسٹی ان اداروں کی رہنمائی کرتی ہے ہر گلی محلے اور مسجد میں ناظرہ کا ادارہ بھی اپنا نام جامعہ اور دارالعلوم رکھ لیتا ہے یہ ایک لایعنی سی بات ہے جامعہ یا دارالعلوم مقام و مرتبے کے حوالے سے ہی نام میں شامل ہو۔ پانچوں وفاق کا ایک اتحاد ہو اور نظام امتحان کا سلسلہ بھی ایک ہو۔

علی احمد مہر

نصاب میں تبدیلی کو اصلاح کا نام نہ دیا جائے اس سے الجھن اور جھجک پیدا ہوگی۔ البتہ معاون کتب کا تصور دیا جائے اور ایک کمیٹی بنا کر نصاب کو ٹھوس انداز میں ترتیب دیا جائے نیز علوم کے نام بھی تبدیل نہ کئے جائیں۔

مولانا عبدالمالک

معاون کتب کی بے حد ضرورت ہے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں مگر یہ دستیاب نہیں ہو پاتیں۔

حافظ نذر احمد

عربی زبان کی تفہیم و تحصیل کے سلسلہ میں عرب ممالک کے کام سے اتفاق ہے البتہ ان کے دینی نظام تعلیم سے مجھے اختلاف ہے۔ عرب کے فارغ التحصیل افراد کی صرف ایک ایک شعبے سے وابستگی ہوتی ہے تمام امور پر دسترس حاصل نہیں ہوتی۔

علی احمد مہر

ایک علم اور دوسری روح ہے۔ عربوں کے ہاں اسلام کا دین کے طور پر تصور نہیں ہے اور روحانی تڑپ بھی نہیں ہے وہاں کے نظام کا بھی جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

فرید احمد پراچہ

یہ کام مشکل، طویل اور محنت طلب ہے لیکن نصاب میں جو کلاسیکل عربی کتب ہیں ان کی ترتیب نو

کی جانی چاہیئے ۔مثلاً بہت سی کتب ایسی ہیں ان کو ابواب بندی اور فصلوں کی صورت نہیں دی گئی۔مثلاً ایک بات چلتی ہے پیراگراف یا ضمنی سرخیوں کے بغیر ہی چلی جاتی ہیں، بحث کے اندر ہی بحث ہے ۔اسے ٹھیک کرنے کی ضرورت ہے ۔ایک باب کے ختم ہونے پر اس باب میں پیدا ہونے والے سوالات کو بھی درج کیا جائے تاکہ طالب علم کو تیاری اور غور وفکر کے لئے سہولت ہو۔

معروف شاہ شیرازی

میں نے" ہدایت النحو" کو دوبارہ مرتب کرنے کا کام شروع کیا ہے اس طرح دوسری کتب پر بھی کام ہونا چاہیئے۔

پروفیسر خورشید احمد

یہ کام مرکزی وفاق یا اس کے زیر اہتمام نصابی ادارہ کرے تاکہ اختلاف کی گنجائش نہ رہے اچھا یہ بتائیے کہ علم الکلام کے بارے میں کیا گیا ہے ؟

مولانا عبدالخالق

علم الکلام کے بارے میں یہ ہے کہ مختلف لادینی تحریکیں جو دین اسلام پر حملہ آور ہوتی ہیں ان کا مطالعہ کرانا چاہیئے اور یہ اوپر کی کلاسوں میں ہونا چاہیئے۔تاکہ دین کا دفاع کرنے کی صلاحیت پیدا ہو۔یہ فن کسی قدر نصاب کے ان مضامین میں موجود ہے جو دین کو عقلی بنیادوں پر ثابت کرتے ہیں۔

پروفیسر خورشید احمد

جدید علم کلام کے حوالے سے دینی مدارس کے لئے ایک کتاب فوری طور پر وفاق کے تحت تیار ہونی چاہیئے۔

مولانا عبدالمالک

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ مدارس میں طلبہ آتے ہیں مگر کوئی دو سال پڑھ کر چلا جاتا ہے

کوئی چار سال بعد چلا جاتا ہے۔ اب تکمیل کے لئے خاص خاص طلبہ رہ جاتے ہیں، اچھے طلبہ کی بڑی کمی پیدا ہو رہی ہے۔

پروفیسر سید محمد سلیم

جب وفاق کا نظام چل پڑے گا اور سندات کی حیثیت و وقار بھی مسلمہ ہو گیا تو آئندہ کئی قسم کی ملازمتیں اسی وقت ملیں گی جب طالب علم نے مدرسے سے تعلیم حاصل کی ہو گی۔ امتحان دیا ہو گا تکمیل کی ہو گی۔

فرید احمد پراچہ

کچھ چیزیں ایسی ہیں کہ ان کو مہم کے طور پر چلایا جائے مثلاً یہ کہ امام اور خطیب کی سرکاری محکموں اوقاف یا مسلح افواج میں سکیل بڑھوایا جائے۔ طالب علموں کو نظر آ رہا ہو کہ جب ہم یہ علم حاصل کریں گے تو ہمیں معاشی تحفظ حاصل ہو گا اور ہمارے معاشرتی عزت و وقار میں بھی اضافہ ہو گا اس طرح عام مساجد کے خطیبوں اور اماموں کے معاشی اور معاشرتی مقام کو بلند تر کرنے کے لئے شہریوں کی توجہ دلائی جائے، اخبارات میں مضمون آئیں کہ خطیب کا اسلامی معاشرے میں کیا مرتبہ و مقام ہے یہ کام تنظیمیں اور لکھنے والے افراد کریں۔ اس طرح بھی قابل طلبہ کا دینی مدارس کی طرف رجحان ہو گا۔

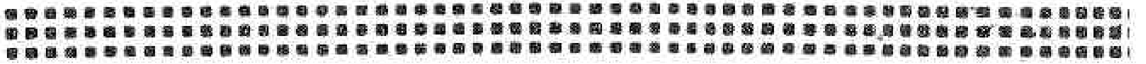
درپورٹ: سلیم منصور

پاکستان معاشرے کے سلگتے مسئلے کا حل

پاکستان میں انکم ٹیکس

............کا نظام

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کی قابل عمل رپورٹ



ہمارے نظام تعلیم کو درپیش چیلنج

نظام امتحانات اور خرابیاں

اصلاح کی تدابیر۔

پروفیسر نیاز عرفان





دینی نظام تعلیم: تصور اور اصلاح

مولانا سید محمد ناظم ندوی

مدارس دینیہ نے جنہیں مدارس عربیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں تاریخی کردار ادا کیا ہے ان دینی درسگاہوں نے نہ صرف دینی علوم جیسے تفسیر قرآن کریم احادیث نبویہ، فقہ اصول حدیث، اصول فقہ، اور دوسرے علوم جیسے علم کلام وغیرہ کو محفوظ رکھا بلکہ ان کی تعلیم و تدریس اور ان کے نشر و اشاعت کے ذریعے مسلمانوں کو دین اسلام سے وابستہ رکھا۔ برصغیر پر برطانوی تسلط کے بعد مشرقی و اسلامی تہذیب و تمدن کو مٹنے سے بچایا اور اگر سو فی صد مغربی تہذیب و تمدن کا غلبہ نہیں ہو سکا تو اس کی وجہ بھی یہی مدارس ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کے باوجود علماء و مدرسین شکستہ دل ہو کر کارگاہ حیات سے کنارہ کش نہیں ہوئے بلکہ انگریزی حکومت نے مکمل غلبہ کے بعد جب مسیحی پادریوں اور مبلغوں کے ذریعہ برصغیر کو ایک مسیحی مملکت میں تبدیل کرنے کی کوشش کی تو یہی علماء آگے بڑھے اور ان پادریوں کو چیلنج کیا انہیں مناظرہ میں شکست دے کر پسپا ہونے پر مجبور کیا۔ اس طرح برصغیر ایک مسیحی مملکت میں تبدیل ہونے سے محفوظ رہا۔

اس سلسلہ میں ہمارے علماء نے مسیحیت کے خلاف بہترین علمی سرمایہ فراہم کیا۔ اسی طرح فتنہ قادیانیت کے سامنے انہوں نے مضبوط بند باندھا انہیں بھی مناظرہ کے ذریعہ شکست دی۔ اس فتنہ ارتداد کے خلاف بہترین لٹریچر (علمی سرمایہ) قوم کو دیا اور بالآخر اس فتنہ کو سرکاری سطح پر ایک غیر مسلم اقلیت قرار دے کر سارے عالم میں یہ حقیقت واضح کر دی کہ قادیانیت

اسلام کے خلاف ایک بغاوت اور ارتداد کی ایک تحریک ہے جس کو انگریزی استعمار نے پروان چڑھایا تھا۔ مسیحیت اور قادیانیت کے خلاف علماء کی جدوجہد ایک تاریخ ساز عمل ہے جو پاک و ہند کی اسلامی تاریخ کا ایک درخشندہ باب ہے۔

انتہائی مایوس کن حالات میں یعنی ۱۸۵۷ء میں آزادی کی جدوجہد میں ناکامی کے بعد بھی مدارس دینیہ مایوسی کی شب تاریک میں امید کی شعاع تھے۔ جنہوں نے کبھی انگریزوں کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے۔ ۱۸۵۷ء کے تھوڑے عرصہ کے بعد علماء ہی کے گروہ سے صاحب اہل اللہ اور علماء ربانین نے اسلامی قلعہ کی تعمیر کا کام شروع کردیا اور انیسویں صدی مسیحی کے اختتام سے قبل دارالعلوم دیوبند مدرسہ مظاہرالاسلام سہارنپور، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو اور بیسیوں چھوٹے اور بڑے دینی مدرسے برصغیر کے چھوٹے اور بڑے شہروں اور قصبات میں قائم کئے جن سے ہزاروں طلباء دین کی تعلیم پاکر اور علماء و صلحاء صوفیہ اور مشائخ کے فیض سے مستفیض ہو کر اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت میں لگ گئے۔ مسلمانوں کو اسلام سے وابستہ رکھا یہ دین اسلام کے سچے اور پکے خادم تھے جو ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئے۔ جنہوں نے اپنے مواعظ حسنہ سے مسلمانوں کے دلوں کو اسلام کی محبت سے گرم رکھا اور اس طرح اسلام کا چراغ روشن رکھا۔ مسلمانوں کو حوصلہ دیا۔ انہیں شکستہ دل ہونے سے بچایا۔ ان میں ہمت و عزیمت کے جذبات کو زندہ و تابندہ رکھا۔

قیام پاکستان کے بعد بھارت سے آنے والوں میں ایک بڑی تعداد علماء کی تھی۔ اس آنے والے برگزیدہ طائفہ میں علماء بھی تھے۔ صلحاء، صوفیہ اور مشائخ بھی تھے ان سب کے اسمائے گرامی کا ذکر باعث طوالت ہوگا مگر ان میں سے بعض کے ذکر جمیل میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ یہ رجال تاریخ ہیں، ان کے ساتھ بعض مقامی علماء کا بھی ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ ان حضرات کی علمی دینی خدمات پاکستان کے بعض علاقوں میں ناقابل فراموش ہیں اور پاکستان کی علمی و دینی تاریخ لکھنے والا ان کو قلم انداز نہیں کرسکتا ہے کیونکہ ان کے علمی و دینی کارنامے پاکستان کی اسلامی تاریخ میں

ہمیشہ زندہ و تابندہ رہیں گے۔ ان کے اسماء گرامی یہ ہیں۔ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی شارح صحیح مسلم، حضرت مولانا سید سلیمان ندوی مولف سیرت النبی، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع بانی دارالعلوم لانڈھی کراچی حضرت مولانا مفتی حضرت محمد حسن بانی جامعہ اشرفیہ لاہور، حضرت مولانا خیر محمد صاحب بانی خیر المدارس ملتان۔ حضرت مولانا بدر عالم مہاجر مدنی مولف فیض الباری شرح صحیح بخاری، حضرت مولانا ادریس کاندھلوی شارح مشکوٰۃ المصابیح واستاد الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور، مولانا محمد یوسف بنوری بانی دارالعلوم نیوٹاؤن کراچی، مولانا ظفر احمد عثمانی استاد الحدیث، دارالعلوم ٹنڈو الہ یار سندھ مولانا عبدالرشید نعمانی سابق استاد حدیث دارالعلوم نیوٹاؤن کراچی۔ حضرت مولانا مفتی فاروق احمد صاحب استاد حدیث جامعہ عباسیہ۔ حضرت مولانا محمد صادق ناظم امور مذہبیہ بہاولپور، حضرت مولانا عبیداللہ استاد فقہ و حدیث جامعہ عباسیہ بہاولپور، حضرت مولانا مفتی سیاح الدین کاکاخیل مولانا مفتی زین العابدین فیصل آباد، مولانا بادشاہ گل دارالعلوم اکوڑہ خٹک، مولانا گلزار احمد مظاہری ناظم اعلیٰ اتحاد العلماء لاہور، ان حضرات کے علاوہ سینکڑوں جلیل القدر علماء مدرسین اور مفتیان کرام نے پاکستان کے طول و عرض میں علوم دینیہ کے نشر و اشاعت کے لیے مدارس اور ادارے قائم کئے ہیں۔ انہی حضرات کی مساعی جیلہ اور مخلصانہ جدوجہد کی بدولت قال اللہ و قال الرسول کی صدائے دلنواز بلند ہو رہی ہے۔ مذکورہ بالا علمائے کرام میں سے اکثر علماء کے جانشین ان کی اولاد ہے جو اپنے آباء کی جگہ پر کام کر رہی ہے۔ زادہم اللہ اخلاصاً و توفیقاً۔

اس طرح جب آزادی ہند کی جدوجہد تیز سے تیز تر ہوئی تو اس میدان میں بھی علماء کا کردار نمایاں رہا۔ چنانچہ ۱۹۴۷ء کے بعد پاک و ہند میں بے شمار چھوٹے اور بڑے مدارس دینیہ قائم کئے، اس طرح برصغیر میں علماء کا تسلسل عمل قائم رہا۔ پاکستان اور ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرنے والا اس اعتراف پر مجبور ہے کہ برصغیر کے یہ مدارس دینیہ تاریخ ساز عمل انجام دیتے رہے ہیں۔ انہیں علماء مدرسین، صلحاء اور مشائخ کی مساعی جمیلہ کی بدولت مسلمانوں کا اجتماعی مزاج دینی ہے اور کوئی لادینی تحریک مسلمانوں میں کامیاب نہیں ہو سکی ہے نہ آئندہ انشاء اللہ

کامیاب ہو سکے گی۔

مسلمانوں کے اسی اجتماعی دینی مزاج کی وجہ سے نظریہ پاکستان کامیاب ہوا اور مسلمانوں نے من حیث المجموع اس کی تائید کی کیونکہ مسلمانوں کے ملی امتیاز و تشخص کا تقاضا تھا کہ ان کی اپنی مملکت ہو جہاں وہ اپنے نظریہ حیات کے مطابق حکومت قائم کر سکیں۔ مسلمانوں کا یہ اجتماعی مزاج خود بخود نہیں پیدا ہوا بلکہ یہ ثمرہ ہے مدارس دینیہ اور ان میں فریضہ تدریس انجام دینے والے علماء کی مساعی جمیلہ کا ان دانشکدوں میں تعلیم پا کر ہزاروں کی تعداد میں یہ علماء و صلحاء اسلام کی ابدی تعلیمات کی نشر و اشاعت کرتے رہتے ہیں۔ یہ قناعت پسند بوریا نشین معمولی سادہ خشک زندگی بسر کرنے والے درویش صفت علماء ہی لوگوں کو بتاتے رہتے ہیں کہ اسلام مکمل ضابطہ حیات کا نام ہے۔

ان مدارس و مکاتب دینیہ کی اہمیت ایک غیر مسلم تک کو ہے۔ ممکن ہے ہم میں سے کچھ لوگ ان درویش صفت مدرسین کی اہمیت کو محسوس نہ کرتے ہوں مگر اس وقت (Bridge To Islam) نامی کتاب کے مؤلف کی یہ بات یاد آئی کہ اسلام کی طاقت کا سرچشمہ کہاں ہے وہ اپنی اس کتاب میں بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "مسلمانوں پر بڑی سے بڑی آفت آتی ہے مگر مسلمانوں کا ملی وجود قائم رہتا ہے۔ تاتاریوں کے ہاتھ بغداد کی تباہی، عباسی حکومت کا خاتمہ اسپین میں مسلمانوں کا قتل عام، جلا وطنی اور بالآخر اسپین میں عربوں اور مسلمانوں کا مکمل زوال ان جیسے واقعات کے باوجود مسلمانوں کا ملی و اجتماعی وجود قائم رہتا ہے۔" اس کا مؤلف پادری خاندان کا ایک فرد ہے۔ اسے وادی نجران میں آباد عیسائیوں کے قبول اسلام کا غم کھائے جاتا ہے۔ پادریوں کی تبلیغ میں کوتاہی کا شکوہ کرتا ہے کہ اسی طائفہ کی کوتاہی کی وجہ سے اسلام کو فروغ ہوا اور عرب مسیحیت کو قبول نہیں کر سکے وغیرہ وغیرہ۔ اسلام مسلمانوں کی طاقت کے سرچشمہ کی بحث کے ضمن میں لکھتا ہے "اسلام کی طاقت کا سرچشمہ وہ مکاتب و مدارس ہیں جو مسجدوں سے ملحق ہوتے ہیں جہاں ایک مسلمان بچہ ابتدائی

عمر میں اسلام کے بنیادی عقائد کی تعلیم پاتا ہے اور زندگی بھر وہ نقش اس کے ذہن سے محو نہیں ہوتا ہے بلاشبہ ان ہی مکاتب و مدارس دینیہ کی بدولت ایک مسلمان بچہ کم سنی میں دین کی بنیادی باتوں کو جانتا ہے اور عمر کے دوسرے حصہ میں خواہ وہ کیسی ہی بے عملی، بدعقیدگی سے دوچار ہو مگر پھر وہ اسلام ہی کی طرف لوٹ آتا ہے یقیناً اسلام کی طاقت کا اصل سرچشمہ مکاتب و مدارس دینیہ ہیں جہاں بچوں کو قرآن کریم کی ناظرہ یا حفظ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ جہاں انہیں اسلام کی پانچ اساسی امور کو یاد کرایا جاتا ہے اور زندگی کے تمام مراحل سے گذر کر پھر وہ اسلام کی ابدی تعلیم کی طرف لوٹ کر سکون و اطمینان حاصل کرتا ہے۔ الجزائر میں بھی فرانسیسی استعمار کو بالآخر شکست ہوئی، ان کی مکمل شکست میں انہی مکتبوں، مسجدوں سے ملحق تعلیم گاہوں اور مدارس دینیہ میں تعلیم پانے والوں کو دخل تھا بلکہ فرانسیسی زبان کو سرکاری زبان بنانے اور اس کے عام فروغ کے بعد عربی زبان کو فنا ہونے سے بچانے کا کام بھی انہی مدارس دینیہ نے انجام دیا اور عربی اسلامی ثقافت و تہذیب کے بچے کھچے آثار بھی انہی کی بدولت نظر آتے ہیں۔

مدارس دینیہ کی تنظیم اور اصلاح منہاج کی پہلی کوشش

قیام پاکستان کے بعد علمائے کے ایک صاحب بصیرت طبقہ نے محسوس کیا کہ ان تمام مدارس دینیہ کو منظم کیا جائے، ان میں ایک ہی قسم کا منہاج تعلیم ہو۔ امتحانات کا بھی ایک نظام ہو اور ان امتحانات میں کامیاب ہونے والوں کو ایک ہی قسم کی اسناد دی جائیں۔ اس طرح علوم دینیہ کے مابین اسناد کا ملک میں وقار قائم ہو، یہ ایک اچھی تجویز تھی، چنانچہ اس مقصد کی خاطر حضرت مولانا خیر محمد جالندھریؒ کی دعوت پر خیر المدارس ملتان میں ۱۹۵۲ کے اوائل میں علما مدرسین و منتظمین مدارس کا ایک اجتماع ہوا۔ جس میں حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ نے بھی شرکت کی تھی۔ مولانا خیر محمدؒ نے اجتماع کی غرض و غایت بیان کی۔ تمام شرکاء نے اظہار خیال کیا اور کہا کہ ہندوستان کے جن حالات میں مدارس عربیہ دینیہ نے علوم اسلامیہ کی جس طرح خدمت انجام دی ہے اس کی افادیت اور اس کی اہمیت کا انکار نہیں کیا جا سکتا ہے، لیکن پاکستان جیسے نوزائیدہ ملک کے حالات اور مقتضیات کے پیش نظر

مدارس دینیہ کے منہاج میں مناسب اصلاح کی ضرورت ہے"۔ الغرض ان علماء نے مدارس دینیہ کی تنظیم، ان کے نصاب میں اصلاح و ترمیم کی ضرورت کا اعتراف کیا لیکن سب کا ایک امر پر اتفاق تھا کہ تمام مدارس عربیہ کے منتظمین و علماء ایک نظام تعلیم پر متفق نہیں ہوں گے۔ اس اجتماع میں پاکستانی مدارس کے تمام منتظمین شریک نہیں ہوئے تھے۔ چنانچہ حضرت مولانا خیر محمدؒ جو ایک صوفی مشرب اعلیٰ انتظامی صلاحیت کے حامل اور اپنے حلقہ میں بڑے محترم تھے، اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے، اور یہ اجتماع ناکام ہو کر منتشر ہو گیا۔

پے مشورت مجلسے آراستند، نشستند و گفتند و برخاستند

البتہ اس کے بعد وفاق المدارس کے نام سے مدارس کی ایک تنظیم قائم کی گئی اور اس میں شریک مدارس نے امتحانات کا ایک بورڈ قائم کیا جس کے تحت امتحانات منعقد ہوتے ہیں اور کامیاب امیدواروں کو اسناد بھی دی جاتی ہیں مگر حسب سابق تمام مدارس علیحدہ امتحان لے کر علیحدہ سند بھی دیتے ہیں، اس طرح ان مدارس نے اپنی انفرادیت کو باقی رکھا اور اپنے طور پر اس سے دست کش ہونے کو تیار نہیں ہوئے، اس طرح وفاق المدارس کی تنظیم کی اور اس کے امتحانات کی اور ان کی جاری کردہ اسناد کی وہ اہمیت نہیں ہو سکی جو ہونی چاہیے تھی۔ نیز اس تنظیم میں تمام مشہور و معروف تعلیم گاہیں شریک نہیں ہوئیں کیونکہ تمام علماء کرام نے اس اجتماعی نظام کی افادیت و اہمیت کو محسوس نہیں کیا تھا۔

اس وقت ہندوستان و پاکستان کے مدارس دینیہ میں جو نصاب تعلیم رائج ہے وہ ہمیشہ یکساں نہیں رہا۔ یہ نصاب جس کو درس نظامی سے تعبیر کیا جاتا ہے کوئی جامد و تغیر ناپذیر نہیں رہا ہے اور نہ یہ نظام بہت قدیم ہے اس میں داخل کتابوں کی تالیف کے سنین سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کس طرح ان علوم پر تالیف کردہ کتابوں کو رفتہ رفتہ داخل کیا گیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ (۱۱۱۴-۱۱۷۶ھ) سے قبل حدیث میں صرف امام بغوی کی مشکوٰۃ المصابیح داخل نصاب تھی صحاح ستہ کو بہت بعد میں داخل نصاب کیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یونانی علوم عقلیہ کے ترجمے کے بعد رفتہ رفتہ ان علوم کی اس قدر اہمیت پیدا ہو گئی تھی کہ عالم دین کے لئے ان علوم عقلیہ میں مہارت

پیدا کرنا ضروری قرار دیا گیا۔

ان یونانی علوم عقلیہ کی اس اہمیت اس لئے پیدا ہوئی کہ انہی علوم عقلیہ کی وجہ سے صفات باری تعالیٰ کے قدیم و حادث ہونے کی بحث پیدا ہوئی اور چونکہ ذات باری تعالیٰ قدیم ہے لہذا اس کی تمام صفات بھی قدیم ہیں اور چونکہ صفات باری تعالیٰ متعدد ہیں لہذا تعدد قدماء کے لزوم کا مسئلہ سامنے آیا اور اسی ضمن میں یہ مسئلہ بھی پیدا ہوا کہ دوسری صفات باری تعالیٰ کی طرح کلام بھی اللہ کی صفت ہے لہذا وہ بھی قدیم ہے اور حضرت عیسٰی علیہ السلام قرآن کریم کے نص کی رو سے کلمۃ اللہ ہیں، انما المسیح عیسی ابن مریم رسول اللہ وکلمتہ القاھا الی مریم وروح منہ لہذا حضرت عیسی ابن مریم علیہ السلام روح اللہ و کلمتہ اللہ ہیں، اب مسیحی پادریوں نے کلام کے قدیم ہونے کلمتہ اللہ کے قدیم ہونے اور حضرت عیسی ابن مریم کی الوہیت پر استدلال کیا۔ مسلمان فلاسفر نے یونان کے یونانی علوم عقلیہ کو پڑھ کر اسی اسلحہ سے لیس ہو کر مسیحی پادریوں کو دندان شکن جواب دیا۔ اس طرح عالم اسلام میں علم کلام یعنی علم العقائد کا ایک مستقل علم پیدا ہوا اور اس کو بھی مدارس دینیہ کے منہاج کا ایک جزو لازم قرار دیا گیا اور اس ضمن میں علم مناظرہ کی بھی ضرورت محسوس ہوئی اس کے بھی قواعد و اصول بنائے گئے اور اسے منہاج تعلیم میں داخل کیا گیا اور چونکہ علم العقائد کا تعلق ماوراء الطبیعیات سے ہے لہذا یہ اس مشکل و دقیق علم کے مباحث میں صفات باری تعالےٰ کے لاعین و لاغیر کی بحث سے طلباء و اساتذہ دوچار ہوئے اور مدارس دینیہ نے یونانی فلسفہ کے اس نظریہ کو داخل نصاب کیا کہ الواحد لا یصدر منہ الا الواحد الغرض مدارس دینیہ کے منہاج میں ہر زمانہ کے ضروری علم کو داخل کیا گیا اس طرح منہاج تعلیم میں ہمیشہ تغیر اور اضافہ ہوتا رہا۔

یہ درست نہیں ہے کہ درس نظامی ایک جامد و تغیر نا پذیر نظام تعلیم کا نام ہے۔ البتہ ہندوستان و پاکستان کے مزاج میں عصری مضامین کو داخل کرنے کا عمل سست رہا ہے لیکن درس نظامی میں جو تغیر ہوتا رہا ہے اس کے مطالعہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ علماء کا ہاتھ ہمیشہ زمانے کے نبض پر رہتا ہے اور عصری تقاضوں سے وہ باخبر رہتے تھے۔ آج بھی مدارس دینیہ

کے نصاب میں علوم عقلیہ کی موجودگی اس بات کی دلیل ہے کہ علماء کے لیے ہر زمانہ کے اہم علوم سے واقفیت ضروری ہے اور یہ کہ دانش کدوں کا منہاج تعلیم کبھی بھی جامد اور تغیر ناپذیر نہیں رہا ہے۔
حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی استاد جامعہ عثمانیہ نے اپنی کتاب نظام تعلیم میں اعداد و شمار کی زبان سے ثابت کیا ہے کہ درس نظامی کی کتابوں میں ساٹھ فی صد سے زیادہ علوم عقلیہ اور علوم آلیہ کی کتابیں داخل منہاج تھیں، جس کی تفصیل یہ ہے۔ منطق میں ۱۲، فلسفہ میں ۳ یا ۴، علم صرف میں ۴، نحو میں ۶، کل ۲۶ معانی میں ۳، اصول فقہ میں ۳، فقہ میں ۳، اصول حدیث میں ۱، حدیث میں ۸، اور علوم دینیہ کی کتابوں کی تعداد بہت کم تھی۔ کسی زندہ قوم کے دانشکدوں تعلیم گاہوں کا منہاج تعلیم کبھی بھی جامد نہیں ہو سکتا ہے۔

آج سے تقریباً ۴۵ سال قبل الجزائر کے مشہور عالم دین اور ادیب و انشا پرداز شیخ بشیر ابراہیم الجزائر سے پاکستان تشریف لائے تھے، وہ بہاول پور بھی تشریف لائے تھے علوم دینیہ اور مدارس دینیہ کے منہاج پر گفتگو ہو رہی تھی، اثنا گفتگو میں، میں نے نحو کی مشہور کتاب کافیہ ابن حاجب کا ذکر کیا، یہ کتاب برصغیر پاک و ہند میں عرصہ دراز سے منہاج تعلیم میں داخل ہے میں نے دریافت کیا، کیا یہ کتاب الجزائر میں بھی داخل نصاب ہے؟ انہوں نے کہا یہ کتاب کس صدی میں تصنیف ہوئی تھی؟ مقصود یہ تھا کہ اس زمانے کے مزاج کے مطابق تھی اب زمانے کا مزاج بدل گیا ہے۔ اب ایجاز و اختصار کا زمانہ نہیں ہے۔ اب شرح و بسط کا زمانہ ہے۔ یونانی علوم عقلیہ نے مولفین و مصنفین کا ذوق تالیف بدل کر رکھ دیا تھا۔ اس عہد کی کتابوں کا اسلوب منطقیانہ ہو گیا تھا کیونکہ یہی اس وقت کا مذاق تالیف بن چکا تھا جیسا کہ آج سائنسی اور میکانیکی بن گیا ہے، اس عہد میں چیستاں نویسی کمال فن کی دلیل تھی، لیکن عہد حاضر میں عالم اسلام میں ایسی کتابیں مقبول ہیں جن کا اسلوب واضح ہو چنانچہ تمام عقلی و غیر عقلی علوم جیسے۔ معانی، بلاغت، ادب وغیرہ بلکہ منطق و فلسفہ جیسے مضامین پر بھی تمام تالیفات کی زبان نہایت واضح ہوتی ہے اور اسلوب بیان سلجھا ہوا ہوتا ہے۔ اب ادبی و لسانی علوم کو عقلی علوم کے قالب میں نہیں ڈھالا جاتا ہے نیز اسلوب میں ایجاز و

اختصار نہ اغلاق و ابہام ہوتا ہے بلکہ دلائل الاعجاز و اسرار البلاغہ (عبد القادر جرجانی) کے اسلوب کو نمونہ بنایا گیا ہے۔

برصغیر پاک و ہند میں سب سے پہلے دار العلوم ندوۃ العلماء نے منہاج تعلیم میں اصلاح کی ضرورت کو محسوس کیا، اس دار العلوم سے وابستہ علماء نے کچھ عصری علوم کو منہاج تعلیم میں داخل کرانے کی طرف مدارس دینیہ کو متوجہ کیا اور منطق و فلسفہ میں سے صرف منطق کو نصاب تعلیم میں داخل رکھنے کا مشورہ دیا نیز تاریخ اسلام اور ادب عربی کی ایسی کتابوں کو منہاج میں داخل کیا جو نہایت معیاری تھیں، رفتہ رفتہ ندوۃ العلماء کی یہ آواز موثر ہوئی۔ ابتدا میں تو ان مدارس نے اپنی قدیم روش کو ترک نہیں کیا اور ہر ایک کتاب کو اس طرح اہمیت دی گئی کہ گویا علوم آلیہ پر تصنیف کردہ کتاب بھی ایک مقدس صحیفہ ہے جس کو ترک نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یہاں تک کہ مسلم العلوم جیسی چیستان کتاب کو بھی سینہ سے اس طرح لگایا کہ ایک عالم دین کا کہنا تھا کہ جو مسلم العلوم پڑھا ہوا نہیں ہے وہ عالم کس طرح ہو سکتا ہے ایک صاحب نے فرمایا کہ کیا وہ عالم شرح جامی پڑھا سکتے تھے کیونکہ اس میں فعل کی تعریف میں دلالت مطابقی وغیرہ کا ذکر ہے اور حاصل و محصول کی مشہور بحث ہے۔ الغرض علم نحو کے اصل مسائل کی اہمیت سے زیادہ شرح جامی کے منطقی اسلوب بیان کی گئی تھی اور اب تک اس کی اہمیت باقی ہے۔

ذرا غور کیجئے فعل و اسم کی تعریف میں ان تین دلالتوں کی کیا ضرورت ہے کیا بغیر اس منطقی بحث کے اسم و فعل کی تعریف نہیں کی جا سکتی ہے؟ اب تک مدارس دینیہ کے مدرسین کا تدریسی ذوق یہ رہا ہے کہ مغلق و مبہم کتابوں کی عقدہ کشائی کو کمال علم سمجھا جاتا ہے نفس مضمون سے زیادہ کتابوں کی اہمیت ہے۔ معانی، بلاغت، نحو، اصول فقہ وغیرہ جیسے علوم پر جو آسان اور سہل اسلوب پر مشتمل کتابیں ہیں ان کی قدر اس لیے نہیں کی جاتی کہ وہ ان کے مذاق تدریس سے مختلف ہیں جدید کتابوں کے مطالعہ سے ان کا ذوق اباء کرتا ہے۔ ایک مرتبہ ایک ذی استعداد مدرس سے میں نے کہا آپ ذرا شرح ابن عقیل کا مطالعہ کیجیے پھر دیکھیے کہ شرح جامی سے یہ کس قدر زیادہ مفید ہے اور

اگر آپ کو کوئی مشکل پیش آئے تو بندہ حاضر ہے چونکہ وہ ایک ذی استعداد مدرس تھے چند یوم میں شرح ابن عقیل کے اسلوب بیان سے مانوس ہو گئے اور اس کتاب کی تعریف کرنے لگے، یہی حال دوسری کتابوں کا ہے۔ اسرار البلاغۃ، دلائل الاعجاز، الواضح اور عصر جدید کی البلاغۃ الواضحۃ وغیرہ کے مطالعہ کے بعد ہمارے مدرسین حضرات کا مذاق تدریسی بدل سکتا ہے۔

چنانچہ جو حضرات بلاد عربیہ سے تعلیم پاکر واپس آرہے ہیں انہیں احساس ہے کہ مسلمانوں کے عہد انحطاط اور عہد جمود میں جن مؤلفات کی اس قدر اہمیت تھی وہ عالم عرب میں نہیں ہے۔ ان مؤلفات کی اہمیت کا طلسم ٹوٹ چکا ہے، یہ زمانہ ایجاز، اختصار اور چیستان نویسی کا نہیں ہے۔ عہد حاضر میں لسانی و ادبی علوم پر تصنیفات کا اسلوب نہایت واضح و دلکش ہے بلکہ اصول فقہ وغیرہ کا اسلوب بھی مغلق و مبہم نہیں ہوتا ہے۔ مغلق و مبہم اسلوب کے حق میں یہ دلیل دی جاتی ہے کہ اس سے تشحیذ ذہن ہوتی ہے۔ تشحیذ تو چند طلبا کی ہوتی ہوگی مگر علوم دینیہ کی تحصیل سے قبل کے مشکل مراحل سے جو طلبا گذرتے ہیں ان سے کوئی پوچھے کہ علوم اسلامیہ اور خصوصاً علوم عقلیہ اور علوم الہیہ کے اشکال کے متعلق عام تاثر کیا ہے؟ یعنی علوم دینیہ کا پڑھنا پڑھانا بہت مشکل ہے۔ اس تاثر کا ذمہ دار کون ہے؟

مدارس دینیہ کے منہاج میں علوم آلیہ کی کثرت کی وجہ سے عصری علوم کے لیے بہت کم وقت ملتا ہے لہذا اس پر نظر ثانی کی ضرورت ہے نیز عربی زبان کی تعلیم کا طریقہ بدلنا چاہیے اور بعض مدارس میں اس کی طرف توجہ بھی دی گئی ہے اور عربی زبان کی تدریس کا معیار بلند ہو گیا ہے مگر عموماً دینی تعلیم گاہوں میں اس کی تعلیم کو بلند کرنے کی ضرورت ہے۔ متعدد دارالعلوم میں عالم عرب کی بعض حکومتوں نے عربی زبان کے اساتذہ کو معلم ——— کی حیثیت سے بھیجا ہے جن کی وجہ سے ایسے دینی مدارس میں عربی زبان کی تعلیم و تدریس کا معیار بلند ہو گیا ہے، ان حکومتوں کا یہ عمل ناقابل فراموش احسان ہے۔ لیکن تمام دینی مدارس کو اس طرف خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔

نظام تعلیم کی وحدت

برصغیر پاک و ہند پر انگریزی حکومت کے قیام سے قبل مسلمانوں کا نظام تعلیم ایک ہی تھا۔ دو طرز کی مختلف تعلیم گاہوں سے ہم مسلمان نا آشنا تھے بلکہ سارا عالم اسلام مغرب کے سیاسی و علمی غلبہ سے آزاد تھا۔ عالم اسلام دو قسم کی تعلیم گاہوں سے نا آشنا تھا۔ عہد غلامی میں علماء نے علوم دینیہ کی حفاظت کی نیز اپنے عقائد اپنی تہذیب و تمدن اور اپنی ثقافت کو محفوظ کرنے کی غرض سے برطانوی حکومت کے قائم کردہ نظام تعلیم سے، علیحدہ دینی تعلیم گاہیں قائم کیں۔ اس طرح دو قسم کے نظام تعلیم کی داغ بیل پڑی۔ پاکستان کے قیام کے بعد بھی دونوں قسم کے نظام تعلیم باقی رہے۔

اب قیام پاکستان کے بعد حالات بالکل بدل چکے ہیں، ایک ایسی حکومت قائم ہو چکی ہے جو اسلامی نظام کے قائم کرنے کی سعی کر رہی ہے لہذا قیام پاکستان سے قبل جو دو نظام تعلیم رائج ہو گئے تھے اس کو ترک کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ مدارس دینیہ کے منہاج میں صرف ان علوم کی تعلیم دی جاتی جن کا تعلق اسلامی فرائض و واجبات سے ہے۔ عصری علوم سے یہ منہاج بالکل خالی ہے۔ جغرافیہ، تاریخ، شہریت، ریاضی، اصول صحت وغیرہ جیسے مضامین سے ان تعلیم گاہوں کا منہاج تعلیم خالی ہے۔ ان تعلیم گاہوں کے فارغ التحصیل علماء کو معمولی تاریخ و جغرافیہ و شہریت سے بے خبری کی بنا پر عالمی مسائل کے سمجھنے میں دقت ہوتی تھی۔ جب میں بہاول پور میں شیخ الجامعہ تھا تو کبھی کبھی مدرسین کے تقرر کے سلسلہ میں ان کا انٹرویو بھی لیتا تھا۔ کبھی کبھی ان امیدواروں سے سوال کرتا تھا کہ پاکستان کی مغربی سرحد سے کون سا دوسرا ملک ملا ہوا ہے یا اس طرح کا دوسرا ادنیٰ سوال کرتا تو وہ یا تو خاموش رہتے یا کہتے ہمیں معلوم نہیں ہے اس میں ان کا کوئی قصور نہیں تھا کیونکہ ان کے منہاج تعلیم میں اس قسم کے مضامین نہیں تھے۔ بے چارے ان فضلاء کو جب ملک کی تاریخ، عالم اسلام کی تاریخ، ملک کا جغرافیہ ابتدائی اصول صحت اور شہریت کی کبھی تعلیم نہیں دی گئی تو عصر حاضر کے مسائل کو کس طرح سمجھ سکتے ہیں۔ ہمارا یہ ایک المیہ ہے کہ ہم میں سے بہتوں

کو اس کا احساس بھی نہیں ہے۔ ان علوم کی افادیت و اہمیت پر ایک عالم دین سے گفتگو کی گئی تو انہوں نے ان کی افادیت و اہمیت کا اعتراف کیا مگر فرمایا کہ ان کو منہاج تعلیم میں داخل کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ بطور خود طلبا کو ان کا مطالعہ کرنا چاہیے شاید اسی کا نام جمود ہے۔

مدارس دینیہ میں داخل بعض کتابوں کے طرز بیان کے متعلق کہا گیا کہ اس میں شدید ابہام و اغلاق ہے اور اس کی عقدہ کشائی میں خواہ مخواہ وقت صرف ہوتا ہے اور بلا وجہ طلبا کی توانائی صرف ہوتی ہے تو انہوں نے فرمایا اس سے تشحیذ ذہن ہوتی ہے۔

حالانکہ ان تمام کتابوں کے اسلوب کی وجہ یہ ہے کہ یونانی علوم عقلیہ کا اس قدر غلبہ ہو گیا تھا کہ ہمارے مؤلفین اپنی قابلیت کے خلاف سمجھتے تھے۔ مصر کے محمد خضری مشہور مصنف نے بھی تاریخ اصول فقہ میں علامہ محب اللہ بہاری کی چیستان نویسی کا ذکر کیا ہے، ملا محب اللہ بہاری کی سلم العلوم اور مسلم الثبوت جب سے تالیف ہوئی ہے انہیں داخل نصاب کیا گیا۔ مسلم الثبوت تو اب متروک ہوتی جا رہی ہے، اس کو پڑھانا بڑے فضل و کمال والے کا کام ہے۔ البتہ سلم العلوم کی افادیت اپنے تمام اشکال کے باوجود مسلم ہے۔ یونانی علوم عقلیہ کی تدریس کی وجہ سے ہمارے ملک کا مذاق تدریس مشکل پسند ہو گیا تھا۔ لسانی و ادبی علوم کی تدریس میں ایسی کتابیں پسند آگئی تھیں جن میں اشکال ہوتا۔ انشا پردازی میں حریری کے مقامات نمونہ بن گئے۔ یہ ایک مصنوعی زبان ہے جو کہیں کبھی بھی نہیں بولی گئی۔ حریری کے مقامات کی مقفیٰ و مسجع عبارت کا پاک و ہند میں ایسا چھاپ پڑا جسے دیکھو اس نقش قدم بلکہ نقش قلم پر چلنا اپنی کامیابی سمجھتا ہے حالانکہ اس کی حیثیت زبان و بیان کے ایک خاص طرز نگارش کی ہے جس کا مطالعہ ادب عربی کے ایک محقق کا کام ہے نہ کہ ابتدائی دور کے طالب علم کو اس کا پڑھنا مفید ہو سکتا ہے۔ عالم عرب میں تو حریری کا قلم مویلحی کا ہاتھ میں ٹوٹ گیا۔ اس کے بعد قلم کو سجع اور تک بندی کی قید سے آزادی ملی اور عالم عرب میں ابن خلدون پہلا انشا پرداز ہے جس نے نثر مرسل کی طرح ڈالی تھی۔ برصغیر میں دار العلوم ندوۃ العلماء نے پہلی بار عبد القادر جرجانی کی دلائل الاعجاز، اسرار البلاغۃ، ابن کثیر کی عقل السائد، ابن رشیق

کی کتاب العمدہ کے ذریعہ نثر مرسل سے مدارس دینیہ کو روشناس کرایا۔

عالم اسلام میں بھی نظام تعلیم کی وحدت قائم ہو گئی ہے۔ ہمارے ملک کی طرح ابتدائی مرحلہ یعنی پرائمری سے دو نظام تعلیم کا وجود نہیں ہے، پاکستان کے بعض دارالعلوم میں پرائمری کا نصاب داخل کر دیا گیا ہے۔ اب وحدت نظام کا آغاز اس طرح ہونا چاہیے کہ ثانوی تعلیم یعنی دسویں جماعت کے تمام عصری مضامین کی تعلیم پانچ سالہ کورس کو کلیۃ الدین سے قبل کی تعلیم کا جزو بنایا جائے یا کلیۃ الدین جسے دارالعلوم کہا جاتا ہے، میں داخلہ کے لیے میٹرک پاس ہونے کی شرط لگائی جائے۔

اس طرح تمام دارالعلوم کی حیثیت کلیات دینیہ کی ہونی چاہیے اور وہ علوم دینیہ کی اعلیٰ تعلیم کے مرکز ہوں گے اور جس طرح ثانوی تعلیم یعنی میٹرک کے بعد مخصوص فن و علم کے کالجز ہوتے ہیں جیسے میڈیکل کالج، زرعی کالج، انجنیئرنگ کالج، سائنس کالج، آرٹس کالج وغیرہ اسی طرح کلیۃ الدین کی حیثیت ہونی چاہیے۔

چونکہ کلیۃ الدین میں داخلہ لینے والے طلبا میٹرک پاس ہوں گے لہٰذا وہ کلیۃ الدین کی سند حاصل کرنے کے بعد علوم دینیہ کے ساتھ علوم عصریہ سے بھی واقف ہوں گے لہٰذا ان کی علمی سطح عام تعلیم یافتہ حضرات کے برابر ہو گی۔ یہ سن کر آپ حیران ہوں گے کہ جامع ازہر کا ہر خریج (سند یافتہ) کم ازکم ایک مغربی زبان سے بھی اچھی طرح واقف ہوتا ہے کیونکہ یورپ کی متعدد زبانیں منہاج میں داخل ہیں۔ پاکستان میں بھی علماء کو کوئی نہ کوئی مغربی زبان جاننا چاہیے اور چونکہ انگریزی ایک بین الاقوامی زبان ہے لہٰذا یہاں انگریزی زبان ہی کو داخل نصاب کرنا چاہیے۔ خود اسلام کی تبلیغ واشاعت کے لیے بھی انگریزی زبان کی اہمیت کا انکار نہیں کیا جا سکتا ہے، انگریزی زبان کی اہمیت کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب ایک شخص یورپ وامریکہ کا سفر کرتا ہے۔ جب تک مسلمانوں کو عالم کے مسائل میں وہ اہمیت حاصل نہیں ہوتی ہے جو دوسری قوموں کو حاصل ہے۔ علماء کو انگریزی زبان ضرور جاننا چاہیے۔ عربی وانگریزی زبان پر ہر عالم دین کو قدرت حاصل ہونی چاہیے۔

ان تمام کلیات کا ایک ہی منہاج تعلیم ہونا چاہیے۔ ان سب کا ایک ہی تنظیم کے تحت مرکز امتحانات ہونا چاہیئے۔ ان تمام کلیات کے پاس شدہ طلبا کو ایک ہی قسم کی سند ملنی چاہیئے۔ اس طرح وحدت نظام تعلیم کے تحت ان کلیات دینیہ کے فارغ التحصیل کے درمیان وحدت فکر و نظر کا رشتہ قائم ہوجائے گا اور دوسرے سند یافتہ کی طرح ان کے لئے بھی عمل کا میدان وسیع ہوجائے گا۔ انہیں علوم عصریہ سے عدم واقفیت کا طعنہ بھی نہیں سننا پڑے گا۔ نہ ان میں کبھی احساس کمتری ہوگا۔

وحدت نظام تعلیم کی کامیابی کا دارومدار پاکستان کے بڑے بڑے مدارس دینیہ کے منتظمین کے تعاون پر ہے اگر یہ حضرات ذرا وسعتِ قلب اور ژرف نگاہی سے کام لیں اور خود برصغیر کے مدارس دینیہ کے منہاج تعلیم میں جو مسلسل اصلاح و تغیر ہوتا رہا ہے نیز عالم اسلام کے معاہد ، مدارس، کلیات اور جامعات کے منہاج تعلیم میں جو صدیوں سے تغیر و تبدیلی کارفرما رہی ہے، اس کو پیش نظر رکھیں تو علوم دینیہ کے نشر و اشاعت اور بقا و تحفظ کے ساتھ ساتھ بعض عصری علوم کو داخل منہاج کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے۔ اگر تمام مدارس دینیہ کا منہاج تعلیم ایک ہو اور ان سب کا مرکز امتحان بھی ایک ہو۔ تمام کامیاب امیدواروں کو ایک ہی قسم کی اسناد بھی دی جائیں تو یہ ایک تاریخ ساز عمل ہوگا اس سے تمام مدارس کی شیرازہ بندی ہوجائے گی، ان کی اسناد کا اعتبار و وقار بھی قائم ہوگا۔ ان سب کے درمیان وحدت فکر و نظر بھی قائم ہوگی چونکہ ثانوی تعلیم کا پورا نصاب پڑھکر کلیات دینیہ میں داخل ہوں گے لہذا میٹرک تک کے تمام عصری مضامین، تاریخ، جغرافیہ، شہریت انگریزی وغیرہ جیسے مضامین کی تعلیم کی وجہ سے ان کی علمی سطح بھی دوسرے تعلیم یافتہ کے برابر ہوگی اور علوم دینیہ کی تحصیل کے بعد وہ دین کی بہتر طور پر خدمات انجام دے سکیں گے۔ اجتہاد وقت کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ جب تک نئے مسائل پیدا ہوتے رہیں گے ان کے جوابات کی ضرورت باقی رہے گی، چاند پر جانے والا ایک مسلمان کس طرح نماز

ہونا ضروری ہے تاکہ اجتہاد میں ہوائے نفس کا شائبہ نہ ہو اور نہ حکمرانوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے کوئی اجتہاد کیا گیا ہو جس کا خطرہ ہر زمانہ میں رہتا ہے۔

آج ہمارے ملک میں قانون کی تمام کتابیں انگریزی میں ہیں۔ انگریزی میں ہی قانون کی تعلیم دی جاتی ہے۔ لاء کی ڈگری رکھنے والے ہی وکالت کا پیشہ اختیار کرتے ہیں وہی عدالتوں میں اپنے موکلوں کی طرف سے مقدمات پیش کرتے ہیں۔ کیا کوئی ایسا شخص جو اعلیٰ درجہ کی انگریزی جانتا ہے اس میں تقریر و تحریر کی اعلیٰ صلاحیت ہے کیا ایسے شخص کو سپریم کورٹ یا ہائی کورٹ کے زبان دان کو قانون کی تعبیر، تشریح یا منشا قانون کو متعین کرنے کا حق ہے؟ کیا ایسا شخص قانونی موشگافیوں کے بیان کرنے کا حق رکھتا ہے یا اس کی قانونی موشگافیوں کو کوئی شخص درخور اعتنا سمجھ سکتا ہے؟ اگر محض انگریزی زبان جاننے کی وجہ سے کوئی قانون دان نہیں ہو سکتا ہے نہ قانونی موشگافیوں اور اس کی تعبیر و تشریح کا حق رکھتا ہے نہ عدالت میں مقدمات کی وکالت کر سکتا ہے نہ کسی ادنیٰ درجہ کی عدالت کا جج بن سکتا ہے تو محض تھوڑی سی عربی جاننے یا ترجمہ کی بدولت دینی معلومات کی بنا پر کوئی استنباط مسائل اور اجتہاد کا اہل کس طرح ہو سکتا ہے؟

قرآن کریم کی زبان عربی ہے تمام احادیث کے مجموعے عربی زبان میں ہیں، وحی الٰہی کی زبان عربی ہے، اس زبان کے جو دقیق اشارات، عمیق مجازات، وسیع کنایات، استعارات اور زبان و بیان کے بے شمار معانی ہیں۔ عربی زبان ایک بڑی وسیع زبان ہے۔ اس کے الفاظ کے حرکات و سکنات زیر و زبر اور پیش سے معنی میں تغیر ہو جاتا ہے تقدیم و تاخیر سے وصل و فصل سے نہ صرف معانی میں تغیر ہو جاتا ہے بلکہ عظیم تغیر ہو جاتا ہے۔ الغرض وحی الٰہی نے جس زبان کو اختیار کیا ہے اس کا گرامر اور ادب ایک بحر زخار ہے جس میں ایک عربی داں بھی آسانی سے غواصی نہیں کر سکتا ہے۔ چہ جائیکہ محض ترجمہ پڑھکر اجتہاد کرنے کی تمنا کرنے والا کس طرح مجتہد ہی بن سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں دو تین جملہ کو پیش کرکے اس زبان کی بلاغت کی طرف ایک اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔

ایک بدوی عرب جس کی زبان سند ہے ایک شخص کے متعلق کہتا ہے۔ لا ترغو ناقتہ ولا تثغو شاتہ،

اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے، اس کی اونٹنی بلبلاتی نہیں ہے اور اس کی بکری ممیاتی نہیں ہے۔ بظاہر اس کا مقصد اس کے دو جانوروں کی آواز کی نفی کرنا ہے مگر اس کا حقیقی مقصد یہ نہیں ہے بلکہ ان دونوں جانوروں کی آواز کی نفی کر کے یہ کہنا چاہتا ہے، لیس لہ ناقۃ فترغو ولیس لہ شاۃ فتثغو نہ اس کے اونٹنی ہے جو بلبلاتی ہے نہ اس کے پاس بکری ہے جو ممیاتی ہو۔ اب اگر کوئی شخص محض عربی زبان جانتا ہے تو اس کے معنی وہی سمجھے گا جو پہلے بیان کیے گئے ہیں۔ دوسرے معنی کا علم اہل زبان کو یا جس نے عربی زبان و ادب کی باضابطہ تعلیم پائی ہو اس کو ہو سکتا ہے۔ اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک حدیث ہے۔ لم یکن لرسول اللہ یطوی ثوبہ لفظی ترجمہ یہ ہے رسول اللہ کے کپڑے تہ نہیں کئے جاتے تھے مگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا عربی محاورہ کے مطابق یہ کہنا چاہتی ہیں کہ عمومی حالات میں آپ کے جسم پر جو کپڑے ہوتے تھے ان کے علاوہ کوئی دوسرا کپڑا نہیں ہوتا تھا جو تہ کر کے رکھا جاتا۔ کپڑے کے موجود ہونے کی نفی کرنا چاہتی ہیں نہ کہ تہ کر کے رکھنے کی، اب عربی زبان سے نا آشنا اس حدیث کو سن کر یہ سمجھ سکتا ہے کہ کپڑوں کو تہ کر کے رکھنا خلاف سنت ہے یعنی سنت عادی کے خلاف ہے۔

ان دو مثالوں کو پیش کر کے اس امر کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ عربی زبان ایک بڑی وسیع دقیق زبان ہے جس میں بے انتہا استعارے کنایہ اور مجازات ہیں۔ زیر و زبر و پیش و حرکت کے بدلنے سے معنی کچھ کے کچھ ہو جاتے ہیں۔ ایک دوسری مثال عرض کرنے کی جرات کرتا ہوں۔ ضُحکۃ (فُعلۃ کے وزن پر) ض پر پیش ح پر اگر زبر فتحہ، ہو تو اس کے معنی ہیں ایک ایسا شخص جو دوسروں پر خوب ہنستا ہو اور اگر ساکن ہو تو اس کے معنی ہیں ایسا شخص جس پر لوگ ہنستے ہوں۔ دونوں میں کس قدر فرق ہے۔

اس زمانہ میں مفسر بننے کے شوق میں ایسے حضرات جو عربی زبان کے ابجد سے بھی واقف نہیں ہیں نہ دوسرے علوم دینیہ سے واقف۔ چند تراجم کو سامنے رکھ کر ایک ترجمہ کر کے کتاب کو عمدہ کاغذ عمدہ طباعت کے ساتھ پیش کر کے مفسر قرآن بن جاتے ہیں، علوم دینیہ، ادبیہ، لغت، معانی و بلاغت، صنائع و بدائع، قواعد زبان سے بالکل بے خبر ہو کر چند مترجم قرآن کے انگریزی ترجمہ

کو سامنے رکھ کر قرآن کریم کا انگریزی میں ترجمہ پیش کر کے مفسر قرآن بننے کا اعلان کرتے ہیں۔ ایسے ہی ایک انگریزی زبان کے جاننے والے میرے پاس تشریف لائے اور قرآن کریم کے انگریزی میں ترجمہ کرنے کا ذکر کیا۔ میں نے دریافت کیا، کیا آپ نے عربی زبان کی باضابطہ تعلیم پائی ہے تو انہوں نے فرمایا، نہیں بس قرآن کی زبان سمجھ لیتا ہوں۔ یعنی انگریزی میں جو ترجمہ ہے اس کے ذریعہ یا اردو میں ترجمہ پڑھ لیا ہے۔ بس اتنی عربی دانی مفسر قرآن بننے کے لیے کافی ہے یہ تو علم کا حال تھا اور قرآن کریم کے احکام پر عمل کرنے کا یہ حال تھا۔ مترجم یا مفسر بننے کے لیے علوم دینیہ اور عربی زبان جاننے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ جرأت و بے کی کی ضرورت ہے اور جب نماز کا وقت آیا تو مفسر قرآن کریم اپنی جگہ بیٹھے رہے اور ان کے دوسرے احباب نماز میں شریک ہوئے۔ تقویٰ تو بڑی چیز ہے سب سے اہم عبادت سے مفسر قرآن کریم کا یہ تعلق تھا، جرأت و بے حیائی کا یہ دور ہے۔ بے عملی کے باوجود علم کے مظاہرہ کا عجب دور آیا ہے۔

اصمعی عربی زبان کا بہت بڑا راوی و شاعر ہے اس کے متعلق مؤرخین ادب نے لکھا ہے لولا الاصمعی لذہب ثلث اللغۃ العربیۃ' اگر اصمعی نہ ہوتا تو ⅓ عربی زبان ضائع ہو جاتی یہ مانا کہ اس کی جلالت کے بیان کرنے میں مبالغہ سے کام لیا گیا تھا۔ اس کے حافظہ کا یہ حال تھا کہ تین روز میں اس نے پورا قرآن یاد کیا تھا اس کے تقویٰ کا یہ حال تھا کہ اگر کوئی مشکل لفظ جو قرآن کریم میں آیا ہے۔ اس کے متعلق دریافت کیا جاتا تو وہ معنی بیان کرنے سے پہلو تہی کرتا کہ شاید یہ معنی مراد نہ ہوں اور کہتا اگر میں وہ معنی بیان کروں جو مقصود وحی نہیں تو گنہگار ہوں گا۔ یہ عربی زبان کا لغوی ادیب، شاعر اور ہزاروں عربی قصائد کا حافظ تھا مگر ایک ایسے لفظ کے معنی بیان کرنے میں جھجکتا ہے جو قرآن میں آیا ہے اور ہمارا یہ حال ہو گیا ہے کہ عربی زبان اور علوم دینیہ سے جہل تام کے باوجود اس کی تفسیر و ترجمہ کا شوق پورا کیا جاتا ہے اور ایسے ملک میں جہاں متعدد مستند و معتبر ترجمے موجود ہیں جدید ترجمہ میں کوئی نہ نکلتا ہے، نہ کوئی قابل ذکر استنباط و استدلال ہے۔

قرآن کریم کو اپنی زبان دانی کا تختہ مشق بنانے کے بجائے اگر شیکسپیئر کے ڈراموں یا دوسرے

انگریزی زبان کے ادبا و شعرا کو موضوع بنایا جاتا تو بہتر ہوتا، کلام الٰہی کے تقدس کو پامال کرنے کی کیا ضرورت ہے ؟ ۱۴ سو برس میں ایسے ہزاروں علماء گذرے ہیں جن کی مادری زبان عربی تھی عربیہ کے نکتہ داں، عربی لغت اور زبان کے قواعد کے ماہر، احادیث اور سنت کے عالم تھے۔ اس کے باوجود چند ہی علماء قرآن کریم کی تفسیر لکھی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ علماء تفسیر قرآن کریم کے معاملہ میں بے انتہا محتاط تھے۔ ان کا تقویٰ اور خشیت الٰہی مانع ہوتی تھی کہ کہیں تفسیر بالرائے کے مرتکب نہ ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے قلم سے مقصود الٰہی کے بیان کرنے میں لغزش ہو جائے۔

حرف آخر

برصغیر کی تاریخ گواہ ہے کہ علماء کبھی بھی ملک کی سیاست سے کنارہ کش نہیں رہے کیونکہ اسلام کی جامع تعلیمات کا تقاضا ہے کہ مسلمان جس ملک میں رہتے ہیں۔ اس کے سیاسی، عمرانی و اقتصادی حالات سے باخبر رہیں اور صحیح بات کی تائید اور غلط امور کی نشان دہی کرتے رہیں۔ وہ ایک طرف دین کی تعلیم و تدریس کا فریضہ انجام دیتے رہے ہیں۔ دوسری طرف ملک کی سیاسیات میں اور ملک کے انتظامی امور میں شریک رہے ہیں۔ اس حوالہ سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مدارس دینیہ کے منہاج میں انقلاب آفریں اصلاح کی ضرورت ہے۔ ایک ایسے جامع منہاج کی ضرورت ہے جس سے علماء کو عہد حاضر کے عمرانی سیاسی امور کو سمجھنے میں مدد ملے اور وہ بصیرت کے ساتھ ملک کے تمام سیاسی و عمرانی مسائل میں اپنی رائے کا اظہار کر سکیں۔ نیز علوم دینیہ میں تحقیق و جستجو اور بحث و نظر میں ان کا وہی مقام و مرتبہ ہو جو یورپ و امریکہ کی جامعات کی اعلیٰ ڈگریوں کے حاملین کا ہے۔

ایک دردمندانہ گذارش

کسی عالم دین کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ کسی ایک حزب سے وابستہ ہونے کی بنا پر

دوسرے حزب کی کسی حق بات کی تردید کرے، یا خموش رہے اور مستقل حزب اختلاف کا رول ادا کرتا رہے۔ یہ مغربی طرز سیاست ہے، یہ اسلامی نہیں ہے۔

لا یجرمنکم شنان قوم ان لا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقوی

اگر حق بات کوئی غیر مسلم بھی کہے تو اس کو حق وصحیح کہنا چاہیے۔ محض اس بنا پر اس کی مخالفت یا خموشی اختیار کرنا یہ بات غیر مسلم نے کہی ہے یا دوسرے حزب سے وابستہ شخص نے کہی ہے، اختیار صحیح نہیں ہے۔ یہ اسلامی ہدایت وتعلیم اور عدل وتقویٰ کے خلاف ہے۔ اسی طرح فروعی اختلاف کی بنا پر کسی فرد یا جماعت سے عداوت، بغض ونفرت کا معاملہ کرنا جائز نہیں ہے۔ المسلم اخو المسلم لا یسلمہ ولا یخذلہ (حدیث نبوی) ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ اسے بے یار ومددگار رہنے نہیں دے گا نہ اس سے کنارہ کش ہوگا۔ انما المومنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم (قرآن کریم) مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ اختلاف کی شکل میں ان کے درمیان صلح کرانا ضروری ہے، افراد کے درمیان بھی اور جماعتوں کے درمیان بھی یہی امر الٰہی ہے اور حکم ربانی ہے۔ اس کے اولین مخاطب علماء دین ہیں جو اللہ کے احکام کو زیادہ جانتے ہیں۔ اگر یہی حکم الٰہی کے خلاف عمل کریں گے تو عوام سے کیا توقع ہوسکتی ہے، دینی جماعتوں کے درمیان مستقل عداوت، بغض اور نفرت کے لیے کیا وجہ جواز ہے

عالم اسلام نہ صرف سائنس وٹیکنالوجی میں مغرب کا دست نگر ہے بلکہ علوم اسلامیہ پر تحقیق وجستجو کے معاملہ میں بھی یورپ وامریکہ کی جامعات سے پیچھے ہیں اور مغربی تعلیم گاہوں کا تفوق مسلم ہے آج خود عالم اسلام کی سرکاری جامعات میں یورپ وامریکہ کی ہی جامعات کی سندوں کا اعتبار ووقار ہے۔ مغربی جامعات میں علمی تحقیق وجستجو کا جو معیار قائم ہے اس کے مقابلہ میں عالم اسلام کی تعلیم گاہوں کے شعبہ تحقیقات کا وہ مقام نہیں سمجھا جاتا ہے جو مغربی ممالک کی جامعات کا ہے۔ آج ہمارے وہ حاملین اسناد جنہیں یورپ کے مسیحی ویہودی مستشرقین سند تحقیق (ڈاکٹریٹ) عطا کرتے ہیں، ان ہی کا اعتبار و

وقار ہے۔ وہی ہماری یونیورسٹیوں میں تعلیم کے فرائض انجام دینے کے اہل قرار دیئے جاتے ہیں۔ اس صورت حال کا کون ذمہ دار ہے؟ یقیناً ہمارے دارالعلوم میں تحقیق و جستجو کا وہ انتظام نہیں ہے جو یورپ میں ہے۔ ہماری خود اپنے علوم دینیہ و عربیہ میں زبوں حالی کا جب یہ حال ہے تو دوسرے عصری علوم کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اب تک ہم اپنے علوم دینیہ میں نیز تاریخ اسلام اور ادب عربی میں تحقیق و جستجو کا شعبہ بھی قائم نہیں کر سکے ہیں۔ ابھی تو ہم علم و فن کی تعلیم کی بجائے کتابوں کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔ ہماری ساری توانائی کتابوں کی مشکل عبارت کے حل کرنے میں صرف ہو رہی ہے۔ یقیناً جدید منہاج میں انقلاب آفریں اصلاح کی ضرورت ہے، ہم ہمہ گیر اصلاح کرکے ہی زمانہ کے تقاضوں کو پورا کر سکیں گے۔ تمام علوم کی نئی ترتیب و تبویب اور جدید تالیف کے ذریعہ ہم اپنی تعلیم گاہوں کا مزاج بدل سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں عالم عرب کی مشہور تعلیم گاہوں کے منہاج سے بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

لیکن یہ عظیم تاریخ ساز کام کون انجام دے سکتا ہے؟ وحدت نظام تعلیم، منہاج تعلیم میں انقلاب آفریں اصلاح کا کام، علوم میں مغربی طرز کی تحقیق و جستجو کا کام کس طرح انجام پذیر ہو سکتا ہے؟ ہمارے بڑے بڑے مشہور دارالعلوم کے منتظمین اعلیٰ اگر اس مقصد سے متفق ہوں تو ایک کمیشن کے ذریعے اس کام کا آغاز کیا جا سکتا ہے اور رفتہ رفتہ اس کمیشن کی سفارشات کو بروئے کار لاکر تمام دینی درسگاہوں کے معیار تعلیم کو بلند کیا جا سکتا ہے، یقیناً یہ کام ہفتوں میں نہیں ہو سکتا ہے بلکہ اس میں کچھ عرصہ لگے گا۔ اگر کام کا آغاز ہو جائے تو تکمیل بھی ہو سکتی ہے۔

تعلیم و تعلّم کے اس نازک پہلو پر تفہیم دین

حیوانیات کی تدریس

.... کا نظریاتی پہلو

مسلم سجاد



انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد

درس نظامی میں تبدیلی کا مسئلہ

مولانا سید محمد متین ہاشمی رح

برطانوی استعمار کے تسلط سے قبل برصغیر پاک وہند میں جو نظام تعلیم رائج تھا اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں دینی اور دنیوی تعلیم کی ثنویت کا کوئی تصور نہیں تھا۔ ایک ہی نصاب تعلیم کے تحت تعلیم پانے والے طلبہ اور فارغ التحصیل لوگ اپنے اپنے مزاج کے مطابق اپنی زندگی کے لیے میدان منتخب کر لیتے اور پھر ملک وقوم کی خدمات انجام دیتے۔ انہی مدارس سے محدث مفسر بھی پیدا ہوتے، منطقی اور فلسفی بھی، صناع اور کاریگر بھی عمال حکومت اور فوجی بھی۔ اس کا فائدہ یہ تھا کہ دین و دنیا کی ثنویت کا کوئی غیر اسلامی نظریہ نہ تھا اور نہ دو متحارب و متخالف طبقے تھے ہر طالب علم دنیاوی و دینی مسائل سے واقفیت رکھتا تھا اور ہر دینی علوم کا جاننے والا عصری تقاضوں سے واقف ہوتا تھا۔ ایک ہی ماحول میں تعلیم پانے اور زندگی گزارنے کے باعث ایک دوسرے کو سمجھنے اور ایک دوسرے کے نظریات سے آگاہی حاصل کرنے کے مواقع پوری طرح موجود تھے، جب برطانوی سامراج نے برصغیر کو اپنے تسلط میں لیا تو اس نے یہ محسوس کیا کہ جب تک مسلمانوں کو منتشر نہیں کیا جائے گا نہ ان کی قوت ٹوٹے گی نہ دوبارہ اقتدار حاصل کرنے کا ان کا جذبہ ماند پڑے گا چونکہ برطانوی اقتدار کی سب سے زیادہ مخالفت علماء نے کی تھی۔ اس لیے انہوں نے تمام اوقاف پر قبضہ کر لیا جن کے ذریعے مدارس اور علماء کی پرورش ہوتی تھی۔ اس طرح مدارس اور علماء دونوں معاشی اور اقتصادی لحاظ سے کسمپرسی میں گرفتار ہو گئے۔

ادھر سر سید احمد خاں مرحوم نے مسلمانوں کو اعلیٰ مناصب دلانے کے لیے پہلے غازی پور میں اور بعد میں علی گڑھ میں جدید علوم کے مدارس کا ڈول ڈالا۔ سر سید احمد خان کی تحریک دنیاوی طور پر اصلاحی تحریک تھی اور نیک نیتی پر مبنی تھی۔ علی گڑھ اور دارالعلوم دیوبند کے نظریات میں جوہری اختلاف نہیں پایا جاتا جو اختلاف نظر آتا ہے اسے طریق کار کے اختلاف کا نام دیا جا سکتا ہے۔ غلامی آ چکی تھی اور اٹھارہ سو ستاون کی مسلح جدوجہد آزادی کی ناکامی کے بعد سر سید احمد خان نے یہ محسوس کیا کہ کہیں جدید تعلیم میں سبقت حاصل کر کے ہندو انگریز کے زیر سایہ مسلمانوں پر تسلط نہ حاصل کر لے اس لیے انہوں نے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کے حصول کی طرف متوجہ کیا اور پوری دلسوزی کے ساتھ اس کام کو انجام دیا۔

علماء دیوبند نے یہ دیکھ کر کہ برطانوی سامراج نے جن جن اسلامی ممالک پر اپنا تسلط قائم کیا ہے وہاں کے مسلمانوں کی دینی اقدار کو پامال کیا اور پوری کوشش کے ساتھ ان کے دل و دماغ کو عیسائی بنایا یہ ضروری سمجھا کہ خیرات کی روٹیاں کھا کر اور چٹائیوں پر بیٹھ کر دینی علوم اور اسلامی تہذیب کی حفاظت کی جائے اور کمال دیانتداری سے اسلاف کے اس ورثے کو آنے والی نسل تک منتقل کر دیا جائے۔ ایسے مواقع پر ہر جماعت متشدد ہو جاتی ہے اور اس کا تشدد اور تصلّب ہی اس کی بقا کا ضامن ہوتا ہے کیونکہ جب باہر سے حملہ ہو رہا ہو تو قلعے کے ہر سوراخ کو بند کرنا ضروری ہوتا ہے۔ دونوں جماعتوں کے اس طرز عمل نے ایک ناقابل عبور خلیج مسلمانوں کے دونوں طبقات کے درمیان پیدا کر دی۔ جدت پسند جدت پرست بن گئے اور قدامت پسند قدامت پرست ایک جماعت نے مغرب سے آئی ہوئی ہر چیز کو آمنا و صدقنا کہا اور دوسری جماعت نے اسے کفر و الحاد گردانا۔ یہ صورت حال اب تک باقی ہے۔ عوام اپنے مسائل کے حل کے لیے کبھی علماء کے پیچھے چلنے لگتے ہیں اور کبھی بقول غالب جدت پرست کے۔

دو چار گام چلتا ہوں ہر راہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی رہبر کو میں!

قیامِ پاکستان کے بعد چونکہ اقتدار جدت پسند طبقے کے ہاتھ میں آیا اس لیے انہوں نے مغربی افکار اور مغربی علوم کے لیے پاکستان کے دروازے چوپٹ کھول دیے اور بقول جوش یہ حال ہے۔

چال انگریزی ڈھال انگریزی جسم کا بال بال انگریزی

جسم ہندی میں جان انگریزی اور منہ میں زبان انگریزی

تحریکِ پاکستان کا وقت ایسا وقت تھا جس میں اسلامی حکومت کے قیام کا نعرہ سن کر علماء نے بھی اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور جدت پسند طبقے کی قیادت کو وقتی طور پر تسلیم کر لیا۔ چونکہ صحیح معنوں میں اسلامی حکومت ابھی تک قائم نہیں ہو سکی اس لیے علماء کی جماعت جدت پسند طبقے سے برسرِ پیکار ہے اور علماء نے بھی محراب و منبر کو اور جدت پسند طبقے نے ایوانِ حکومت کو اپنا مرکز بنا رکھا ہے قوم خاموش تماشائی کی طرح کھڑی ہے۔ نہ نظریات پروان چڑھ رہے ہیں اور نہ صحیح معنوں میں ترقی ہو رہی ہے۔

مسئلے کا حل

میرے خیال میں مسئلے کا حل یہ ہے کہ نظامِ تعلیم کو اس طرح مرتب کیا جائے کہ اسلاف کی روایات کا تحفظ بھی ہو اور عصری تقاضوں کو بھی نظر انداز نہ کیا جائے۔

اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اسلامیات کو کالجوں میں داخل کر دینے سے اور انگریزی اور سائنس کو درسِ نظامی میں سمو دینے سے ہمارا موجودہ مسئلہ حل ہو جائے گا تو غلط ہے۔ اس اقدام سے شتر گربگی پیدا ہو گی جو دونوں میں سے کسی طبقے کے لیے مفید نہیں ہو گی۔

۱۔ دینی مدارس سے فارغ ہونے والے افراد کے لیے امامِ مسجد اور خطیب ہونا ہی کافی نہیں بلکہ انہیں تمام شعبہ ہائے حیات میں موثر کردار ادا کرنا چاہیے اور اس کے لیے مدارس کے نظام میں تبدیلی کی اشد ضرورت ہے۔ موجودہ مدارس سے فارغ ہونے والے طلبہ میرے خیال میں صحیح معنوں میں خطیب بھی نہیں ہوتے صرف چند روایات

اور اختلافی مسائل کے حافظ ہوتے ہیں اور امت میں افتراق و انتشار پیدا کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن و سنت کا جو صحیح علم ہونا چاہیے باوجود آٹھ دس سال لگانے کے ان کی دسترس میں وہ علوم نہیں آتے اس لیے کہ ان کے آٹھ سالہ دور تعلیم میں ان کے چھ سال صرف علوم آلیہ کی تحصیل پر صرف ہوتے ہیں۔ ساتویں سال میں وہ "موقوف علیہ" پڑھتے ہیں اور آٹھویں سال میں" دورہ حدیث " موقوف علیہ میں وہ صرف جلالین شریف پڑھتے ہیں جسے تفسیر سے زیادہ ترجمہ کہنا چاہیے، اور بعض مدارس میں تبرکاً تفسیر بیضاوی جو صرف سورۃ بقرۃ تک پڑھائی جاتی ہے متداول ہے۔ حدیث کی صرف ایک کتاب مشکواۃ پڑھائی جاتی ہے اور اس کے پڑھانے کا طرز یہ ہے کہ اختلافی مسائل مثلاً آمین بالجہر رفع یدین اور قرأت خلف الامام پر طویل بحثیں ہوتی ہیں۔ ان بحثوں کا نتیجہ یہ ہے کہ علم حدیث جو حقیقی معنوں میں علم الاخلاق، علم الاقتصاد، عمرانیات، علم المعاملات اور علم الاعتقاد کا جامع ہے۔ محض چند فروعی مسائل کا مجموعہ معلوم ہوتا ہے اس سے طلبہ میں کج بحثی اور فرقہ واریت پیدا ہوتی ہے۔ دورہ حدیث کا مطلب میرے خیال میں "دوڑ دو" ہے۔ یعنی چند اختلافی مباحث کے سوا شاگرد خاموش بیٹھا رہتا ہے اور استاد متن حدیث کی تلاوت کرتا جاتا ہے اس طرح کتاب ختم ہو جاتی ہے۔ چونکہ امتحان میں وہی اختلافی مسائل پوچھے جاتے ہیں اس لیے شاگرد پوری کوشش اور محنت سے دلائل اور مخالف حدیث کی توجیہات یاد کرتا ہے اور پھر اسے سند الفراغ دے دی جاتی ہے۔

نصاب میں تبدیلی

درسِ نظامی کا موجودہ نصاب اس زمانے کی ضروریات اور تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر بنایا گیا تھا جس زمانے میں اس کی تدوین ہوئی تھی اب حالات یکسر تبدیل ہو چکے ہیں اس لیے نصاب کو بھی

تبدیل ہونا چاہیے۔ نصاب کو تبدیل کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس تعلیم کے اغراض ومقاصد کا تعین کرلیا جائے جو میرے خیال میں حسب ذیل ہیں۔

الف) قرآن وسنت میں بصیرت تامہ کا حصول۔

ب)۔ اسوہ حسنہ کی روشنی میں تعمیر سیرت وکردار۔

ج) تبلیغ واقامت دین۔

د) نظریۂ پاکستان سے مکمل وابستگی۔

ہ) تزکیہ نفس۔

و) عصری علوم سے حسب ضرورت واقفیت۔

ان مقاصد کے حصول کے لئے میرے خیال میں ضروری ہے کہ ابتدائی دو سالوں میں علوم آلیہ مثلاً صرف ونحو ابتدائی عربی ادب بلاغت، ابتدائی منطق وفلسفہ قدیم کی تکمیل کرائی جائے یہاں تک کہ متعلم عربی عبارت پڑھنے اور ترجمہ کرلینے پر قادر ہوجائے بعد کے چار سالوں میں عقائد و کلام فلسفہ جدید کے مبادیات منطق جدید ترجمہ قرآن مکمل، فقہ مکمل تاریخ عالم وتاریخ اسلام جغرافیہ مبادیات سائنس، انگریزی، اصول فقہ، اصول حدیث، اصول تفسیر فلسفہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی پڑھا دیا جائے بقیہ دو سالوں میں تفسیر کی ایک اہم کتاب (میرے خیال میں تفسیر قرطبی) پڑھائی جائے اور کوئی ایک جدید تفسیر (مثلاً تفسیر سید قطب یا کوئی بھی تفسیر بطور مطالعہ) داخل درس رہے۔ دورہ حدیث کو دو سالوں میں تقسیم کیا جائے۔ سال اول میں موطا امام مالک، شرح معانی الآثار، ابو داؤد شریف، سنن نسائی اور سال دوم میں صحیحین، ابن ماجہ، نخبۃ الفکر، موطا امام محمد ترمذی پڑھائی جائے۔

نظام درس نظامی

درس نظامی کے نظام میں اس وقت طوائف الملوکی ہے نہ تو داخلوں کا کوئی نظام نہ امتحانات کا اور نہ ہی نصاب کا، اگر اس خودرو نظام کو کنٹرول نہ کیا گیا تو بے شمار مفاسد پیدا ہوں گے، چونکہ درس نظامی

کے مدارس عموماً عوام کے تبرعات پر چلتے ہیں اس لیے سب کے سب خود مختار ہیں اور اگر کسی قسم کی پابندی حکومت کی طرف سے لگانے کی کوشش کی جائے گی تو امکان ہے کہ ان مدارس سے جو لوگ وابستہ ہیں وہ حکومت کے خلاف صف آراء ہو جائیں ان کو قابو میں کرنے اور نظم و ضبط کا پابند بنانے کے لیے ضروری ہے کہ وفاق اور تنظیم ملک میں قائم ہیں۔ (مثلاً وفاق المدارس، احناف وفاق المدارس اہل حدیث وفاق المدارس شیعہ، تنظیم المدارس احناف بریلوی) کی انتظامیہ پر مشتمل ایک بورڈ بنایا جائے۔ اور اس میں چند مشہور یونیورسٹیوں کے وائس چانسلروں اور عربی و اسلامیات کے صدور شعبہ نیز ماہرین علوم دینیہ کو شامل کیا جائے اور تمام مدارس کو اس بورڈ سے الحاق کرنے کی اجازت دی جائے جو مدارس الحاق نہ کریں حکومت یا حکومت سے متعلق خود مختار ادارے ان کو تسلیم نہ کریں اس طرح امکان ہے کہ آئندہ پچاس برس میں درس نظامی کے مدارس کسی نظم و ضبط کے پابند ہو جائیں۔

۲۔ میرے خیال میں نصابی کتب کی از سر نو تحریر کی ضرورت نہیں بلکہ جو کتب موجود ہیں ان سے بخوبی کام چلایا جا سکتا ہے اور جن کتابوں کے بارے میں یہ خیال ہو کہ وہ بہت مفید ہیں چاہے وہ کسی زبان میں ہوں انہیں داخل نصاب کیا جائے۔

۳۔ اساتذہ کا ریفریشر کورس بہت مفید ثابت ہوگا اس کے لیے سب سے مناسب ادارہ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد ہے یہ کام اس کے ذمہ لگایا جا سکتا ہے

۴۔ ہمارے ملک کے تمام دینی مدارس کسی نہ کسی مسلک سے وابستہ ہیں ان میں بعض تو متشددانہ انداز میں اور بعض معتدلانہ انداز میں اس مسئلے کو چھیڑنا بہتر نہیں ہوگا صرف تبلیغ کے ذریعے مسلکی تشدد اور زہرناکی کو کم کرنا چاہیے۔ اپنے اپنے مسلک کے ساتھ کامل وابستگی اور تصلّب کوئی بری چیز نہیں نہ اس سے قوم و ملک کو کوئی نقصان پہنچتا ہے۔ البتہ اگر یہ تصلّب و تشدد عوام کی سطح پر آجائے اور اختلاف مخالفت کی شکل اختیار کرے تو سخت نقصان دہ ہے اس لیے حکومت سے درخواست کی جا سکتی ہے کہ وہ مختلف مسالک کے درمیان منافرت پیدا کرنے والوں کا کڑا احتساب کرے۔

میرے خیال میں نئی نسل ان مسلکی تضادات اور تعصبات سے اکتا چکی ہے۔ فرقہ وارانہ کشیدگی اور تصادم پیدا کرنے والے عناصر عوام کی جہالت سے فائدہ اٹھاتے ہیں اگر دینی تعلیم عام ہو جائے اور معتدل نظریے کے حاملین علماء کی ایک اچھی خاصی کھیپ پیدا ہو جائے تو رفتہ رفتہ یہ تضادات کم ہو سکتے ہیں اور منافرت دور ہو سکتی ہے تاہم اس کے لیے نہایت خاموشی سے اور معتدل انداز میں دوررس اقدامات کرنا ہوں گے۔

۵۔ اس وقت ہمارے ملک میں بیک وقت دو نظام (جدید تعلیمی نظام + درس نظامی) رائج ہیں۔ ان کا کسی صورت میں بھی رائج رہنا مناسب نہیں کیونکہ یہ دور غلامی کی یادگار ہیں ان دونوں نظاموں کو قریب لانا اشد ضروری ہے، اور اس کی صورت یہ ہے کہ اساتذہ کے لیے ریفریشر کورسز ترتیب دیے جائیں جن میں ہر دو نظام ہائے تعلیم کے اساتذہ شرکت کریں جتنے تعلیمی بورڈ بنائے جائیں ان سب میں ہر دو نظام ہائے تعلیم کی نمائندگی ہو۔ موجودہ اسکولوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب تعلیم کو یکسر تبدیل کرنا ہوگا تاکہ انجینئر، ڈاکٹرز اور سائنسدان ضرور بنیں لیکن اول مسلمان اور پاکستانی ہوں۔ یہ کام جتنا ضروری ہے اتنا ہی آسان بھی ہے۔ اللہ کے فضل وکرم سے اس وقت نوجوانوں کے ذہن اس طرح کے نظام تعلیم کو قبول کرنے کے لیے پوری طرح تیار ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ اقدام کرتے وقت ہمیں نئے نصاب تعلیم کے تحت نئی کتابیں بھی تیار کرنا ہوں گی۔

اس مختصر سے مقالے میں راقم الحروف نے چند ضروری اشارات کر دیے ہیں ویسے یہ موضوع اتنا اہم ہے کہ اس پر ایک پوری تصنیف کی ضرورت ہے۔

اند کے پیش تو گفتم غم دل ترسیدم
کہ تو آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

ڈاکٹر انعام الحق کوثر

کے عملی مشاہدات اور تحقیق و رہنمائی کی دستاویز

بلوچستان کے تعلیمی ادارے

اور نظم و ضبط کا مسئلہ

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد

درسِ نظامی: نصاب میں تبدیلی؟

مفتی سید سیاح الدین کاکاخیل رح

ان اریدالا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب

متحدہ ہندوستان میں جتنے بھی دینی مدارس تھے اوراب موجودہ انڈیا اور پاکستان میں ہیں ان میں جو کتابیں پڑھائی جاتی تھیں اوراُن کا جو نصابِ تعلیم تھا عام طور سے اس کو درسِ نظامی کہا جاتا ہے۔ درسِ نظامی کا یہ عنوان ہمیشہ سے اور ہر مدرسہ میں صرف چند مخصوص کتابوں کے لیے نہیں تھا کہ ان میں کمی بیشی نہ ہو سکے بلکہ مختلف زمانوں میں اور مختلف مدرسوں میں بعض کتابیں نکالی جاتی تھیں اوران کی جگہ بعض دوسری کتابیں شامل کی جاتی تھیں۔

درسِ نظامی کا نام اس کے اوّل تجویز کرنے والے مولانا نظام الدین سہالوی رحمۃ اللہ کی نسبت سے رکھا گیا تھا مگر دیکھا جاتا ہے کہ مولانا نظام الدین کے بعد پیدا ہونے والے مصنفین کی کتابیں بھی اس نصاب میں شامل ہیں اور مسلسل شامل ہوتی رہی ہیں اس لیے درس نظامی کی کتابوں میں اگر حالات کے اعتبار سے بعض کتابیں اب خارج کی جائیں اور بعض اور مفید کتابیں جن کا شاملِ نصاب کرنا حالات زمانہ کے اعتبار سے ضروری ہو شامل کی جائیں تو اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا اور یہ نہ اسلاف کے طریقے سے روگردانی ہوگی اور نہ یہ ضروری ہے کہ وہ فوائد فوت ہو جائیں گے جو درسِ نظامی کے پڑھنے سے حاصل ہوتے رہے ہیں۔

درسِ نظامی کا بنیادی مقصد تجویز کرنے والوں کے ہاں یہ تھا کہ پڑھنے والے طلبہ ان تمام علوم وفنون پر حاوی ہوں جن کا اچھی طرح پڑھنا، سمجھنا قرآن وحدیث اور فقہ واصول فقہ اور علم کلام کے لیے ضروری ہے۔ اُس وقت کے حالات کے اعتبار سے فلسفۂ قدیمہ کو پھر اس

نیک الأدب کے ساتھ پڑھنا ضروری سمجھا گیا تھا کہ اِس یونانی فلسفہ کی بنیاد پر بہت سے لوگوں نے قرآن و حدیث کے حقائق میں شکوک وشبہات پیدا کئے تھے اور ان کی وجہ سے بہت سے لوگوں کے ہاں اسلام کے بنیادی عقائد متزلزل ہو رہے تھے تو ان حالات میں ضرورت محسوس کی گئی تھی کہ پہلے یہ فلسفہ پڑھا جائے تاکہ یہ معلوم ہو کہ وہ مسائلِ فلسفیہ کیا ہیں اور اُن کی حقیقت کیا ہے اور پھر قوی عقلی دلائل سے یہ ثابت کیا جائے کہ یہ سارا فلسفہ محض سفسطہ اور مغالطہ انگیزی ہے اور واقع میں اِن مسائل کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ تو اُن کو ضعیف اور غلط قرار دینے کے ذریعے اصل اسلامی عقاید و افکار کو صحیح ثابت کیا جائے اور ان شکوک وشبہات کا ازالہ ہو۔ امام غزالیؒ نے اسی نظریہ کے مطابق مقاصد الفلاسفہ اور پھر تہافۃ الفلاسفہ لکھا اور دوسرے متکلمینِ اسلام رحمہم اللہ تعالیٰ نے بھی یہی طریقہ اختیار فرمایا تھا۔ الغرض یونانی فلسفہ کسی درجہ میں بھی اصل مقصد نہیں تھا بلکہ حالات کی مجبوری سے دین کی حمایت وحفاظت کے جذبے سے اُس کا علم حاصل کرنا ضروری سمجھا گیا تھا البتہ علم منطق کی خود ایک ضرورت تھی کیونکہ علم منطق کی کتابوں کو کماحقہ پڑھنے کے نتیجے میں اذہان کی تشحیذ ہو جاتی ہے اور ایسا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے کہ ہر علم کی مُغلَق سے مُغلَق عبارت کے سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ ان علوم کے لیے کتابوں کی تخصیص ضروری نہیں تھی اسی لئے کبھی کچھ کتابیں بدل کر اُن کی جگہ کچھ اور نئی کتابوں کا اضافہ کیا جاتا تھا بعض مدرسین" درسِ نظامی کی ان محدود کتابوں سے تجاوز کر کے ان کتابوں کے پڑھانے کے بعد بہت سے قدیم مُصنفین کی کتابیں مثلاً الأُفُقُ المُبین شرح اشارات یا مواقف کی شرح وحواشی اور قدیمہ وجدیدہ اور اسفار اربعہ اور شرح مطالع الانوار وغیرہ پڑھایا کرتے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ درسِ نظامی ماضی کے ہر دور میں نہایت ہی کامیاب ثابت ہوا ہے۔ اور اس کے پڑھنے والوں نے بشرطیکہ صحیح طریقے پر پڑھا ہو ہمیشہ اونچا مقام حاصل کیا ہے بڑے بڑے جیّد علماء جو تمام علوم پر اچھی طرح حاوی ہوتے تھے اور اُنہوں نے بہت سے علمی اور عملی کارنامے سرانجام دیے ہیں۔ اسی درسِ نظامی سے پیدا ہوئے، اس لئے آج کل درسِ نظامی کا نام لے کر اس پر جو تنقید کی جاتی ہے یہ بالکل بے جا ہے اور کچھ فیشن سا

بن گیا کہ ہر کوئی اُٹھتا ہے اور اس انداز سے گفتگو کرتا ہے کہ گویا اس نصابِ تعلیم نے کوئی فائدہ نہیں پہنچایا اور اس کو یکسر بدلنا چاہیے اور اس کی جگہ کوئی نیا نصاب مرتب کر کے دینی مدارس میں رائج کیا جانا چاہیے۔ اس تنقید کی بنیادی وجہ یہ ہوتی ہے کہ چونکہ ان کتابوں کے پڑھنے پڑھانے میں زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے اور اس موجودہ دور میں آسانی کی تلاش رہتی ہے۔ نظریہ یہ ہے کہ علمی استعداد پیدا ہو یا نہ ہو لمبی چوڑی سند حاصل کر کے دستارِ فضیلت سر پر باندھا جائے اور عالم بننے کا دعویٰ ہو سکے۔

اِس لیے میری رائے میں اس انداز کے ساتھ سابقہ علمی خدمات پر پانی پھیرنے اور مخالف تبصرے کرنے کے بجائے یہ سوچا جائے کہ صحیح معنوں میں عالم بننے کے لیے موجودہ دور اور موجودہ حالات میں اُس درسِ نظامی کی کن کتابوں کو باقی رکھا جائے اور کن کتابوں کو بدل کر اُن کے بجائے دوسری ایسی کتابیں رکھی جائیں جو علمی طور پر اونچے معیار کی ہوں اور اُن کے پڑھنے سے اصل مقصد حاصل ہو سکے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ ہمارے اسلاف نے ہر دَور میں کتابوں کی تبدیلی اور کمی بیشی کا اہتمام کیا ہے اور حالات کے مطابق ردّ و بدل کو جائز سمجھا ہے لیکن اس کا خیال ضرور رکھا ہے کہ متبادل کتابیں اصل مقصد کے لیے مفید ثابت ہوں۔ میری رائے میں فلسفۂ قدیمہ کی کوئی ایک دو کتابیں تو نصاب میں ضرور رکھی جائیں کیونکہ اگرچہ ہمیں اب اس کی خود کوئی ضرورت نہیں لیکن ہمارے تمام دینی لٹریچر میں وہ اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں اس لیے اس عظیم ذخیرہ سے استفادہ کرنے کے لیے اُن اصطلاحات کا جاننا ضروری ہے البتہ اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ اُن پر اتنی محنت کی جائے جتنی محنت پہلے ہوا کرتی تھی اور ان کے پڑھنے پڑھانے پر اتنا وقت صرف کریں جتنا پہلے صرف کیا کرتے تھے۔ ان کتابوں کے بجائے جو جدید نظریات ہیں اور جن نظریات کی بنیاد پر پوری مغربی تہذیب اور بڑے بڑے ملکوں کے نظام چل رہے ہیں ان کو پڑھایا جائے اس حد تک کہ مدارس دینیہ کے طلبہ اس ہر نظریے کی حقیقت کو سمجھ سکیں اور پھر ساتھ ہی ہر ایک نظریہ کی تردید عقلی دلائل کے ساتھ بھی

ہو اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں بھی ان پر تنقید ہو مثلاً ہیگل کے فلسفہ جدلیت اور اس کی بنیاد پر کارل مارکس کے نظریۂ اشتراکیت میکیاولی کے فلسفۂ اخلاق ڈارون کے فلسفۂ ارتقاء اور فرائڈ کے نظریۂ جنسیت کے بارے میں ایسی کتابیں اردو میں مرتب کی جائیں جن کو بطور نصاب پڑھایا جا سکتا ہو اور یہ کتابیں ایسے مصنفین سے تصنیف کرائی جائیں جن کو پوری طرح ان فلسفوں پر عبور حاصل ہو اور انہوں نے اصل ماٰخذ کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ان کی پوری حقیقت کو سمجھا ہو تاکہ پڑھنے والے طلبہ کو صرف سرسری اور سُنی سنائی باتیں نہ بتائی جائیں بلکہ مستند حوالوں کی روشنی میں ہر فلسفہ کی اصل حیثیت اور بنیادی اصول بتائے جائیں۔ یہ کتابیں ان دینی مدارس میں باقاعدہ پورے اہتمام کے ساتھ اور طلبہ کو اچھی طرح سمجھا کر پڑھائی جائیں اور پھر اس کے ساتھ ساتھ ان میں سے ہر فلسفہ کی خامیاں کمزوریاں اور خلافِ حقیقت ہونا بھی اچھی طرح سمجھایا اور پڑھایا جائے۔

اِسی طرح دینی مدارس میں تاریخ پڑھانے کی بھی ضرورت ہے۔ یوں تو تاریخ ایک وسیع اور نہ ختم ہونے والا مضمون ہے تاریخی معلومات کی وسعت کے لئے مستقل مطالعہ کی ضرورت ہے لیکن درجہ وار اجمالی تاریخ پڑھانا تاکہ اس مضمون کے ساتھ طلبہ کو اُنس پیدا ہو اور پھر وہ خود مطالعہ کر سکیں کسی حد تک نصاب میں رکھنا بھی وقت کی ضرورت ہے اس کے لیے بھی اگر آسانی کی خاطر اُردو کی کتابیں تجویز کی جائیں تو بہتر ہوگا۔ جماعت وار ترتیب یوں رکھی جائے کہ ایک کتاب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ اور آپ کے دورِ سعادت کے حالات کے بارے میں ہو دوسری کتاب خلفاء راشدین کے حالات پر مشتمل ہو، تیسری کتاب بنی امیہ کے حالات پر ہو اور اُن میں سے حضرت عمرؒ بن عبدالعزیزؒ کا دور ذرا تفصیل سے پڑھایا جائے اور چوتھی کتاب دورِ عباسیہ پر مشتمل ہو ان کتابوں کے پڑھنے سمجھنے اور یاد کرنے میں طلبہ کو کوئی خاص دقت نہیں ہوگی اور ان کا زیادہ وقت خرچ ہوگا میری رائے میں ندوۃ المصنفین اعظم گڈھ کی کتابیں اس مقصد کے لیے زیادہ مفید ہیں جن سے یہ کام لیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح علامہ خُضری کی کتاب التشریع الاسلامی بھی فقہ کی کسی کتاب کے ساتھ پڑھائی جائے تاکہ تدوین فقہ کی تاریخ بھی ان کے

سامنے ہو۔ موجودہ دور میں علم معیشت نے بھی خاص اہمیت حاصل کی ہے۔ دینی مدارس کے طلبہ کو اس مضمون کی اہمیت کے پیش نظر کسی حد تک اس سے واقف ہونا ضروری ہے۔ لہذا اردو میں کوئی ایسی کتاب تجویز کی جائے کہ اس کے ذریعے ان کو اس علم کی بنیادی معلومات حاصل ہوں اور اس کے ساتھ اسلام کا معاشی نظام بھی باقاعدہ دلائل کے ساتھ پڑھایا اور سمجھایا جائے۔

جغرافیہ پڑھانے کا بھی اسی طرح اہتمام کیا جائے کہ درجہ وار ہر جماعت میں اس کے کچھ حصے ضروری حد تک پڑھائے جائیں اور نقشوں کے ذریعے مختلف ممالک کے بارے میں ان کو واقف بنایا جائے۔ مثلاً پہلے درجہ میں پاکستان کا جغرافیہ، دوسرے درجے میں ایشیا کا جغرافیہ، تیسرے درجے میں یورپ کے ممالک کا تعارف کرایا جائے، پانچویں درجے میں امریکہ کے بارے میں ان کو معلومات فراہم کی جائیں۔ سیاسیات اور شہریت کے لئے کتابیں منتخب کر کے ان کو مطالعہ کے لئے دی جائیں اور لازمی مطالعہ کے ذریعے انشاءاللہ وہ خود بہ خود معلومات حاصل کر سکیں گے۔

بامقصد ادبی ذوق پیدا کرنے کے لیے اساتذہ اپنے طلبہ کو ترغیب دیا کریں کہ وہ اردو فارسی میں کلام اقبال اور کلام اکبر کا مطالعہ کریں اور پسندیدہ اشعار یاد کیا کریں۔ پاکیزہ ادبی رسائل کا مطالعہ بھی کیا کریں۔

میری رائے میں نصابی کتابوں کی تبدیلی سے بڑھ کر اہم چیز طریقۂ تعلیم و تدریس ہے۔ اب تک تفسیر و حدیث اور فقہ پڑھاتے وقت جن مسائل پر زیادہ زور دیا جاتا تھا اور جن پر اساتذہ اور طلبہ دونوں اپنا سارا زور صرف کرتے تھے وہ زمانۂ ماضی سے تعلق رکھتے تھے ہمارے اس دور میں قدیم معتزلہ اور ان کے اعتراضات و شکوک شبہات موجود نہیں بلکہ اُن کی جگہ اس دور کے جدید معتزلہ نے جو عقلیت پسندی کے زعم باطل میں مبتلا ہیں نئے نئے مسائل کھڑے کئے ہیں اور نئے نئے شبہات پیدا کر رہے ہیں۔ اب دین کی خدمت یہ ہے کہ تعلیم و تدریس میں ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ ہم طلبہ کو ایسے اسلحہ سے مسلح کریں اور وہ معلومات دے دیں کہ وہ مدارس سے نکل کر ہر میدان میں تقریر و تحریر کے ذریعے اس نئے دور کے معتزلہ کا مقابلہ کر سکیں۔ مثلاً فقہ میں خاص طور پر ہدایہ اخیرین پڑھاتے وقت معاملات کے ان مسائل کو جو وہاں ذکر ہیں موجودہ دور کے

معاملات پر منطبق کیا کریں تاکہ یہ معلوم ہو کہ یہ کتاب صرف آٹھ ۸۰۰ سو سال پہلے کے زمانۂ ماضی کے لیے نہیں بلکہ اس پندرھویں صدی میں بھی اس سے ہم رہنمائی حاصل کر کے اپنے معاملات کو شرعی طریقے پر چلا سکتے ہیں اسی طرح ترمذی شریف اور بخاری شریف پڑھاتے ہوئے بھی سابقہ طریقۂ کار کو بدل دیں اور معاملات اور دوسرے اجتماعی مسائل احادیث کی روشنی میں حل کیا کریں اور اساتذہ اور طلبہ دونوں اپنی ساری ذہانت اور قوت مطالعہ و تدریس اسی پر صرف کریں کہ موجودہ دور کے تمام پیچیدہ مسائل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی روشنی میں بہترین طریقے سے حل ہو سکیں ۔ ہمارے سابقہ نصاب میں براہ راست دین سے متعلق جتنی کتابیں ہیں ان کی تبدیلی کی کوئی ضرورت نہیں وہی مفید اور کافی ہیں البتہ ان کی تدریس کا طریقہ بدلنا ضروری ہے ۔ بقول اقبال مرحوم

وہی شراب وہی ہاؤ ہو رہے باقی
طریق مے کدہ رسم کدو بدل جائے

اسی طرح علم کلام کی کوئی کتاب بھی نصاب میں تجویز کی جائے اس کے پڑھاتے وقت ان مباحث پر زیادہ زور لگانے کی اب کوئی ضرورت نہیں جو زمانۂ قدیم میں معتزلہ کے بعض غلط عقائد کی تردید کے لیے بیان کیئے جاتے ہیں بلکہ وہ عقائد جن کی اہمیت قرآن و حدیث کی رُو سے زیادہ ہے اور جو آیات واحادیث سے صریحاً ثابت ہیں ۔ ان کو اچھی طرح نصوص کی روشنی میں سمجھانے کے ساتھ ساتھ عقلی دلائل کے ساتھ بھی سمجھا دیا جائے اور شبہات کا ازالہ کیا جائے ۔ مثلاً ثواب و عذاب قبر، مسئلہ ختم نبوت مسئلہ خلافت وغیرہ ۔

اب رہ گئی یہ بات کہ دینی مدارس میں انگریزی بھی پڑھائی جائے اور طلبہ کو دوسری نصابی کتابوں کے ساتھ انگریزی دان اور انگریزی خوان بھی بنا دیا جائے ۔ اس بارے میں میری رائے یہ ہے کہ اگرچہ میں انگریزی زبان کی افادیت اور ضرورت کا قائل ہوں اور بدقسمتی سے اس شخص کو جو انگریزی نہ جانتا ہو تعلیم یافتہ سمجھا نہیں جاتا اس لیے اس کی اہمیت یقیناً ہے لیکن دینی مدارس میں طلبہ کو نصاب کی ان دینی اور فنی کتابوں کے ساتھ انگریزی پڑھانا ،

نقصان دہ سمجھتا ہوں۔

تجربہ یہ ہے کہ اس صورت میں طلبہ کی زیادہ توجہ انگریزی کی طرف ہو جاتی ہے۔ ذہنی قوی انگریزی کی طرف زیادہ مائل ہو جاتے ہیں اور دوسری کتابوں کی طرف توجہ باقی نہیں رہتی۔ طلبہ کی نگاہوں میں زیادہ اہمیت انگریزی سیکھنے کی ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اصل دینی علوم میں بالکل کچے رہ جاتے ہیں ان میں علم کی پختگی اور معلومات کی وسعت بالکل نہیں ہوتی اور یہ چیز مدارس دینیہ کے قیام کی اصل غرض وغایت کے خلاف ہے۔ ہاں یہ صورت ہو سکتی ہے اور کرنی چاہیے کہ جس مدرسہ کے لئے یہ ممکن ہو کہ وہ ایک علیحدہ شعبہ قائم کر سکے کہ جب طلبہ مدارس نصاب کی تمام کتابیں پڑھنے اور امتحان دینے کے بعد وہاں سے فارغ ہو جائیں اور علوم میں راسخ و پختہ ہو جائیں تو پھر خالص انگریزی کی طرف متوجہ ہوں اور انشاء اللہ اُن دینی علوم کی برکت سے ذہن اتنا قوی اور صاف ہوا ہو گا کہ تھوڑے عرصے میں اچھی انگریزی سیکھ سکیں گے اور یہ ضرورت پوری ہو جائے گی۔ الغرض میری رائے میں اس نصاب کے دورانِ تعلیم میں طلبہ کو انگریزی سے دُور ہی رکھا جائے تو بہتر ہو گا۔

اسلامی نظام تعلیم

اور پاکستان میں تعلیم کے حوالے سے

شائع ہونے والی کتب کا جائزہ و تعارف

مشرح کتابیات تعلیم

تعلیمی تحقیق کاروں کی ناگزیر ضرورت

ترتیب، سلیم منصور خالد

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد

مسلکوں کا اختلاف اور راہ اعتدال

ڈاکٹر سفیر اختر

امتِ مسلمہ کی تاریخ پر ایک نظر ڈالنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ دورِ اوّل سے اختلافِ فکر ونظر موجود رہا ہے اور اُمت کے فکری ارتقاء میں اس نے ایک حد تک اہم کردار ادا کیا ہے مگر جب یہ فکری اختلاف ضد، انانیت اور مخصوص مفادات کی بنیاد پر فرقہ بندی اور فرقہ پرستی کی شکل اختیار کر گیا تو نہ صرف امت کا فکری ارتقاء رک گیا بلکہ یہ "فرقہ بندی" علمی اور تہذیبی سوتوں کے خشک ہو جانے کا موجب بنی۔ اہلِ علم ونظر کی توانائیاں ملت کی رہنمائی کے بجائے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے پر مرکوز ہو گئیں۔ فروعی اور جزوی مسائل نے اہم ملی وقومی مسائل کی جگہ لے لی اور حقیقی مسائل نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ فروعی مسائل پر مناظروں کا بازار گرم رہا۔ اسی پر تحقیق ہوتی رہی اور یہ صورتِ حال اُمت کے فکری اور آخر الامر سیاسی زوال پر منتج ہوئی۔

برِ صغیر میں مسلمانوں کا عہدِ زوال اورنگ زیب عالمگیر کی رحلت (۱۷۰۷ء) سے شروع ہوتا ہے اس دور میں مذہبی اختلافات عروج پر تھے، شیعہ اور سُنّی ایک دوسرے سے جھگڑ رہے تھے اور صوفیاء کے مختلف سلسلے اپنے اپنے مخصوص مراسم کو ہی نجاتِ اُخروی کا ذریعہ ثابت کرنے پر بضد تھے۔ فقہاء جزوی مسائل پر تفسیق وتکفیر کر رہے تھے۔ اس "فرقہ بندی" کے نقصانات کا ازالہ نہ تو احمد شاہ ابدالی اور نواب نجیب الدولہ کی وہ فوجی مہمات کر سکیں جن سے ابھرتی ہوئی غیر اسلامی قوت کچل دی گئی اور نہ شاہ ولی اللہ کی علمی وفکری تحریک فوری طور پر زوال کو روک سکی۔

برِ صغیر کے مسلمان جب زوال کی اتھاہ گہرائیوں میں گر گئے اور ان کے سامنے غلامی کو قبول

کر لینے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا تو اہلِ نظر نے ان کی بیماری کا علاج "اتحاد و تعاون ہی قرار دیا تھا۔

پاکستان کا مقصدِ وجود اسلامی نظامِ حیات کا قیام ہے اور اس کی زیادہ تر ذمہ داری ان افراد پر ہے جو دینی علوم پر گہری نظر رکھتے ہیں اور قوم اُن کی جانب راہنمائی کے لیے دیکھتی ہے گذشتہ ۳۷ سال میں جن چند مواقع پر ان اہلِ علم نے اُمتِ اُقوم کو احیائے اسلام کے لئے پکارا، قوم نے کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کیا اور اہلِ علم (علمائے کرام) کے اشاروں پر کٹ مرنے پر تیار ہوگئی۔ اِس کے ساتھ ہی یہ افسوس ناک حقیقت بھی سامنے آتی رہی کہ وقتاً فوقتاً فروعی اور جزوی مسائل پر مختلف گروہوں میں جھگڑے ہوئے جانی و مالی نقصان ہوا اور نفاذِ اسلام کا مقصد دور جا پڑا۔

فرقہ بندی اور فرقہ پرستی کے عوامل کیا ہیں؟ اس کے نقصانات کس قدر ہیں؟ اور پاکستان میں یہ مسئلہ کتنی گھمبیر شکل اختیار کرتا جا رہا ہے؟ اس کا تدارک کیا ہو سکتا ہے۔ مختلف طبقوں اور حکومت کے رویئے کیا ہونے چاہئیں؟ ان سوالات کے جوابات تلاش کرنے کے لیے اس لٹریچر پر ایک نظر ڈال لینا ضروری ہے جو کم از کم گذشتہ ۳۹ برس میں اتحاد و اتفاق کی کوششیں کرنے والوں کی جانب سے سامنے آیا ہے۔

کتب اور پمفلٹ

امداد اللہ مہاجر مکی "فیصلہ ہفت مسئلہ" محکمہ اوقاف لاہور (جون ۱۹۷۰ء)

امین احسن اصلاحی "اسلامی ریاست میں فقہی اختلاف کا حل"

انیس احمد صدیقی حکیم "اسلام اور فرقہ بندی" صدیقی ٹرسٹ کراچی

بہاء الحق قاسمی "اسوہ اکابر" لاہور (۱۹۶۲ء)

خلیل احمد سہارنپوری "عقاید علماء دیوبند" ملتان

غلام جیلانی برق۔ ڈاکٹر "بھائی بھائی" لاہور

غلام نظام الدین مرولوی "ہوالمعظم" ۔لاہور

قمر احمد عثمانی "ہماری مذہبی جماعتوں کا فکری جائزہ۔ کراچی (۱۹۶۲ء)

محمد شفیع ۔مفتی "وحدتِ اُمت" فیصل آباد

محمد متین ہاشمی ۔مولانا "تحریکِ جامعہ محمدی" تعارف ۔جھنگ (۱۹۷۳ء)

منوّر حسین شاہ "راہ راست" دہلی (۱۳۵۴ھ)

ولی اللہ دہلوی ۔شاہ "اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ ۔ لاہور

(ترجمہ صدر الدین اصلاحی)
مجلس اخوان الصفا... "پاکستان میں فرقہ واریت اور اس کا حل" (کراچی)

مقالات

ابوالاعلیٰ مودودی ۔مولانا "ہم کیسے متحد ہو سکتے ہیں"؟ ہفت روزہ ایشیا (لاہور)
۱۵ جولائی ۱۹۸۴ء ص ۱۱-۱۷

شبیر علی خان اصلاحی "اسلامی نظام کے نفاذ کا ذمہ دار کون؟ المصباح (لاہور

عبدالستار خان نیازی ۔مولانا "مسلمانوں میں اتحاد کی حقیقی ضرورت" روزنامہ نوائے وقت (راولپنڈی)
اگست ۱۹۸۴ء

"اتحاد ملت کے لیے چار نکاتی فارمولا" ۔ ماہنامہ الجامعہ (جھنگ)
فروری، مارچ ۱۹۸۳ء ص ۴۵-۵۰

عبدالغفار حسن ۔مولانا "دین میں غُلُو" ہفت روزہ الاعتصام (لاہور) ۱۷، ۲۴ ذی الحجہ
۲ محرم، ۹ محرم ۱۴۰۵ھ (تین شمارے ۔

محمد ادریس کاندھلوی "اتفاق، افتراق (خطبہ جمعہ) غیر مطبوعہ)

محمد سعود "فرقہ پرستی ۔مسلمانوں کے لیے لمحہ فکریہ" ماہنامہ فکر و نظر (اسلام آباد)
فروری ۱۹۸۳ء

محمد طیب۔ قاری "فروعی اختلافات۔ علماء کا رویہ" المصباح (لاہور) سلسلہ نمبر ۲۱
(جمعیت طلبہ عربیہ پاکستان لاہور)

محمد یوسف بنوری "حدیث افتراق اُمت" ماہنامہ بینات (کراچی) محرم ۱۳۸۳ھ
"حدیث اختلاف اُمت" " " " ربیع الاول ۱۳۸۳ھ

مختار احمد خاں "مسلمانوں کا افتراق شرمناک ہے۔ المصباح (لاہور) سلسلہ نمبر ۲۱
اتحاد ملت کی بنیادیں (احادیث اور تشریح) ہفت روزہ ایشیا (لاہور)
۱۵ جولائی ۱۹۸۴ء

اتحاد کا راز (اداریہ) ہفت روزہ ایشیا (لاہور)
۱۵ جولائی ۱۹۸۴ء

اتحاد بین المسلمین کی اہمیت و ضرورت۔ ہفت روزہ الاعتصام (لاہور)
۲۸ ستمبر ۱۹۸۴ء

اتحاد اسلامی اور فقہی مذاہب ماہنامہ پیام عمل (لاہور)
جولائی ۱۹۸۴ء ص ۲۶-۳
اگست ۱۹۸۴ء ص ۹-۱۵

دینی مدارس کا تعلیمی نصاب

مولانا عبد المالک

"دینی مدارس" کے نظام، نصابِ تعلیم اور دیگر متعلقہ مسائل کے بارے میں آئی۔پی۔ایس جیسے معروف تعلیمی و تحقیقاتی ادارہ کی طرف سے سیمینار کا اہتمام انتہائی قابل قدر کوشش ہے۔ امید ہے کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا اور باہمی غور و فکر سے دینی مدارس کی تعمیر و ترقی کے لیے بہترین تجاویز اور تدابیر سامنے لائی جاتی رہیں گی اور انہیں عملی جامہ پہنانے کی جد و جہد کی جائے گی۔

زیر بحث موضوع

میرے نزدیک بنیادی نکتہ "نصابِ تعلیم" کا ہے کسی تعلیمی ادارے کے فاضل اور اس کے دائرہ کار کے بارے میں فیصلہ اس نصاب ہی کی بنیاد پر کیا جاتا ہے جس کی اس نے تعلیم پائی ہو اور اس بات کا فیصلہ بھی نصابِ تعلیم ہی کرتا ہے کہ اس کا فاضل عصری اور ملی تقاضوں کو پورا کرسکتا ہے یا نہیں۔ علیٰ ہذا القیاس اس کی سیرت و کردار اور مختلف طبقوں اور برادریوں سے اس کے تعلقات کی نوعیت کے بارے میں اسی کو بنیاد بنا کر رائے قائم کی جائے گی اس لیے میں اپنی گذارشات کی بنیاد نصابِ تعلیم ہی کو بناتا ہوں۔

تحصیل علم کی شرعی حیثیت اور علم وحی و عقلی کے امتزاج کی اہمیت

دینی علم ہو یا دنیوی اگر ہر فرد اس کا محتاج ہے تو وہ فرض عین ہے اور اگر ہر فرد اس

کا محتاج نہیں بلکہ مسلمان معاشرے کو اس کی ضرورت ہے تو وہ فرض کفایہ ہے۔ الدنیا مزرعۃ الاخرۃ کا نظریہ اور انسان کے "خلیفہ فی الارض" ہونے کا عقیدہ تقاضا کرتا ہے کہ انسان انفرادی اور اجتماعی طور پر اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت کائنات کے خزانوں سے استفادہ کرے، حواس اور عقل کے ذریعے ان تک رسائی حاصل کرے اور علم وحی کے ذریعہ ان کا ٹھیک ٹھیک استعمال کرے۔ اس لئے حسّی، تجرباتی اور عقلی علوم کی حیثیت بدن کی ہے اور علم وحی کی حیثیت روح کی ہے۔ بدن بغیر روح کے مردہ ہوتا ہے اور روح بغیر بدن کے کوئی کام سرانجام نہیں دے سکتا۔ بے خدا عقل اور وحی کی رہنمائی سے محروم علم، شرک وکفر، ظلم و عدوان اور قتل وغارت گری اور جاہلیت ہے اور "دین دنیا کے بغیر" کا تصور اسلام کے نظریہ جہانگیری اور جہانبانی سے ٹکراتا ہے

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا۔

کیا وہ جو مردہ تھا اور ہم نے اسے زندہ کر دیا اسے نور دے دیا جسے لے کر انسانوں میں چل پھر رہا ہے وہ اس کی مانند ہو سکتا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہے اور اس کے لیے ان تاریکیوں سے نکلنا مقدر نہیں ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ عقل وحواس رکھنے والا اور علوم عقلیہ کا ماہر علم وحی کے بغیر مردہ ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ علم عقلی، علم وحی کے امتزاج کا کس قدر محتاج ہے۔ یعنی جس طرح روح بدن کے بغیر اپنا اپنا کردار ادا نہیں کر سکتے اسی طرح علماء دین علم دنیا کے بغیر اور علماء دنیا علم دین کے بغیر بھی کوئی خاص کردار ادا نہیں کر سکتے۔ پس علم دین اور علم دنیا ان کے لیے قائم کئے گئے مختلف نظام اور ادارے اور ان سے تیار ہونے والے فضلاء، جنکی امت مسلمہ کو ضرورت ہے ان کا وجود فرقِ مراتب کے باوجود ضروری ہے اور اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ۔ کی رو سے امتِ مسلمہ اس بات کی مکلف ہے کہ وہ ان دونوں قسموں کے علوم کی ترقی کے لیے اپنی استطاعت کے مطابق کوشش کرے اور ایسے علماء دین تیار کرے جو دنیوی علوم سے علم دین کی روشنی میں کام لے کر

دنیا کو "مزرعۃ الآخرۃ" بنا دیں اور ایسے علماء دنیا تیار کرے جو حاملین علوم دینیہ کی رہنمائی میں عالم کی تسخیر کر سکیں۔ علم کے بارے میں ہمارے علماء اور فقہاء کا یہی نظریہ ہے وہ ان دونوں قسم کے علوم کی تحصیل کو عبادت قرار دیتے ہیں کیونکہ فرض کی ادائیگی عبادت ہے۔ امام غزالیؒ نے احیاء العلوم" میں علامہ ابن عابدین شامی نے "ردالمحتار" میں اور دیگر اہل علم وافتاء نے اپنی تصانیف اور فتاویٰ میں اسے وضاحت سے بیان کیا ہے اس لیئے میں عرض کروں گا کہ روح کی طرح دینی مدارس کی حیثیت اگرچہ اشرف واعلیٰ ہے لیکن بدن کی مانند فضیلت کی مستحق کالج اور یونیورسٹیاں بھی ہیں۔

دینی مدارس کا مقصد اور نصاب تعلیم

دینی مدارس کا نصاب دراصل علم وحی پر مبنی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تَرَكْتُ فِيْكُمْ اَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوْا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا كِتَابَ اللهِ وَسُنَّةَ نَبِيِّهٖ کتاب وسنت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ترکہ ہیں اور علماء اسی ترکہ کے وارث ہونے کی بنا پر "العلماء ورثۃ الانبیاء" کا مصداق ہیں اکتاب وسنت کی تعبیر وتشریح اور اس کی عملی صورتیں فقہ اسلامی کی شکل میں اس کے ساتھ شامل ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" كَانَتْ بَنُوْا اِسْرَائِيْلَ تَسُوْسُهُمُ الْاَنْبِيَاءُ كُلَّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ خَلَفَهٗ نَبِيٌّ وَاِنَّهٗ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ وَسَيَكُوْنُ خُلَفَاءُ

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوا اللهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ

اور اولی الامر" کا مصداق مفسرین نے "علماء" اور حکام کو قرار دیا ہے۔

ورثۃ الانبیاء، خلفائے رسول اور مسلمانوں کے "اولی الامر" کے القاب نے علماء کے اصل علمی اور عملی دائرہ کا تعین کر دیا ہے۔ علماء کا اصل علمی مقام یہ ہے کہ وہ کتاب وسنت کے ماہر ہوں

وہ کتاب وسنت کی روشنی میں اسلامی نظام اور اس کے مختلف شعبوں کی وضاحت کرسکیں۔ اس کی بالاتری دوسرے نظاموں پر ثابت کرسکیں، طاغوتی نظاموں پر تنقید کرکے ان کا بودا پن ثابت کرسکیں۔ شیطان اور اس کی ذریت کو علم کے میدان میں چاروں شانے چت کردیں اس سے کتاب وسنت کے علم کے ساتھ دوسرے علوم کی یکجائی و پیوستگی کی ایک اور وجہ سامنے آگئی کہ ان کے اضافوں کا مقصد علماء کے لیے رزق کے دروازے کھولنا نہیں ہے بلکہ اسلام کے مقابلہ میں دوسری تہذیبوں سے آشنا ہونا ہے کیونکہ اس کے بغیر، کہ آپ دشمن سے واقف ہوں اس کے کچل ڈالنے کا انتظام کیسے کرسکیں گے پہلے بھی یہ اضافے ہوئے اور اب بھی ہونے چاہئیں۔ مغربی تہذیب وثقافت، ڈارون، ہیگل اور مارکس کے فلسفوں پر ضرب کاری لگانے کے لیے ان فلسفوں سے آگاہی حاصل کرنا ہوگی لیکن اس کے ساتھ ہی "اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دِيْنَاكُمْ" کے ارشاد کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے اور دنیوی علوم کی تحصیل کو علماء دین کا اصل مقصود نہیں بنا دینا چاہیے بلکہ اس کو ثانوی حیثیت دے کر استطاعت کے مطابق علوم عقلیہ کو شامل نصاب کرنا چاہیے تاکہ وہ فکری، علمی اور دعوت وتبلیغ کے دائروں میں قیادت کا فریضہ سرانجام دے سکیں۔

بقدر ضرورت واستطاعت عصری علوم کی شمولیت

دینی مدارس میں یہ ممکن ہوتا کہ دنیا بھر کے علوم پڑھائے جائیں تو اہل علم جن کے نزدیک علم سراسر خیر ہے کبھی بھی انہیں شامل نصاب کرنے سے گریز نہ کرتے لیکن ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا نہ صرف دینی مدارس بلکہ دنیا کے کسی بھی مدرسہ میں ایسا ممکن نہیں کہ ہر طالب علم سارے علوم کو سمیٹ لے۔ موجودہ حالات میں علوم دینیہ کو اصل قرار دیتے ہوئے ان کے ساتھ جس قدر علوم کا اضافہ ممکن تھا وہ کیا گیا ہے اور اس میں اطمینان بخش کامیابی بھی ہوئی ہے اس لیے دینی مدارس کے بارے میں یہ معلوم کرکے کہ ان میں کالجز اور یونیورسٹیوں کے تمام علوم نہیں پڑھائے جاتے ان کی افادیت کے بارے میں کسی شک وشبہ میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے نہ ہی اس غلط فہمی میں مبتلا ہونا

چاہیئے کہ دینی مدارس ان علوم کے خلاف ہیں بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان سب کو شامل نصاب کرکے ان پر طلبہ کو حاوی کرنا استطاعت سے باہر ہے۔

درسِ نظامی اور اس کے مضامین

اس وقت ان مدارس میں جو نصاب تعلیم پڑھایا جارہا ہے وہ علوم اسلامیہ کتاب و سنت، فقہ اسلامی اور عقائد کے علاوہ علوم عربیہ، اصول فقہ، اصول تفسیر، اصول حدیث اور فلسفہ و منطق پر مشتمل ہے ان مضامین میں فلسفہ و منطق کے علاوہ باقی سارے مضامین ضروری ہیں۔ فلسفہ اور منطق کی اس وقت اس سے زیادہ کوئی افادیت نہیں ہے کہ اس سے ذہن میں تیزی پیدا ہو اور غور و فکر کی صلاحیتیں اجاگر ہوں۔ جہاں تک علمیت کا تعلق ہے تو جس طرح کالجز اور یونیورسٹیز سے ایم۔ اے اسلامیات کی ڈگری حاصل کرنے والے اسلامیات سے بے خبر ہوتے ہیں اسی طرح دینی مدارس کے فضلاء منطق و فلسفہ کی ڈگریاں حاصل کرنے کے باوجود منطق و فلسفہ سے بے خبر رہتے ہیں۔ یعنی اس وقت ان مضامین کی شمولیت درس نظامی کے نصاب میں ثانوی حیثیت رکھتی ہے اس لیے یہ جان کر کہ دینی مدارس میں منطق و فلسفہ پڑھایا جاتا ہے پریشان نہیں ہونا چاہیے منطق و فلسفہ کا نصاب اس وقت بقدر ضرورت رہ گیا ہے اور تاریخی تعامل اور اسلاف کے لٹریچر سے استفادہ کے لیے کسی قدر انہیں باقی رکھنا مناسب ہے۔ اس نصاب پر سرسری نظر ڈالنے سے بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس سے فارغ التحصیل ہونے والا ملکی نظم و نسق کو چلانے کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں ہے نہ ہی اس نصاب کا مقصد سی ایس پی اور پی سی ایس آفیسر تیار کرنا ہے۔ البتہ اسے کماحقہ پڑھا جائے تو علمی فکری اور سیاسی میدان میں قیادت کی ذمہ داریاں ادا کی جاسکتی ہیں بلکہ ایک تسلسل کے ساتھ علمائے اس ذمہ داری کو ادا کیا ہے جس کے نتیجہ میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے دور کا آغاز ہوگیا ہے۔

علومِ اسلامیہ کی حفاظت اور حکومت کا فرض

درسِ نظامی کا یہ نصاب جو ہمیں پچھلے دور سے بطور ورثہ ملا ہے علوم اسلامیہ اور علوم عصریہ پر مشتمل تھا جب ممالک اسلامیہ پر کفر کی استعماری اور سامراجی طاقتوں نے تسلط حاصل کر لیا تو اس نے ایک عرصہ کے بعد پرانے نظام اور اس کے لیے رجال کار تیار کرنے والے نظام تعلیم کو ختم کر دیا۔ یہ علماء امت کا کارنامہ ہے کہ انہوں نے علوم اسلامیہ پر مشتمل اس نصاب تعلیم کو جان کی بازی لگا کر بعینہٖ زندہ رکھا اور پورے دو سو سال اس کی حفاظت کی، "فرض کفایہ" کو قائم کرنا امت یعنی مسلمانوں کی حکومت کی ذمہ داری ہوتی ہے جب حکومت ختم ہو گئی تو علماء نے ثابت کر دکھایا کہ وہ امت پر عائد ہونے والے فرائض کو ادا کر کے "اولی الامر" اور "ورثۃ الانبیاء" کا مصداق ہیں اس پر ان علماء کرام کو ایک طرف مبارکباد دینا چاہیے اور دوسری طرف اب جب کہ مسلمانوں کو آزادی حاصل ہو گئی ہے اور ان کی حکومت قائم ہو گئی ہے حکومت کا فرض ہے کہ وہ صرف ڈاکٹر، انجینئر، سائنس دان اور ٹیکنالوجی کے ماہرین تیار کرنا ہی اپنا فرض نہ سمجھے بلکہ علماء دین تیار کرنا بھی اپنے فرائض میں شامل کرے۔ اگر ایک کالج اور یونیورسٹی میں الیف۔ ایس سی اور اس کے بعد میڈیکل کے شعبے کا اہتمام ہو سکتا ہے تو مدارس کے طرز پر علوم دینیہ کا شعبہ قائم کرنے کا انتظام کیوں نہیں ہو سکتا۔

دور زوال میں تو یہ بات سمجھ میں آسکتی تھی کہ صرف علماء دین پرائیویٹ طور پر دینی تعلیم کا نظام قائم کریں لیکن اب بھی دینی تعلیم کا حکومت کے اداروں سے باہر رہنا ایک طرف حکومت کا اپنے فرائض سے غفلت برتنا ہے اور دوسری طرف یہ چیز مسلمانوں کی غیرت و حمیت کے لیے چیلنج ہے کہ ان کے ٹیکسوں کے بل بوتے پر چلنے والے تعلیمی اداروں میں ڈاکٹری اور انجینئرنگ کی ڈگریاں حاصل کرنے والوں کو تو داخلہ ملے لیکن علم دین حاصل کرنے والوں کے لیے ان میں داخلہ کا کوئی انتظام و اہتمام نہ ہو۔ اس لیے اس تجویز پر کہ علماء اپنے مدارس کے نظام میں تبدیلی پیدا کریں، زیادہ زور دینے کی بجائے اس بات پر زور دیجئے کہ حکومت ہر کالج اور یونیورسٹی میں مدارس کی طرز پر علوم دینیہ کا شعبہ قائم کرے اور اس کے ساتھ ساتھ دینی مدارس کو حسب سابق اپنے

طور پر کام کرنے کا موقع دے۔ ان کے نظام میں مداخلت نہ کرے اب جبکہ یہ مدارس وفاقوں کی شکل میں منظم بھی ہو چکے ہیں انشاء اللہ ترقی کریں گے اور حسب ضرورت مزید اصلاحی اقدامات بھی ہوتے رہیں گے۔ اضافی مضامین کے طور پر سیاسیات و معاشیات اور انگریزی زبان بعض وفاقوں کا خصوصاً رابطۃ المدارس سے منسلک بعض مدارس میں شامل نصاب ہو گئے ہیں (لقمان قرقین)

منطق و فلسفہ اور اسلام

یہاں میں ضمناً علوم اسلامیہ کی اس کرامت کا بھی ذکر مناسب سمجھوں گا کہ ان علوم نے نہ صرف اپنا تحفظ کیا بلکہ ان یونانی زائد المیعاد مضامین کو بھی بقا دے دی جنہیں علوم اسلامیہ کی صحبت کا شرف حاصل ہو گیا اسلامی علوم کے ساتھ مصاحبت کے اس شرف سے محروم یونانی علوم کا دنیا کے کسی اور ملک میں اس طرح سے سلسلہ درس جاری نہیں ہے جس طرح ہمارے ہاں جاری ہے۔ دوسرے لوگوں نے تو ان علوم کو خیر آباد کہہ دیا ہے اور بہت آگے نکل گئے ہیں لیکن اسلام نے ہندوستان میں انہیں محفوظ ہی نہیں بلکہ زندگی بخش دی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ جدید تعلیمی اداروں میں علوم دینیہ کا شعبہ جاری کرنے سے نہ صرف علوم دینیہ بلکہ دنیوی علوم کو بھی ترقی حاصل ہو گی اور ان کا معیار بھی بڑھ جائے گا اور آسانی کے ساتھ دونوں تعلیمی نظاموں میں وحدت پیدا کرنے کی خواہش بھی پوری ہو جائیگی۔

دونوں نظاموں میں وحدت پیدا کرنے کی مناسب شکل

درس نظامی کے اس نصاب میں قرآن و حدیث کے علاوہ وہ تمام علوم شامل ہیں جو مسلمانوں نے ایجاد کئے یا دوسری قوموں سے انہیں حاصل کئے اس وقت اس کے باوجود کہ علوم کو اتنی وسعت اور ترقی نہ ملی تھی کہ قرآن و سنت اور فقہ اسلامی کے ساتھ ہر طالب علم ان علوم کو نہ پڑھ سکتا لیکن اس کے باوجود اس درس کے پڑھنے والے بعض علوم میں متخصص ہوا کرتے تھے اور اس علم میں انہیں امتیازی مقام حاصل ہوتا تھا بلکہ تخصص کی بنیاد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کے ہاتھوں ہلی پڑ چکی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے "معاذ بن جبلؓ" کو "اعلمھم بالحلال والحرام" زید بن ثابتؓ کو "افرضھم" ابی بن کعب کو "اقرأھم" کی ڈگری عطا فرمادی تو اس کے بعد متخصصین کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے صحابہ میں سے حضرت ابو ہریرہؓ روایت حدیث، حضرت علیؓ قضاء میں عبداللہ بن مسعود فقہ میں متخصص نظر آتے ہیں بعد کے ادوار میں محدثین فقہاء علمائے جرح وتعدیل علماء لغت و معانی، علماء منطق و فلسفہ، علماء کلام کی تخصص کی درسگاہیں اس قدر نمایاں ہیں کہ ہر طالب ان سے واقف ہے لیکن اب جبکہ علوم میں بہت زیادہ وسعت آگئی ہے تخصص کے طریق تعلیم کے بغیر چارہ نہیں ہے اس لیے درس نظامی کو ایک تعلیمی نظام کہنے اور رکھنے کی بجائے علم کی ایک لائن سمجھ کر جاری رکھنا چاہیے اور میرے نزدیک ضروری ہے کہ حکومتی اداروں میں بھی اس لائن کا آغاز کر دیا جائے۔

اس تجویز پر عمل درآمد کے ساتھ ہی دینی مدارس کے فضلاء کا دائرہ کار بھی کسی قدر وسیع ہو جائے گا اور وہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں قرآن وسنت کی روشنی پھیلانے میں لگ جائیں گے اس کے ساتھ ہی بلاتاخیر نظام قانون وحکومت میں اسلام کے مطابق تبدیلیاں کر دی جائیں تاکہ ان میدانوں میں علماء کی ضرورت پیش آئے اور ان کا دائرہ وسیع ہو۔ اس کے بعد "خذ ما صفاو دع ما کدر" کے اصول کو بنیاد بنا کر اس طرح کی مجالس میں نصاب تعلیم پر غور ہوتا رہا تو۔۔۔ انشاء اللہ تعالے نصاب ونظام تعلیم حالات اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق ہو جائے گا اور اس سے فارغ ہونے والے عصری تقاضوں کو احسن طریق سے پورا کرنے کے قابل ہوں گے۔

آخر میں عرض کروں گا کہ اس سے پہلے اس مسئلہ پر مسلمان مفکرین خصوصاً مولانا مناظر احسن گیلانی نے ۱۹۴۳ء میں اور مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ نے ۱۹۳۷ سے لے کر ۱۹۵۲ تک تک جو کام کیا ہے اور مدینہ یونیورسٹی کے لئے جو نصابی خاکہ انہوں نے پیش کیا ہے اس سے استفادہ کیا جائے اور اب تک کی تجاویز کو سامنے رکھ کر قابل عمل اور بہتر تجاویز کو اس طرح کے ایک دوسرے اجتماع کے موقع پر پیش کیا جائے۔

دینی مدارس اور تجربہ گاہیں

ڈاکٹر منصور علی

ایک زمانہ تھا جبکہ ہر قسم کے علم حاصل کرنے کے لیے طالب علم مدارس کا رخ کیا کرتے تھے اور یہیں سے تمام علوم حاصل کیا کرتے تھے اور مرجع خلائق ہوتے تھے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ جہاں اور چیزوں میں تقسیم کی روایت قائم ہوئی تعلیم میں بھی اس کو روا رکھا گیا اور اب نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ مدرسہ کے لفظ سے بالعموم وہ تعلیم گاہ مراد لی جاتی ہے جہاں ابتدائی تعلیم دی جاتی ہے اعلیٰ تعلیم کے لیے جامعہ، کلیہ یا معہد کا لفظ استعمال کیا جا رہا ہے جہاں بالعموم لادینی تعلیم دی جاتی ہے یا پھر وہ مضامین پڑھائے جاتے ہیں جو فرض عین کے زمرے میں نہیں آتے لیکن جامعہ یا اس کے مترادف دوسرے لفظ کہ کر ایسی تعلیم گاہ مراد ہو جہاں دینی تعلیم دی جاتی ہے تو پھر آج کل اس کے بعد لفظ "اسلامیہ" کا اضافہ ضروری ہے مثلاً جامعہ اسلامیہ (بہاولپور) جامعہ الاسلامیہ مدینۃ المنورہ وغیرہ۔

تعلیم تو دونوں (دینی اور لادینی) قسم کے تعلیم گاہوں میں دی جا رہی ہے مگر المیہ یہ ہے کہ مقصد یا مقاصد سے بے نیاز ہو۔ جس کا نتیجہ انتشار اور فساد کی شکل میں ہمارے سامنے آرہا ہے۔ اس کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ مشکل ہی سے دو ایسے افراد ملیں گے جو خالصتاً للہ اور فی اللہ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہوں۔

فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تعلیم کا وہ مقصد جو عام طور پر تعلیم و تربیت یا فن تعلیم و تربیت کی کتابوں میں بیان کیا جاتا ہے جس میں نظام زندگی میں اقدار مسلّمہ کا تحفظ[1] اور گرد و پیش

سے استفادہ اور اکتساب فیض[۲] تسخیر کائنات[۳] ارتقائے انسانیت[۴] جمہوریت کی استواری[۵] حکومت کے لیے کارندوں کی تیاری[۶] یا حطام الدنیا[۷] وغیرہ شامل ہیں جزوی طور پر (مگر سطحی لحاظ سے) تو ان میں سے ہر ایک صحیح ہے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ۸، ۹، ۱۰) لیکن جس طرح سے ہر معاملہ میں رشد و ہدایت کا صحیح سرچشمہ قرآن وسنت ہے تو تعلیم کے لیے ارشاد باری ہے :

وما كان المومنون لينفروا كافة ط فلو لا نفر من كل فرقة منهم طائفة ليتفقهوا فى الدين ولينذروا قومهم اذا رجعوا اليهم لعلهم تحذرون

"اور یہ مناسب نہیں کہ سب مسلمان نکل کھڑے ہوں ایسا کیوں نہ کیا کہ ان میں سے کچھ لوگ نکلے ہوتے تاکہ دین کی سمجھ پیدا کرتے اور واپس جاکر اپنی قوم میں خوف خدا پیدا کرتے۔

(التوبہ - ۱۲۲)

اس آیت میں درج ذیل باتوں کی تعلیم دی جارہی ہے :

الف) جہاد (فرض کفایہ) میں کل آبادی کا شامل جہاد ہونا ضروری نہیں۔

ب) تمام مسلمانوں کے لئے علم حاصل کرنا فرض ہے۔

ج) علم کا مقصد تفقہ فی الدین ہے۔

د) عالم دین کی اساسی ذمہ داری "انذار" ہے۔

جس علم کو یہاں فرض عین بتایا گیا ہے دراصل اس سے مراد "علم دین کا صرف وہ حصہ ہے جس کے بغیر آدمی نہ فرائض ادا کر سکتا ہے اور نہ حرام چیزوں سے بچ سکتا ہے جو ایمان و اسلام کے لئے ضروری ہے"[۱۱] اور اسی چیز کی طرف اشارہ حدیث شریف میں ہے۔ طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِم۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ بقدر ضرورت علم ہر مسلمان پر فرض ہے، اس کی مزید وضاحت کے لئے یوں سمجھنا چاہیے کہ ایک غریب جس کی زندگی عسرت میں گذر رہی ہے اس کے لیے مسائل طہارت، نماز روزہ، حرام وحلال اور روزمرہ کے عام معاملات کے مسائل کا جاننا کافی ہے جبکہ ایک خوشحال شخص کے لئے اس کے علاوہ زکوۃ اور حج کے مسائل کا جاننا بھی ضروری ہے۔ علم کی

عام ہدایت کے بعد یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ عامۃ الناس میں سے کچھ لوگ یقیناً تفقہ فی الدین کے مرتبہ پر فائق ہوں تاکہ عام لوگ اپنے مسائل ان سے سمجھ سکیں۔

یہ بات پیش نظر رہے کہ قرآن جس کی دعوت دے رہا ہے وہ مجرد علم نہیں ہے کیونکہ یہ بات ہوتی تو یوں کہہ دیا جاتا کہ یَتَعَلَّمُوْنَ الدِّیْنَ یعنی علم دین حاصل کریں لیکن یہ نہ کہہ کر کہا یوں جا رہا ہے کہ لِیَتَفَقَّهُوْا فِی الدِّیْنِ (دین میں سمجھ پیدا کریں) تفقہ کا لفظ فقہ سے مشتق ہے جس کے معنی سمجھ بوجھ کے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی بہت اہم ہے "کہ قرآن کریم نے اس جگہ مجرد کے صیغے سے لیتفقهوا الدین یعنی وہ دین کو سمجھ لیں نہیں فرمایا بلکہ لِیَتَفَقَّهُوْا فِی الدِّیْنِ فرمایا جو باب تَفَعُّلْ سے ہے اس کے معنی میں محنت اور مشقت شامل ہے۔ مراد یہ ہے کہ دین کی سمجھ بوجھ پیدا کرنے میں پوری محنت و مشقت اٹھا کر مہارت حاصل کریں[۱۲]۔

اس طرح تفقہ فی الدین میں "دین کو سمجھنا، اس کے نظام میں بصیرت حاصل کرنا، اس کے مزاج اور اس کی روح سے آشنا ہونا اور اس قابل ہو جانا کہ فکر و عمل کے ہر گوشے اور زندگی کے ہر شعبے میں انسان یہ جان سکے کہ کونسا طریق فکر اور کونسا طرز عمل روح دین کے مطابق ہے۔[۱۳] شامل ہے۔ دراصل یہ چیز انسان کو فہم و فراست اور علم و حکمت کی ایک ایسی شاہ کلید عطا کرتی ہے جس کے ذریعہ سے انسانی تہذیب و تمدن کے مسئلہ کا ہر تالا باسانی کھولا جا سکتا ہے۔

یہ چیز جب اس قدر اہم ہے تو آیئے دیکھیں کہ اسے حاصل کیونکر کیا جا سکتا ہے؟ اس مقام تک رسائی حاصل کرنے میں علم، تقویٰ اور تدبر بہت ممد و معاون ثابت ہوئے ہیں۔ یہ بات اس لیے کہی جا رہی ہے کہ یہ بھی ایک ودلیعت خداوندی ہے جو صرف خاص خاص لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔ ساتھ ہی یہ بات بھی ملحوظ رکھنی چاہیے کہ صدق نیت، اخلاص اور عزم کامل یہ وہ اجزا ہیں جو ہر ہر قدم پر مدد کرتے ہیں تو وہ ذات گرامی جو کَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (الانعام - ۶) ہے جو ارحم الرحمین ہے اور مانگنے کی دعوت دیتی ہے، بھلا وہ کیسے کسی کے حسن طلب سے

اعراض کر سکتی ہے۔ لہٰذا یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ تفقہ فی الدین کی طلبِ صادق ہو اور اس کے لیے بھرپور کوشش کی جائے تو عین ممکن ہے کہ اللہ تعالےٰ اپنے فضل و کرم سے اس نعمت عظمیٰ سے نواز ہی دیں۔

تعلیم میں غور و فکر کا مقام

انسانی حواس، عقل اور وحی، علم حاصل کرنے کے تین ذرائع ہیں، ان میں سے نئی وحی کے آنے کا سلسلہ تو بند ہو گیا۔ نتیجتاً اب بھی ہم ان تینوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں لیکن آخر الذکر کے لیے اس پر اکتفا کرنا پڑے گا جو قرآن اور سنت کی شکل میں ہمارے پاس پہلے ہی سے موجود ہے۔ قرآن حکیم میں جب کبھی بھی کوئی غیر معمولی بات کہی گئی ہے تو اس مقام پر دلیل بھی فراہم کر دی گئی ہے، ہاں یہ اور بات ہے کہ بعض مرتبہ دلیل بہت واضح ہوتی ہے اور بیک نظر ہر شخص سمجھ سکتا ہے اور بعض مرتبہ غور و خوض کی ضرورت پیش آتی ہے مثلاً ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

يَاأَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ

(البقرہ - ۲۱)

"اے لوگو: بندگی اختیار کرو اپنے اس رب کی جو تمہارا اور تم سے پہلے جو لوگ گذرے ہیں ان سب کا خالق ہے، تمہارے بچنے کی توقع اسی صورت سے ہو سکتی ہے"

اس آیت میں تمام انسانوں کو مخاطب کر کے اس بات کی دعوت دی جا رہی ہے کہ تم سب لوگ اپنے رب کی بندگی اختیار کرو، اس آیت میں چند دلیلیں بھی رکھ دی گئی ہیں کہ تم اس کی بندگی کیوں اختیار کرو، پہلی بات تو یہ بتائی گئی کہ وہ تمہارا پیدا کرنے والا ہے صرف یہی نہیں کہ اس نے تمہیں پیدا کیا بلکہ تم سے پہلے جتنے بھی لوگ گذرے ہیں ان سب کا پیدا کرنے والا بھی اللہ ہی ہے۔ یہ بات تو واضح طور پہ کہی گئی۔ دوسری دلیل اُعْبُدُوا اور رَبَّكُمْ میں مضمر ہے کہ تمہیں اس لیے اس کی پوجا کرنی چاہیے کہ تم اس کے بندے ہو اور وہ تمہارا مالک اور آقا، پرورش کرنے

والا، نگہبانی کرنے والا اور حاکم ہے۔ یہ سارے پہلو لفظ رب میں شامل ہیں۔

شروع سے آخر تک قرآن کا اسلوب استدلالی ہے، اس انداز کے پس منظر میں دراصل انسانی نفسیات کارفرما ہے۔ انسانی نفسیات کا یہ خاصہ رہا ہے کہ جو بات دلیل سے کی جاتی ہے اسے انسانی ذہن مقابلتاً جلدی قبول کرلیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں ۶۹۷ مرتبہ کائنات کو دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے تاکہ انسان کائنات کی تخلیق، اس کی شکل وہیئت، اس میں پائے جانے والے اجزا کی تعداد، ان اجزا کی کمیت وماہیت، ان میں پائے جانے والے عناصر کی تعداد اور مقدار، ان اجزاء کا باہمی ربط ونظم اور اس کائنات کی وسعت وعظمت کا مشاہدہ کرے، جائزہ لے جو لازماً اس نتیجہ پر پہنچنے میں مدد دے گی۔

اتنی حسین کتنی عجیب اور اس قدر عظیم
پیچھے ضرور ہے کوئی، اس کائنات کے

غور و فکر کی دعوت کی نظیر

قرآن کا اساسی مضمون توحید ہے۔ مختلف انداز سے اس پر گفتگو کی گئی ہے، ایک جگہ پر ارشاد ہے۔

وَلِلّٰہِ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ: اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ۔	زمین اور آسمانوں کا مالک اللہ ہے، اور اس کی قدرت سب پر حاوی ہے۔ زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری لانے میں (ان) ہوشمندوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں۔

(آل عمران ۱۸۹-۱۹۰)

پہلی آیت میں دراصل اس بات کا دعویٰ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ بڑی قدرت والا ہے، بہت

طاقت والا ہے اور ہر چیز پر قادر ہے لہٰذا عقل کا تقاضہ یہی ہے کہ اس کو تمام آسمانوں اور اس زمین کا تنہا مالک ہونا چاہیے۔ اس نتیجہ تک پہنچنے کے لیے دعوت اس بات کی دی جا رہی ہے کہ تم اگر تخلیق کائنات اور دن اور رات جو ایک دوسرے کے پیچھے آتے ہیں اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرو تو اسی نتیجہ پر پہنچو گے کہ آسمانوں اور زمین کی ساری چیزیں اللہ کی ملکیت میں ہیں، اس نتیجہ تک پہنچنے کے لیے صرف ایک شرط لگائی ہے کہ وہ شخص ہوش وگوش سے کام لیتا ہو، یہ شرط اس لیے لگائی گئی ہے کہ تاریخی حوالے سے ہمارے سامنے بہت ساری مثالیں ایسی ملتی ہیں جہاں لوگوں نے جانتے بوجھتے عصبیت جاہلیہ کی بناء پر اس سب سے بڑی حقیقت" کو ماننے سے انکار کیا ہے۔

ایک دوسرے مقام پر توحید کو شرک کے ابطال کے ذریعہ سمجھایا گیا ہے ملاحظہ ہو۔

اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَہٗ ۔ وَاِنْ یَّسْلُبْھُمُ الذُّبَابُ شَیْئًا لَّا یَسْتَنْقِذُوْہُ مِنْہُ ط ضَعُفَ الطَّالِبُ وَ الْمَطْلُوْبُ. مَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ ط اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ	جن معبودوں کو تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو وہ سب مل کر ایک مکھی بھی پیدا کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے بلکہ مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے جائے تو اسے چھڑا بھی نہیں سکتے، مدد چاہنے والے بھی کمزور اور جن سے مدد چاہی جاتی ہے وہ بھی کمزور۔ ان لوگوں نے اللہ کی قدر ہی نہیں پہچانی جیسا کہ پہچاننے کا حق ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ قوت اور عزت والا تو اللہ ہی ہے۔
الحج ۷۳-۷۴	

کس قدر بلیغ انداز میں شرک کے بودے پن کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔ لوگوں کو اس بات کی طرف متوجہ کیا جا رہا ہے کہ سوچو تو ذرا کہ لوگ اپنے ہاتھوں سے مورتیاں بناتے ہیں۔ اس پر کھانے پینے کی چیزیں چڑھاوے اور نذرانے کے طور پر رکھتے ہیں جسے وہ تو کھا نہیں

سکتے ہاں اس پر مکھیاں آکر بھنبھنانے لگتی ہیں۔ ایک طرف وہ اتنے کمزور اور ناتواں کہ اپنے جسم پر سے ان مکھیوں کو بھی نہیں ہٹا سکتے، معاملہ یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ حد تو یہ ہے کہ اگر ان کی ملک سے کوئی چیز مکھی لے کر اڑ جائے تو اتنے بے بس ہیں کہ وہ اس سے چھین بھی نہیں سکتے۔ یہ ہے ان کی کمزوری کا عالم۔ اس میں دعوت فکر یہ ہے کہ ایسی بے جان، کمزور اور ناتواں ہستی معبود کیسے بن سکتی ہے۔ بات یوں اختتام کو پہنچائی جارہی ہے کہ ان لوگوں نے اللہ کی صفات کا احاطہ نہیں کیا ورنہ وہ ہرگز ہرگز ایسا نہ کرتے۔

یوں تو علم کا مخزن دماغ ہے مگر اس تک مواد پہنچانے کے لیے سننے، دیکھنے اور سوچنے کا عمل کارفرما ہوتا ہے، اس لیے ارشاد ہوا۔

قل ھو الذی انشاکم وجعل لکم السمع والابصار و الافئدۃ قلیلا ما تشکرون (الملک - ۲۳)

ان سے کہو اللہ ہی ہے جس نے انہیں پیدا کیا تم کو سننے اور دیکھنے کی طاقتیں دیں اور سوچنے سمجھنے والے دل دیے، مگر تم کم ہی شکر ادا کرتے ہو۔

اس آیت کے دو معنی سامنے آتے ہیں۔ واضح اور راجح مطلب تو یہ ہے کہ اللہ نے تمہیں پیدا کیا ہے اور اسی نے کان، آنکھ اور دل جیسی عظیم الشان چیزیں عطا کی ہیں تو تمہیں کثرت سے شکریہ ادا کرنا چاہیے ایسا کیوں ہے کہ تم کثرت سے ان عظیم نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتے؟ دوسرا پہلو اس آیت کا یہ بھی ہے کہ اللہ نے تمہیں کان آنکھ اور دل جیسی قیمتی اعضا اس لیے دیے ہیں کہ ان کو استعمال کرو، ان کے ذریعے علم حاصل کرو اور ان نعمتوں کا شکر ادا کرنا یہی ہے کہ انہیں صحیح طور پر استعمال کیا جائے اور ان کے ذریعے اس نتیجہ تک پہنچا جائے کہ اللہ ہی ہمارا پیدا کرنے والا ہے اگر خدانخواستہ ہم یہ نہیں کر پائے تو پھر ان نعمتوں کی ناشکری ہوگی۔ سورہ ملک میں ارشاد ہوا ہے کہ

وقالو لو کنا نسمع

کاش، ہم سنتے یا سمجھتے تو آج پھر اس

وتعقل ما کنا فی اصحب السعیر (الملک ۱۰) | بھڑکتی ہوئی آگ کے سزا واروں میں شامل نہ ہوتے۔

یعنی سننے اور سوچنے کی صلاحیت کو استعمال نہ کرنے کا انجام جہنم ہے۔ اختصار کی خاطر ان ہی آیات پر اکتفا کیا جاتا ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ قرآن کی ہر سورت میں اور ہر سورت کی ہر آیت میں غور کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ قرآن نے تو یہاں تک کہہ دیا۔ افلا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقرآن (النساء ۸۲) کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے؟

غور و خوض کے فوائد

انبیاءؑ کی زندگی اس بات کا سب سے بڑا ثبوت پیش کرتی ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں وہ سچ ہے کیونکہ بعثت سے پہلے کی زندگی بھی انہی لوگوں کے درمیان گزری ہوتی ہے تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایسے لوگ جن کی نوجوانی اور جوانی تو سچ بولتے ہوئے گزرے لیکن متانت اور سنجیدگی کے دور میں اپنی اس عادت سے منہ موڑلیں اسی بات کو قرآن یوں پیش کرتا ہے۔

فقد لبثت فیکم عمرا من قبلہ افلا تعقلون (یونس ۱۶) | اس سے پہلے میں ایک عمر تمہارے درمیان گزار چکا ہوں کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔

ہر نبی کی دعوت کا عملی ثبوت اس کا یہ دعویٰ ہوتا ہے کہ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (سب سے پہلے سرِ اطاعت جھکانے والا میں ہوں) لہٰذا نبی کی سیرت اور کردار کو سامنے رکھتے ہوئے لوگ اس کی دعوت پر ایمان لے آتے ہیں لیکن یہ عین ممکن ہے کہ بشری تقاضے کے تحت یا شیطان کے بہکاوے میں آکر ایمان متزلزل ہو جائے۔ اس کیفیت سے بچنے میں عینی مشاہدہ مددگار ثابت ہوتا ہے اور ایمان میں بالیدگی کا ذریعہ بنتا ہے اور ایقان کے مرتبہ پر پہنچ جاتا ہے۔

انبیاء کو بہت ساری چیزوں کا عینی مشاہدہ کروایا جاتا ہے لبسا اوقات یہ چیزیں بن

مانگے عطا ہوتی ہیں جسے معراج کہا جاتا ہے جیسے حضرت ابراہیمؑ کو نار میں یہ چیز میسر آئی، حضرت موسیٰؑ کو طور پر اور ہمارے رسول مقبولؐ کو اس کے لیے خاص دعوت دے کر لے جایا گیا۔ حضرت عُزیرؑ اور حضرت ابراہیمؑ نے مشاہدہ کرنا چاہا جس کا تذکرہ قرآن یوں کرتا ہے۔

قَالَ اَنّٰی یُحۡیٖ ھٰذِہِ اللّٰہُ بَعۡدَ مَوۡتِہَا (البقرہ ۲۵۹)

یہ آبادی جو ہلاک ہو چکی ہے اسے اللہ دوبارہ کس طرح زندگی بخشے گا؟

وَاِذۡ قَالَ اِبۡرٰہٖمُ رَبِّ اَرِنِیۡ کَیۡفَ تُحۡیِ الۡمَوۡتٰی (البقرہ ۲۶۰)

جب ابراہیمؑ نے کہا تھا کہ میرے مالک مجھے دکھا دے تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے۔ اوکالذی (اس شخص کے مانند) سے اکثر مفسرین حضرت عُزیرؑ لیتے ہیں اس طرح قرآن دو نبیوں کے متعلق یہ بتا رہا ہے کہ وہ دونوں اس بات کا مشاہدہ کرنا چاہتے تھے کہ موت کے بعد زندگی کس طرح واقع ہوگی تو اللہ نے دونوں کو الگ الگ انداز میں مشاہدہ کروا دیا ان دونوں کو اس بات پر یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ مردہ کو زندہ کر سکتا ہے اور کرے گا، پھر بھی سوال کرنا کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے، آخر یہ سوال کیوں کیا گیا؟ جواب قرآن ہی میں مذکور ہے۔ لیطمئن قلبی (اپنے دل کے اطمینان کے لیے) اطمینان قلب کا دوسرا نام عین الیقین ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہو کر یقین کرنا۔ پس معلوم یہ ہوا کہ مشاہدہ کا سب سے بڑا فائدہ ایمان کا یقین اور یقین کا عین الیقین میں تبدیل ہونا ہے، شک و شبہ کی ہر آلائش سے نجات مل جاتی ہے اور یکسوئی حاصل ہو جاتی ہے اس طرح شیطان کی اکساہٹوں اور وسواس سے ایک حد تک چھٹکارا حاصل ہو جاتا ہے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

اب تک کی گفتگو سے جو بات سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ علم حاصل کرنے کا ایک مفید اور مؤثر ذریعہ مشاہدہ بھی ہے جس میں سننے، دیکھنے اور سوچنے کی صلاحیتوں کو استعمال کیا جاتا ہے یہ استعمال جذبہ شکر کی تسکین کا ذریعہ بھی بنتا ہے اور اس کے ذریعہ یقین کی کیفیت میں رفعت پیدا ہوتی ہے۔

غور و فکر کی افزائش

یہ بات پایہ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ تمام جسمانی حرکات و سکنات ان اشارات کے ذریعہ ہوتے ہیں جو دماغ ان اعضاء کے لیے بھیجتا ہے ان اشارات کی آمدورفت برقی رو کے ذریعہ ہوتی ہے۔ دماغ خود ایک قسم کے اورگنک (Organic) خلیوں (Cells) یا اکائیوں (Fundamental Building Block) کا مجموعہ ہے جنہیں نیورونز (Neurons) کہا جاتا ہے ایک عام آدمی کے دماغ میں اوسطاً ۱۰^۱۱×۱۲ (بارہ ارب) نیورونز ہوتے ہیں۔ دماغ کے ان خلیوں کی تقریباً وہی حیثیت ہے جو مکان کی تعمیر میں اینٹوں کی ہوتی ہے یا بچوں کے کھیل لیگو (LEGO) میں مختلف اکائیوں کی، جس طرح بڑے مکان یا قصر کے لیے زیادہ اینٹوں کی ضرورت پیش آتی ہے اس طرح ذکی اور فہیم کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ عام حالات میں ایسا شخص اپنے دماغ کے زیادہ سے زیادہ خلیوں کو استعمال کرتا ہے کسی حد تک تو یہ وہی چیز ہے لیکن تربیت اور مشق کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ نیورونز کو بیک وقت کام میں لگایا جاسکتا ہے۔ اس طرح یہ بات سامنے آتی ہے کہ غور و فکر کی افزائش کے معنی یہ ہوں گے کہ زیادہ سے زیادہ دماغی خلیوں کو کام میں حصہ لینے کی عادت ڈالیں۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ کام کیونکر کیا جاسکتا ہے۔

صحت مند اور تندرست افراد کے لیے تین طریقے استعمال کئے جاتے ہیں۔ نمبر ۱ مطالعہ نمبر ۲ مشاہداتی تحقیق نمبر ۳ مراقبہ اور ان تینوں طریقہ کار کا انسانی عمل سوچ کو کسی بھی وقت کسی ایک مرکز پر جمع کرنا ہے۔ اس عمل سے دراصل خلیوں کو اس بات کے لیے طبعی طور پر مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ ایک سمت میں حرکت کریں، صوفیائے کرام نے مراقبہ کے عمل کو اس لیے اپنایا کہ اس سے خیال کو یکجا کرنے میں مدد ملتی ہے اور فی زمانہ 'یوگر'،

کی طرف مغربی دنیا اس لیے مائل ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے انہیں اپنی دنیا کے کٹ جانے کا موقع ملتا ہے۔

مطالعہ میں دراصل آنکھ کو استعمال کر کے ایک قسم کی برقی رو دماغ تک پہنچائی جاتی ہے یہ رو ان خلیوں کو ایک خاص انداز میں حرکت کرنے پر مجبور کرتی ہے، اور ان کی اس حرکت سے ایک سرکٹ بن جاتا ہے اگر یہ سرکٹ بند دائرے کی شکل اختیار کر لے تو دماغ میں ایک نقش قائم ہو جاتا ہے اور یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ اسے بلا کسی صعوبت کے دوبارہ حاصل کر لیا جائے۔ اس چیز کو ہم یاد ہو جانا کہتے ہیں یہ عین ممکن ہے کہ ایک چیز وقتی طور سے ذہن میں محفوظ ہو جائے اور کچھ دنوں کے بعد وہ چیز ذہن سے خارج ہو جائے یہ عمل اس وقت ہوتا ہے جبکہ کسی بھی وجہ سے وہ دائرہ دماغ میں اپنا نقش برقرار نہیں رکھ سکا، یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خلیے ایک خاص انداز اور سمت میں حرکت کیوں کرتے ہیں؟ ایک مخصوص قسم کا سرکٹ کیوں بناتے ہیں؟ ایک مرتبہ سرکٹ بن جانے کے بعد وہ مٹ کیوں جاتا ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے متعلق ہمارا علم اب تک ناقص ہے۔ عین ممکن ہے کہ مزید تحقیقات کے ذریعہ بعض پہلو مستقبل میں سامنے آجائیں۔

مشاہداتی تحقیق میں مطالعہ اور مراقبہ دونوں ہی کے عوامل ظہور پذیر ہوتے ہیں یعنی کثرت مطالعہ، تجربہ کے ذریعہ حقائق کا جمع کرنا، ان کا تجزیہ اور بظاہر مختلف پہلوؤں میں استنباط کر کے ہم آہنگی پیدا کرنا وہ عوامل ہیں جو غور و فکر کے لیے مہمیز کا کام کرتے ہیں۔ اس طرح سوچ و بچار تدریجاً ایک عادت سی بن جاتی ہے۔

تجربہ گاہوں کا قیام وقت کی ایک اہم ضرورت ہے

کچھ عرصہ پہلے تک کیفیت یہ تھی کہ ایک ہی شخص میں وقت کے تمام علوم جمع ہو جایا کرتے تھے مثلاً ایک شخص کا حافظ قاری مفسر، محدث، فقیہ، مورخ اور علم الکلام کا

ماہر ہونا اور کسی دوسرے شخص کا مفسر، مورخ، طبیب، فلسفی اور ریاضی دان ہونا کوئی حیرت انگیز بات نہ تھی۔ زمانے کا یہی چلن تھا لیکن وقت کے ساتھ علم میں اس تیزی سے اضافہ ہوا ہے کہ اس علمی روایت کو برقرار رکھنا ممکن نہ رہا اور اب تو صورت حال یہ ہے کہ کسی ایک ہی علم یا فن میں اس قدر شعبہ جات قائم ہوگئے ہیں کہ ان تمام یک شعبہ علوم کا احاطہ کرنا بھی دشوار ہوتا جا رہا ہے اور یہی وجہ ہے علماء و حکماء ضرورتاً اس بات پر زور دینے لگے ہیں 'کسب کمال کن کہ عزیز جہاں شوی' دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ دور تخصص کا دور ہے اس میں صورت یہ ہوتی ہے کہ اجمالی طور پر نظر تو بہت سارے علوم پر ہوتی ہے لیکن عبور کسی ایک ہی شعبۂ علم میں ہوتا ہے۔

ہر شعبۂ علم میں کچھ باتیں تو ایسی ہوتی ہیں جنہیں ہر حال میں صحیح پایا گیا ہے، تجربات، مشاہدات اور مختلف واقعات ان کی صداقت ثابت کر چکے ہیں ایسی تمام باتوں کو اس شعبہ علم میں قانون (لاز) کی حیثیت حاصل ہوتی ہے اس کے علاوہ دوسری تمام باتوں کو آیا مفروضہ یا دعویٰ (Postulate) یا پھر تھیورم (Theorem) کہتے ہیں لیکن علم ریاضی میں دعویٰ کا نظری ثبوت فراہم کر دینا اس دعویٰ کو تھیورم بنا دیتا ہے اور کسی بھی تھیورم کا عملی ثبوت اس کو قانون کی حیثیت عطا کر دیتا ہے اور عملی ثبوت فراہم کرنے کا نام مشاہدہ یا تجربہ کرنا ہے۔ لہٰذا تجربہ کی اصلی غرض و غایت تو یہی ہوتی ہے کہ کسی بھی اصول یا مفروضہ کے لیے ایسا عملی ثبوت پیش کرنا جس کے ذریعہ اس دعویٰ کو قانون کا مقام حاصل ہو جائے۔ تجربہ کی یہ حیثیت تو صرف اس تجربہ کو حاصل ہوتی ہے جو پہلی مرتبہ کیا جائے اس کے بعد جتنے بھی تجربے اس اصول کے متعلق دہرائے جائیں گے وہ سب کے سب اس ثابت شدہ قانون پر یقین اور اعتبار حاصل کرنے کے لیے کئے جاتے ہیں۔ دراصل یہی وہ مقصد ہے جسے حاصل کرنے کے لیے تمام سائنسی تعلیمی اداروں میں تجربہ گاہیں قائم کی جاتی ہیں اور ان تجربہ گاہوں میں طلباء اپنے ہاتھوں سے تجربے کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وہ

جو چیزیں اپنی کتابوں میں پڑھتے آئے وہ صحیح اور درست ہیں۔ ان تمام عوامل کا عامل پر اثر یہ ہوتا ہے کہ پہلے کے مقابلہ میں اس شعبہ علم پر اس کا زیادہ اعتماد اور یقین ہوتا ہے اور یہ چیز اس علم سے یک گونہ دلچسپی اور وابستگی بڑھانے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اس عمل کو شبانہ روز جاری رکھنا اس کی علمیت میں اضافہ کا سبب بنتا ہے اور پھر ایک وقت ایسا آتا ہے جبکہ خود علم اس کی ذات سے پہچانا جاتا ہے اور یہ مقام تحقیق میں گم ہوئے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔

تحقیق کے لیے وسائل ضروری ہیں لیکن یہاں بھی وسائل کی کمیت اور نوعیت کا انحصار موضوع پر ہوتا ہے بعض کے لیے ایک اچھی لائبریری ہی سب کچھ ہے ان علوم میں ادبیات، علوم الانسانیہ کے بیشتر شعبے اور تطبیقی علوم کے نظری شعبے شامل ہیں دیگر علوم کے لیے تجربہ گاہیں از بس ضروری ہیں ان کے بغیر وہ علوم جمود کے شکار ہو جاتے ہیں۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ امریکہ، کینیڈا، روس، مغربی یورپی ممالک اور جاپان مل کر دنیا کا ۹۳ فیصد تحقیقی اور تطبیقی کام کر رہے ہیں اور بقیہ ۷ فیصد میں دنیا کے دیگر ممالک شامل ہیں۔ اس سے اندازہ کرنا مشکل نہ ہوگا کہ علمی کاموں میں ملت اسلامیہ کا کتنا حصہ ہے اور پاکستان کا اس میں کیا رول ہے۔

دینی درس گاہوں میں تجربہ گاہ کی نوعیت

تجربہ گاہوں کو ان کے استعمال کی نوعیت کے لحاظ سے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱) تعلیمی ۔ ۲) تحقیقی

تعلیمی معمل سے مراد وہ تمام مختبرات ہیں جہاں طلباء ان کے ذریعہ اپنے تعلیم کی تکمیل کرتے ہیں ان کی بھی دو قسمیں ہیں۔

۱) لسانی ۔ ۲) سائنسی

پاکستان کے دینی درسگاہوں میں تعلیمی زبان آیا اردو ہے یا پھر عربی لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ ابتدائی درجوں میں اسباق مادری زبان میں سکھائے جاتے ہیں اور بعد میں زیادہ تر عربی استعمال

کی جاتی ہے۔ زبان کو سکھانے کے لیے جدید طرز کے معمل بہت مفید ثابت ہو رہے ہیں جس میں اوڈیو ویژوال اور کیسٹ اور ٹیپ ریکارڈر کے سسٹم نے حیرت انگیز نتائج پیش کیے ہیں یہ دونوں وسائل غیر مادری زبان کے سیکھنے میں بہت ممد و معاون ثابت ہو رہے ہیں۔ عرب دنیا میں ۱۸ - ۱۹ سال کے نوجوانوں کو ہفتہ میں پانچ گھنٹے لیکچرز اور بارہ گھنٹے عملی کام (لیبوریٹری) کے ذریعہ تین سمسٹرز (ہر سمسٹر ۱۶ ہفتے کا ہوتا ہے) میں اس قابل بنا دیتے ہیں کہ طلباء انگریزی میں لیکچرز سمجھ لیتے ہیں اور اس زبان میں پڑھنے اور لکھنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ یہی طریقہ اسلامی یونیورسٹی میں عربی کو سکھانے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر انیس کا کہنا کہ یہاں ایک سال میں عربی زبان مکمل طور پر سکھا دی جاتی ہے[۲۹]

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے دینی مدارس کے پاس مالی وسائل کی بہت کمی ہے اس لیے ہر مدرسہ لسانی معمل کا متحمل نہیں ہو سکتا اس لیے تجویزاً یہ بات رکھی جاتی ہے کہ جہاں کہیں یہ ممکن ہو یا پھر قرب و جوار کے چند مدرسے مل کر اس سہولت کو قائم کریں اور فائدہ اٹھائیں، اس عمل کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ طلباء کم عرصے میں عربی زبان سیکھ لیں گے اس طرح ان کا بچا ہوا وقت کسی اور علم کے حاصل کرنے میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں اسی معمل کو صرف کیسٹ یا فلم کے بدلنے سے کسی بھی دوسری زبان کے سیکھنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک سائنسی معمل برائے سائنسی مضامین کا تعلق ہے تو بہتر صورت تو یہی ہے کہ ایک چھوٹی سی لیب موجود ہو جس میں جا کر طلباء تدریسی تجربے کریں۔ ناگزیر حالت میں کسی بھی سائنس کے استاد سے مل کر ضروری چیزیں مہیا کر لی جائیں جنہیں استعمال کر کے طلباء میں سائنسی ذوق کو ابھارا جائے۔ امداد باہمی کی بنیاد پر ایک شکل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ قرب و جوار کے کسی اسکول یا کالج کے معمل سے استفادہ کیا جائے۔

اسکام میں تعلقات کا خاصا عمل دخل ہے پھر بھی چھوٹے پیمانے پر مدرسے میں سائنسی تجربے کروائے جا سکتے ہیں۔

تحقیقی تجربہ گاہ کی نوعیت

ہمارے لیے رشد و ہدایت اور علم کا منبع قرآن و سنت ہے لہذا جتنا زیادہ اس میں فہم و ادراک پیدا ہوگا اتنا ہی زیادہ عمل کی راہیں کھلیں گی اور اسی نسبت سے مسلمانوں کو فلاح وفوز نصیب ہوگا۔ یقیناً اب تک ائمہ کرام اور علماء عظام نے دین کے ہر شعبہ میں بہت ہی بیش قیمت کام انجام دیا ہے لیکن اس کے ہرگز ہرگز یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ علمی اور تحقیقی کام کے لیے اب کوئی گنجائش نہیں ہے اور نہ ہی اس کی ضرورت، ایسی فکر علمی لحاظ سے موت کے اندھیرے کنویں میں چھلانگ لگانے کے مترادف ہے اور کوئی بھی صحیح الفکر عالم ایسے فکر کی کبھی بھی حمایت نہیں کرے گا۔ ہاں یہ بات ضرور پیش نظر رہنی چاہیے کہ جو کام پہلے ہی ہو چکا ہے اس کا اعادہ وقت کا زیاں ہوگا۔

ان تمام پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے میری یہ تجویز ہوگی جدید وسائل کو بروئے کار لاکر قرآن اور احادیث پر علمی تحقیق کا آغاز کیا جانا چاہیے۔ جہاں تک قران اور کمپیوٹر کا تعلق ہے تو بہت ہی ابتدائی کام امریکہ میں اور کچھ کام مصر میں ہوا ہے۔ حدیث کے سلسلے میں کمپیوٹر کو مصطفےٰ الاعظمی اور مفتی برکت اللہ صاحب نے استعمال کیا ہے لیکن وہ دونوں بھی ابتدائی مرحلے سے گذر رہے ہیں۔ الاعظمی صاحب البتہ اب تک چالیس ہزار احادیث کمپیوٹر پر لے آئے ہیں جن کے ذریعہ وہ احادیث پر کام کرنا چاہتے ہیں۔

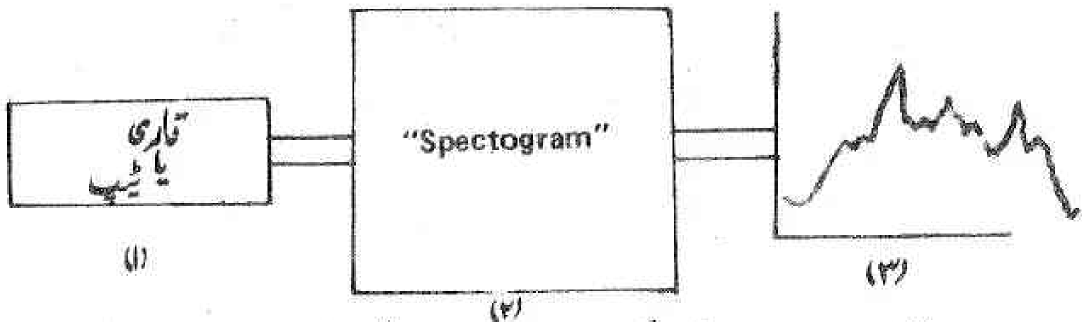
یہاں جس چیز کی طرف توجہ مبذول کرائی جا رہی ہے اس میں کمپیوٹر کا استعمال دوسرے نمبر پر آئے گا اس سے پہلے جدید آلات کے ذریعہ تجربے کئے جا سکتے ہیں اور ان حاصل شدہ معلومات کا تجزیہ کمپیوٹر کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے۔ مجوزہ تجربہ کی پشت پر کچھ سائنس اور فنی تعلق ہیں ان کا بیان شاید مفید ہو۔ آواز ایک قسم کی طاقت ہے اور طاقت کی ہیت تبدیل کی جا سکتی ہے۔ اسی اصول کے تحت ہر قسم کی آواز کا ریکارڈ تیار کیا جا سکتا ہے جس کی مختلف صورتیں ہو سکتی

ہیں ۔ پہلی شکل تو وہی ہے جس میں آواز کو آواز ہی کی شکل میں محفوظ کیا جاتا ہے اور حسب ضرورت اسے سنا جا سکتا ہے جیسے کیسٹ ریکارڈنگ، مووی فلم ریکارڈنگ وغیرہ۔ دوسری شکل یہ ہے کہ آواز کو اعداد و شمار کی شکل میں سنبھال لیا جائے اس حیثیت میں اصل آواز کو دوبارہ استعمال کرنا مقصود نہیں ہوتا بلکہ آواز کا تجزیہ مطلوب ہوتا ہے۔ تیسری صورت ایک گراف کی شکل ہوتی ہے اس کا ہدف بھی تجزیہ ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ وہ گراف جسے آواز کا گراف (Audio - Spectograph) کہا جاتا ہے حاصل ہو جائے تو پھر اس کی مدد سے بہت ساری معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ اس کام کے لیے کن کن آلات کی ضرورت ہو گی اور کیا کیا معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ ان کا تذکرہ نیچے کیا جاتا ہے۔

آلات کی نوعیت

اصولی طور پر اس کے لیے چند قراء اور ایک عدد وہ مشین جسے آواز کا اسپکٹرو گرام کہتے ہیں درکار ہے ابتدائی نتائج کے تجزیہ کے لیے کمپیوٹر کا استعمال مناسب رہے گا۔ ان تمام چیزوں کو نقشہ نمبر ا کی مدد سے سمجھا جا سکتا ہے۔



شکل نمبر ا: آواز کو اسپکٹرو گرام میں داخل کر کے نتیجہ گراف کی صورت میں حاصل ہوتا ہے جسے بعد میں اعداد و شمار کی شکل میں بدلا جا سکتا ہے۔

ا) موجودہ صورت میں کوئی قاری یا اس کے عوض اس کے آواز کی ٹیپ (۲) وہ اساسی آلہ

جو اس کام کے لیے درکار ہے (۳) حاصل شدہ نتیجہ کو ظاہر کرتی ہے آواز کی تمام خصوصیات کو ایک گراف کی شکل میں محفوظ کر لیا گیا ہے اس گراف سے حاصل شدہ معلومات کو بذریعہ کمپیوٹر مزید معلومات حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے۔

۱) ہر سورہ کا عمودی مضمون

تفہیم قرآن میں اس بات کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے کہ ہر سورہ کا مرکزی مضمون کیا ہے۔ یہ علم خاص کر بڑی سورتوں کے سمجھنے میں بہت مدد و معاون ثابت ہوتا ہے اب رہی یہ بات کہ ہم الیکٹروگراف سے کیونکر حاصل کر سکیں گے تو بہتر یہ ہے کہ اسے کسی اور موقع کے لیے اٹھا رکھا جائے لیکن جو لوگ اس شعبہ علم سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ آواز پر کسی جدید کتاب سے رجوع کریں۔

۲) نظمِ قرآن

بالعموم قرآن سرسری نظر سے مطالعہ کرنے والا یہ دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہے کہ اس کے مختلف مضامین میں کوئی ربط نہیں ہے اس نکتہ کو پانے کے لیے قرآن سے شغف چاہیئے جو وقت کے ساتھ ساتھ بتدریج مفقود ہوتا جا رہا ہے۔ اسی چیز نے اہل مغرب کو بھی قرآن سے دور رکھا ہے۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ مغربی دنیا کے لوگ ان چیزوں کی طرف زیادہ متوجہ ہو جاتے ہیں جو تحقیق کی زبان میں کی جائے۔

عام حالات میں جب کبھی قرآن کی دعوت ان کے سامنے رکھی جاتی ہے تو اس کو قبول کرتے ہوئے ان کا یہ سوال ہوتا ہے مانا کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور یہ کتاب رشد و ہدایت ہے اور یہ تمام مسائل کا اصولی حل پیش کرتا ہے تو پھر آخر مسلمان کیوں اس کے ذریعہ اپنے مسائل حل نہیں کر لیتے؟ اس سوال کا جواب دیا جا سکتا ہے اور دیا گیا ہے[۱۸، ۱۹] لیکن جواب کی نوعیت آیا تاریخی

ہے یا پھر نظری، ضرورت تو اس بات کی ہے کہ

وقل لھم فی انفسھم قولا بلیغا۔ (النساء ۶۳)
تم انہیں ایسی باتیں کہو کہ ان کے دل میں اتر جائیں۔

ان دنوں اہل مغرب کا ذوق سائنسی ہے لہذا انہی کے مذاق کے لحاظ سے اگر قرآن کی دعوت ان کے سامنے رکھی جائے تو عین ممکن ہے

شاید کہ تیرے دل میں اتر جائے میری بات

اس تحقیق کے ذریعہ یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ مختلف آیتوں کے درمیان کس نوعیت کا ربط ہے، ربط کے مختلف حصے ہوتے ہیں اسے سمجھنے کے لئے اس بات کا جاننا ضروری ہوگا کہ ایک سورت کے گراف میں کتنے کتنے وقفہ سے ایک ہی قسم کا گراف (Pattern) آیا ہے۔ کتنی مرتبہ آیا ہے، کن کن مقام پر آیا ہے یکسانیت نہ ہونے کی صورت میں اختلاف کی نوعیت کیا ہے، کن حالات میں ان طبعی اختلاف کو دور کیا جا سکتا ہے اور ان تمام اجزاء کو ملا کر ربط کے متعلق فہم و ادراک حاصل کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ سبعہ احراف کی تحقیق

قرآن کریم کے سات حروف سے کیا مراد ہے اس میں علماء کے درمیان اختلاف رہا ہے اکثریت کا کہنا ہے کہ اس سے مراد قراءتوں کا اختلاف ہے اس طرح سات حروف سے مراد "اختلاف قرات" کی سات نوعیتیں ہیں جس میں مفرد اور جمع "تذکیر و تانیث"، وجوہ اعراب، صرفی ہیت، حروف نحویہ، الفاظ اور لہجوں کا اختلاف شامل ہے تفصیل اور مثال کے لیے اتقان فی علوم القرآن[۲۰] اور علوم القرآن[۲۱] سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔

اسپکٹروگرام کے ذریعہ بہت حد تک اس بات کا تعین ہو سکتا ہے کہ راجح ترین قرات کونسی ہے اور اس کی بنیادیہ اصول ہے کہ الفاظ، تلفظ وغیرہ سے گراف کے شکل کی ہیئت

بدل جائے گی مثلاً عین ممکن ہے کہ سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۵۹ میں جہاں لفظ نَنشُزُھا کے ساتھ ساتھ دوسری قرأت نُنشِزُھا بھی آئی ہے وہاں ہیئت شکل کچھ اس انداز میں بدلے کہ ایک کو دوسرے پر ترجیح دی جا سکتی ہو تو ایسی صورت میں فیصلہ مقابلتاً آسان ہوگا۔

۴) بعض نظریوں کا ابطال ثابت ہو سکے گا

مختلف ادوار میں لوگوں نے اپنے اپنے فکر کی صداقت ثابت کرنے کے لیے قرآن میں مختلف قسم کی تحریفات کی ہیں بعضوں نے معنی میں تحریف کیا ہے اور بعضوں نے حرکات و سکنات میں اور بعضوں نے الفاظ میں بھی اس کو روا رکھا ہے ابھی ابھی[۲۲] ایک چیز سامنے آئی ہے جس کے ذریعہ ایک انوکھی بات ثابت کرنے کی بے نتیجہ کوشش کی گئی ہے اس قسم کی شیطانی باتوں کا سائنسی حقائق کی بنیاد پر غلط اور بے بنیاد ہونا ثابت کیا جا سکے گا۔

۵) دیگر فوائد

متذکرہ باتوں کے علاوہ کچھ اور بھی ایسے فوائد حاصل ہوں گے جن کا صرف تذکرہ کر دینا غیر مناسب نہ ہوگا۔

الف : یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ قرآن کے اندر ایک نغمہ اور غنا ہے۔

ب : عین ممکن ہے کہ آواز کے بنیادی اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ ثابت کیا جا سکے کہ یہ انسانی کلام ہو ہی نہیں سکتا۔

ج : دینی مدارس کے فضلاء کو سائنسی طریق تحقیق سے متعارف کرایا جا سکے گا۔

د : باہمی تعاون کی راہ ہموار ہوگی کیونکہ یہ کام کئی علوم کے ماہرین کے تعاون ہی سے ہو سکتا ہے۔

آخری کلام

اس مضمون میں اس بات کو موثر انداز میں رکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ غور و فکر کے عمل کی افزائش کے لیے اعلیٰ دینی مدارس میں علمی اور سائنسی تحقیقات کا آغاز کیا جانا چاہیے تاکہ غیر مسلموں میں دعوت و تبلیغ کے لیے کچھ سائنسی مواد فراہم کیا جا سکے، یہاں تو صرف ایک ہی قسم کی تحقیق کی تفصیلات رکھی گئی ہیں۔ ویسے کوشش یہ ہونی چاہیے کہ مختلف قسم کی تجربہ گاہیں تدریجاً قائم کی جائیں جہاں قرآن اور احادیث کی صداقت اور اس کے پیغام کی حقانیت کو ثابت کیا جائے۔ وآخر دعونا ان الحمد للہ رب العالمین۔

کتابیات

۱) عبدالقدوس ہاشمی، ص ۷، تعلیم و تعلم، مرتبہ سید الطاف علی بریلوی۔
ناشر اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، کراچی (۱۹۶۶)
۲) ایضاً ص ۷
۳) ایضاً ص ۱۰
۴) نیاز احمد صدیقی ص ۲۶، تعلیم و تعلم
۵) ایضاً ص ۲۷
۶) ایضاً ص ۴۶
۷) مناظر احسن گیلانی نظام تعلیم و تربیت ص ۲۲۱
۸) ابو الاعلیٰ مودودی تعلیمات
۹) ابو الاعلیٰ مودودی اسلامی نظام تعلیم: نفاذ کی عملی تدابیر
۱۰) خورشید احمد: نظام تعلیم کی اسلامی تشکیل جدید
۱۱) مفتی محمد شفیع: معارف القرآن جلد چہارم ص ۴۸۹ (۱۹۷۷)
۱۲) ایضاً ص ۴۹
۱۳) ابو الاعلیٰ مودودی تفہیم القرآن جلد دوم ص ۲۵۱-۲۵۲ (۱۹۷۱)

۱۴) البقرہ آیت ۲۵۹ - ۲۶۰ کی تشریح میں تفصیل دیکھی جاسکتی ہے۔

15 : Charles Fust, "Origins of The Mind" 1979.

۱۶) مولانا گوہرالرحمن : سیمینار میں گفتگو ۲۳ نومبر ۱۹۸۶ء

۱۷) ڈاکٹر انیس احمد ذاتی گفتگو

18 : Marryam Jamila, "Islam in Theory & Practice"

۱۹) ابوالاعلیٰ مودودی ، اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے۔

۲۰) جلال الدین سیوطی الاتقان فی علوم القرآن ص ۱۲۰-۱۳۲ ادارہ اسلامیات لاہور (۱۹۸۲)

۲۱) محمد تقی عثمانی علوم القرآن اور اصول تفسیر مکتبہ دارالعلوم کراچی (۱۰۶ - ۱۰۷ (۱۳۹۶ھ)

۲۲) محمد یوسف لدھیانوی بینات نومبر ۱۹۸۶ء (ص ۳)

پاکستان میں نظام تعلیم کی اسلامی تشکیل

حکمت عملی

ماہرین کی عملی تجاویز......

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز

کے ایک سیمینار کی روداد

ترتیب: مسلم سجاد

مباحث: اجلاس چہارم

مسلم سجاد

ڈاکٹر منصور صاحب نے مقالے میں تجربے گاہوں کو جہاں تک پہنچایا ہے میرا تاثر ہے کہ اس طرح قرآن کی روح اور تاثر ختم ہو جائیں گے۔

فرید احمد پراچہ

"قرآن اور اسلام کی حقانیت کا معیار اگر سائنسی تحقیقات یا سائنسی آلات کی گواہی بنا لیا گیا تو اس سے بڑے غلط رجحانات پیدا ہوں گے۔"

پروفیسر خورشید احمد

اس محفل کا مقصد یہی ہے کہ مختلف قسم کے خیالات سامنے آئیں، ان پر جرح و تنقید ہو تاکہ صحیح رخ کے تعین میں مدد ملے۔

معروف شاہ شیرازی

تجربے کوئی معیار نہیں، یہ تھیوریاں بدلتی رہتی ہیں۔ اب تو خود طبعیات (فزکس) کے پہلے سے جمے ہوئے بنیادی اصولوں کو بدل کر نئی راہوں کی تلاش کا عمل جاری ہے سائنس میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ باقی جہاں تک سمعی و بصری امدادی آلات سے دینی مدارس کو فیض یاب ہونے کا مشورہ دیا گیا ہے اس ضمن میں عرض یہ ہے کہ یہ آلات یا ان آلات سے استفادہ تو ہمارے ملک کے اعلیٰ ترین جدید تعلیمی اداروں میں بھی نہیں ہو رہا کجا یہ کہ کتاب،

روٹی، اور اساتذہ کی تنخواہوں کے لئے معاشی طور پر لاچار دینی درس گاہوں کو ان کے استعمال کی ترغیب دی جائے۔

ڈاکٹر منصور علی

جدید وسائل کو بروئے کار لاکر قرآن و حدیث پر تحقیق کا کام ہو رہا ہے لہٰذا وہ آلات جو دینی افراد کی دسترس میں ہیں ان کو نظر انداز کرنا یا ان سے استفادہ نہ کرنا سخت کوتاہی ہوگا۔

پروفیسر خورشید احمد

اس کام کو ہم تحقیق نہیں کہہ سکتے۔ اس طرح کا کام ہے جس طرح پہلے لغت Dictionary کیا کرتی تھی کہ اسے جس لفظ کا جو معنی بتا دیا گیا وہ سائل کو مدد سے مل جائے مطلب یہ ہے کہ ڈکشنری میں لکھنے والا بھی فرد، اور استفادہ کرنے والا بھی فرد۔۔۔۔اسی طرح کمپیوٹر کی حیثیت ہے، جو چیز اس کی یادداشت میں فرد ڈالے گا کمپیوٹر اس کی ہدایات پر جواب اگل دے گا۔ جدید آلات سے استفادہ کرنا اپنی جگہ مگر دین، ایمان اور انسانی زندگی کے لطیف جذبات و احساسات کے سامنے آلات کی Limitations (حدودِ کار) بھی متعین رہنی چاہئیں۔ کچھ حلقوں کی جانب سے قرآن پاک کی صداقت اور حدیث کی روایت کو کمپیوٹر کے ذریعے جانچنے کا عمل اصولی طور پر غلط اور گمراہ کن ہے۔

مفتی سیاح الدین کاکاخیل

قرآن پاک کے الفاظ کو ۱۹ کے عدد سے جانچنے کے نظریئے کی تاریخ بڑی پرانی ہے۔ اصل میں یہ بہائیوں کی قدیم کارستانی ہے، جس کو اب نئے نام سے کمپیوٹر میں ڈال دیا گیا ہے۔ ہم نے قرآن پاک پر ایمان رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت، پیغام و الفاظ کے اعجاز اور پھر مسلسل چودہ سو سال سے اس میں بلا تغیر و تبدل کے ایک حقیقت کے طور پر کیا ہے اب کوئی کمپیوٹر اس کے کسی لفظ کے بارے نعوذ باللہ کوئی الٹ نتیجہ نکالے تو ہمارے لئے وہ ہرگز حجت نہیں ہو سکتا۔

ڈاکٹر منصور علی

میرا مطلب تھا کہ نظم قرآن پر بہت کم کام ہوا ہے اسے کمپیوٹر کی اس تکنیک کے ذریعے جاننے کی کاوش تو ہوسکتی ہے۔ کوئی مسلمان نعوذ باللہ کمپیوٹر کے ذریعے قرآن کی صداقت کو پرکھنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا، البتہ حدیث کی پرکھ پر ہمیشہ کام ہوا ہے اور آج کے دور میں بھی اس پر تحقیق ہوسکتی ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔"

مفتی سیاح الدین کاکاخیل

دیکھئے! اگر کمپیوٹر کو یہ کام سونپ دیا تو پھر یہ خطرہ بھی مول لینا پڑے گا کہ وہ کہہ دے "یہ حدیث نہیں" پھر کیا کریں گے آپ؟ مشین کو یہ کام سونپنا شدید قسم کی زیادتی ہوگی۔ جس کی انتہا کا میں تصور بھی نہیں کرسکتا۔

(رپورٹ: مرتبین)

قرآن کریم اور

نباتیات وزراعت

......کی تدریس

پروفیسر ارشد جمیل

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد

صدارتی خطاب

مولانا گوہر الرحمان

حضرات گرامی

مجھے افسوس ہے کہ میں اس اجلاس میں پورا وقت شرکت نہیں کرسکا۔

آپ حضرات نے اس سیمینار میں شرکت کرکے جن موضوعات پر کلام فرمایا ہے، اس کی نوعیت عالمانہ ہے، ہمدردانہ ہے اور دین اسلام کی اشاعت و تدریس کے لئے نہایت دردمندانہ ہے اس محفل میں موجود ممتاز علمائے دین اور جدید تعلیم کے ماہرین تشریف فرما ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے معاشرے کی تمام تر خامیوں کو درس نظامی سے منسلک کرنا ناانصافی ہوگا اصولی طور پر درس نظامی کے ساتھ جدید علوم کو ملا کر پڑھنا مفید تو ہے مگر موجودہ حالات میں ایسا اقدام بہ یک جنبش کرنا الٹا نقصان دہ ہوگا۔ یاد رہے کہ معاشرے میں مجموعی اور بنیادی تبدیلی لائے بغیر کوئی اقدام دیرپا ثابت نہ ہوسکے گا۔

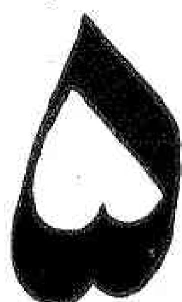
جہاں تک جدید سائنسی ایجادات، آلات اور جدید ذرائع و وسائل کو استعمال کرنے کا مسئلہ ہے، اس ضمن میں اللہ اور اس کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت واضح طور پر موجود ہے کہ دنیا کی بہترین چیزوں اور جدید وسائل کو اللہ کے دین اور حق کے لیے استعمال کرنا چاہیے مگر ہدایت کے ساتھ ساتھ انہیں استعمال کرنے کے کچھ اصول اور حدود ہیں۔

اس معاملہ میں دو رائے نہیں ہوسکتیں کہ یہ چیزیں تعلیم و تدریس میں مفید ہیں مگر یاد رکھنا چاہئے کہ تعلیم و تدریس میں اصل چیز، صرف کتاب اور قلم نہیں ہوتے اور نہ صرف مشین کی طرح

لکھنا مقصود ہے، بلکہ اصل چیز استاد اور شاگرد کا روحانی تعلق ہوتا ہے اور اس پاکیزہ اور مقدس تعلق کی تاثیر بھی ہوتی ہے۔ یہ بات ہمارے مشاہدے کی ہے کہ بعض اوقات اساتذہ اور اصحابِ علم کی محفل میں بیٹھنے کا ایک ناقابل بیان اثر ہوتا ہے۔ دل اور روح اس تاثیر سے آشنا ہوتے ہیں۔ استاد کی زبان سے نکلنے والے لفظ سے اس کا پس منظر اور اس کا مزاج معلوم ہوتا ہے جبکہ ماحول تو اپنا اثر رکھتا ہی ہے۔

البتہ تعلیم کی اشاعت کے لیے اور فن تدریس کو مؤثر بنانے کے لیے جدید وسائل کو استعمال کرنا چاہیے لیکن بقدرِ ضرورت اور بوقتِ ضرورت۔

اللہ تعالیٰ اس مذاکرے کو مفید بنائے، برکت دے اور توفیق عطا فرمائے کہ ہم ایک ایسے نظامِ تعلیم کا خاکہ مرتب کر سکیں جو دین کے لیے مفید ہو سکے۔



اختتامی کلمات

ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۔ نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡم ۔

دینی اور دنیوی نظام تعلیم کے ماہرین کی اس بابرکت محفل میں اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ آپ کے فہم و بصیرت سے استفادہ کر سکوں ۔ اس محفل میں عالم بھی ہیں اور دینی علوم کے تجربے کار ماہرین بھی جو پورے معاشرے خصوصاً سارے علوم کو صبغۃ اللہ یعنی اللہ کا رنگ دینا چاہتے ہیں ۔ اس کارِ خیر کے لیے انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کے چیئرمین پروفیسر خورشید احمد بلاشبہ تحسین کے مستحق ہیں ۔

عرصہ دراز سے میرا تعلق بھی تعلیم و تعلم سے رہا ہے اور دینی علوم کی جستجو سے یہ حقیقت بالکل ظاہر ہے کہ فزیکل سائنسٹس ہوں یا سوشل سائنسز ان کے لیے فہم دین قدم قدم پر رہنمائی کرتا ہے ۔ گویا کہ وہ علوم جنہیں بادی النظر میں دنیادی علوم کہا جاتا ہے اگر انہیں خدا کی اطاعت دین حق کی اشاعت اور حقیقی معنوں میں انسانوں کی خدمت کے لیے پڑھا اور پھیلایا جائے تو یہ کارِ ثواب ہے ، اگر ان علوم کو محض ذاتی شان و شوکت ، خدا سے بغاوت اور انسانوں پر جبر و ظلم کے لیے جانا اور پھیلایا جائے تو یہ اسلام کی روح سے متصادم ہے ۔

اسی طرح دینی علوم میں للہیت اور خلوص نہ ہو تو وہ بھی شخصی سطح پر انسان کے لیے الٹا نقصان دہ ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ دینی علوم میں فہم و بصیرت حاصل کرنا اور ان کو پھیلانا بھی ایمان کے تقاضوں اور علم کی دولت کا متقاضی ہے ۔ ان نزاکتوں کو ملحوظ رکھنے والے ہی خدا تعالیٰ کے ہاں شرف قبول پاتے ہیں ۔ کیونکہ اللہ دیکھتا ہے کہ ہمارے دلوں میں کیا ہے " ! اسی سوچ کے زیر سایہ قرآن و حدیث کے ساتھ

ساتھ فلسفہ و منطق ادب اور علم کلام ہیں کاوشیں خاص قسم کی نورانیت پیدا کرتی ہیں۔ ہمارے دلوں کو اللہ کی پہچان اور محبت سے آشنا کرتی ہیں، اللہ تعالی اندھیرے سے نور کی طرف لاتاہے۔ اگر سمت صحیح ہوگی تو انسان کا قلب معرفت کی لذت سے آشنا ہوتا ہے۔ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل ہم پر جتنے بھی احسانات اور رحمتیں ہوئی ہیں ان میں سب سے بڑا احسان "العلم" کا امین ہونا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ ہم اپنی سندھ یونیورسٹی کے شعبہ کیمیا Chemistary میں داخل ہوتے تھے تو یوں لگتا تھا جیسے علوم اسلامیہ کے شعبے میں آ گئے ہوں، وہ لوگ یعنی اساتذہ اور طلبہ نماز و تراویح کے پابند تھے۔ کتبے آیات قرآنی سے مزین تھے اسی طرح انجینئرنگ کالج میں اتنے نیک لوگوں کو دیکھ کر انہیں ولی اللہ ماننے میں کوئی بات مانع نہ تھی، ان افراد کو اپنے فن اور کام میں کمال حاصل تھا اور زبان و کلام پر اسلامی تعلیمات کے عین مطابق کنٹرول تھا۔ اس کے برعکس میرے اسلامیات ڈیپارٹمنٹ میں بعض لوگ نماز بھی نہ پڑھتے تھے۔ یہ بات کہہ کر میں کوئی توہین کا پہلو نمایاں نہیں کرنا چاہتا مگر یہ بات واضح کرنا چاہتا ہوں کہ فکر و نظر کے زاویے کی درستی کے بغیر مطالعہ اسلامیات بھی نافع نہیں اور ایمان و ایقان کی موجودگی میں Natural Sciences بھی صراط مستقیم پر لے چلتی ہیں۔

دنیاوی علوم کا المیہ یہ ہے کہ ان میں اللہ کا تصور نہیں اور آخرت کا قرینہ نہیں ریاضی، طبیعات، حیوانیات، نباتات، کیمیا، ارضیات اور فلکیات وغیرہ کے مطالعے کے دوران میں طالب علم قدم قدم پر Wonder (حیرت) سے دوچار ہوتا ہے۔ اس سارے نظم کی ایک ایک کڑی اسے ہر آن حیرتوں کی دنیا میں گم کر دیتی ہے، لیکن بدقسمتی سے وہ یہ جستجو نہیں کرتے کہ اس Wonder کے پیچھے کارفرما کون ہے۔ وہ ہستی یقیناً اللہ تعالےٰ ہے اس لیے جونہی سائنسدان کو خدا پر ایمان کی دولت نصیب ہوتی ہے تو وہ عموماً عمرانی علوم کے ماہروں سے بڑا موحد اور صاحب ایمان بنتا ہے۔ اس اشارے سے میرا مطلوب یہ ہے کہ اسلام فطرت، سائنس اور تحقیق سے متصادم نہیں بشرطیکہ ایمان کے ساتھ

ہو، اور زوال پذیر جسد خاکی میں جوہری قوت یعنی روح کو جلا بخشنے اور آخرت میں کامران کرنے والا ہو۔ ہر علم و فن کو تلہیت اور روحانیت کی جلا دینے کے لئے قرآن کریم میں ہے۔

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ یعنی اپنے رب سے تعلق باقی رکھنے کا حکم ہے جس سے نور و معرفت حاصل ہوتے ہیں اور بندہ صالح بنتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ہدایت نور علم کی توفیق عطا فرمائے، اور ہمیں توفیق دے کہ ہماری زندگی "العلم" کی روشنی سے منور ہو۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

اسلامی نظام تعلیم کی جانب عملی پیش رفت کیلئے

ایک فکر انگیز کتاب

کیمیا کی تدریس

...... نظریاتی پہلو

ڈاکٹر عبد السمیع

عمرانی علوم کی تدریس

.... کا نظریاتی پہلو

پروفیسر عظمت اللہ خان

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد

سفارشات

پاکستان میں رائج دینی مدارس کے نظام کو بدلتے ہوئے حالات کے تحت جس چیلنج کا سامنا ہے، ان پر غور و فکر کرنے اور راہِ عمل تلاش کرنے کے لیے ۲۳، ۲۴ نومبر کو انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کے زیر اہتمام اسلام آباد میں سیمینار منعقد ہوا۔ سیمینار میں درج ذیل موضوعات پر اہم مقالات پیش کیے گئے۔

دینی مدارس کا عمومی جائزہ

معاشرہ میں دینی مدارس کا مطلوبہ کردار

رائج نصاب کا جائزہ نئی نصابی ضروریات اور مطلوبہ تبدیلیاں

نظامِ کار میں مطلوبہ اصلاحات

ان موضوعات پر بحث و مباحثہ کے بعد درج ذیل نکات پر اتفاق رائے ہوا۔

(یہاں یہ امر پیش نظر رہے کہ مقالات اور مباحث میں دیگر متعدد تجاویز بھی آئی ہیں جو سیمینار کی کاروائی کے ساتھ اشاعت پذیر ہوں گی۔ یہاں صرف بنیادی نوعیت کی سفارشات پیش کی جارہی ہیں)

۱۔ کردار

موجودہ دور میں دینی مدارس سے جس کردار کے ادا کرنے کی توقع کی جاتی ہے وہ درج ذیل نکات پر مشتمل ہے۔

الف) ان مدارس کا تاریخی کردار علماء دین، مفسرین، محدثین اور فقیہ پیدا کرنا ہے، جو اپنے اپنے میدان میں نمایاں مقام رکھتے ہوں اور زندگی کے ہر شعبہ میں امت کی رہنمائی کر سکیں،

ب) مساجد کے لیے آئمہ اور خطباء کی تیاری جو اپنے علاقوں میں عامۃ الناس اور جدید تعلیم یافتہ افراد کے اعتماد پر پورا اتر سکیں۔

ج) دین کے مبلغین اور داعیوں کی تیاری، جو نہ صرف پاکستان میں بلکہ دوسرے ممالک میں مسلمان Communities اور نومسلموں کی دینی تعلیم و تربیت اور غیر مسلموں میں تبلیغ دین کی ضرورت کو پورا کر سکیں۔

د) جدید تعلیمی اداروں کے لیے نہ صرف عربی و اسلامیات وغیرہ بلکہ معاشیات، عمرانیات اور سیاسیات و قانون کے لیے معلمین تیار کرنا۔

ہ) سماجی خدمات کے دوسرے اداروں خصوصاً ابلاغ عامہ اور انتظامات وغیرہ میں فعال کردار ادا کرنا۔

و) اسلامی نظام کے قیام کی جو جدوجہد ملک میں جاری ہے اس میں طلبہ کو مثبت اور فعال کردار ادا کرنے کے لیے تیار کرنا اور اسلام دشمن قوتوں کی کوششوں اور ریشہ دوانیوں کو ناکام بنانا۔

۲۔ مرکزی نظم

مرکزی طور پر ایک خود مختار اور با اختیار وفاق المدارس کی تشکیل کی جائے جس میں ہر وفاق کی نمائندگی ہو۔ نیز یونیورسٹی گرانٹس کمیشن، وفاقی وزارتِ تعلیم اور اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے نمائندے بھی شریک ہوں۔

یہ وفاق تمام مدارس کے نظام میں مجموعی بہتری اور یکساں معیار پیدا کرنے کا مستقل ادارہ ہو، محض امتحانی ادارہ نہ ہو۔

۳۔ نصابیات

مرکزی وفاق سے ملحق ایک نصابی تحقیقی ادارہ قائم کیا جائے جو عصری ضروریات کے مطابق نصابات میں ترمیم و اصلاح کے عمل کو جاری کرے اور جدید طباعتی معیار کے مطابق درسی کتب تیار کرے اور فراہم کرے۔ شرکاء کی جانب سے نصاب کے بارے میں متفقہ طور پر مندرجہ ذیل امور کی جانب توجہ دلائی گئی۔

الف) یہ امر مستحسن ہے کہ متعدد مدارس میں قرآن مجید کی ترجمہ اور تفسیر کے ساتھ تعلیم کا آغاز ہو چکا ہے۔ البتہ جن مدارس میں ابھی تک اس کا اہتمام نہیں اس میں فوراً اس کا اجراء ہونا چاہیے۔

ب) عربی زبان کی تدریس کی ابتدا اس طرح کی جائے کہ طالب علم عربی زبان بولنے اور لکھنے کی صلاحیت پیدا کرے۔ بعد کے مراحل میں ادب عالیہ کی کتب کو پڑھایا جائے اس سلسلے میں ابتدائی طور پر مندرجہ ذیل کتب سے مدد لی جا سکتی ہے۔

النحو الواضح، تمرین النحو، تمرین الصرف، الاسلوب الصحیح،
القراءۃ الراشدہ، قصص النبیین، عربی کا معلم۔ لغۃ الاسلام

ج) منطق کی تعلیم "قطبی" تک رکھی جائے۔ اس سے زائد کتب کو اختیاری قرار دیا جائے۔

د) تاریخ اور اہم عصر اسلامی دنیا کو شامل نصاب کیا جائے۔ تاریخ اسلام میں۔

۱) سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم

۲) عصر الخلفاء الراشدین

۳) الدولۃ الامویۃ

۴) الدولۃ العباسیۃ

۵) برصغیر میں مسلمانوں کی تاریخ (قیام پاکستان تک)

۶) ہماری بادشاہتیں۔

ہم عصر اسلامی دنیا میں مسلمان ممالک کے سیاسی، جغرافیائی معاشی اور اجتماعی امور سے متعلق ضروری معلومات مہیا کی جائیں۔

و) فلسفے میں "ہدیہ سعیدیہ" کا مقدمہ اور "ہدایۃ الحکمت" کی شرح تک تعلیم دی جائے اور باقی جدید مکاتب فکر کے مطالعے کے لیے مندرجہ ذیل کتب سے مدد حاصل کی جائے۔

"الاسلام والمذاہب الفکریۃ المعاصرۃ" ۔ محمد قطب "الادیان والفرق" ۔

شیخ عطیہ صالح "الاسلام یتحدی" ۔ وحید الدین خان

تقابل ادیان اور عصری تحریکات کا جائزہ

ز) علم کلام میں قرآن و حدیث سے منقول عقائد کے نقلی اور عقلی دلائل کی تعلیم دی جائے، نیز جدید فکر کے نتیجے میں ان پر جو شکوک و شبہات وارد ہو رہے ہیں ان کی اور ان کا رد کرنے کے لیے عقلی اور نقلی دلائل کی تعلیم بھی دی جائے۔

ح) مختلف دینی ادارے اپنے یہاں فراغت کے بعد طلبہ کے لیے تخصص کا انتظام کریں۔ یہ انتظام مندرجہ ذیل شعبوں میں سے کسی ایک یا ایک سے زائد میں کیا جا سکتا ہے۔

(۱) علوم القرآن

(۲) علوم الحدیث

(۳) علوم الفقہ

(۴) علوم اللغۃ العربیۃ

(۵) دعوۃ والارشاد

ط) فراغت کے بعد انگریزی زبان کی تعلیم پر بھی کچھ عرصہ صرف کیا جانا چاہیے۔ یہ اس طرح سے ہو کر طالب علم انگریزی زبان میں تقریر و تحریر کی صلاحیت و استعداد حاصل کر سکے۔

۴۔ تربیت اساتذہ

ا معیار تعلیم کو بلند کرنے اور طریق تدریس کو موثر بنانے کے لیے ہر وفاق کے تحت اپنے مدارس

کے لیے تربیت اساتذہ کا ادارہ قائم کیا جائے۔ بہتر ہے کہ یہ ادارے مختلف شہروں میں ہوں، اگر وفاق یہ اہتمام کر سکیں کہ کسی دوسرے وفاق کے تربیتی ادارے کو فارغ التحصیل استاد کی خدمات سے اپنے مدرسے میں فائدہ اٹھائیں تو اس سے ہم آہنگی پیدا کرنے میں مثبت پیش رفت ہوگی۔

(ب) وفاق اپنے اساتذہ کے لئے وقتاً فوقتاً ریفریشر کورسز کا بھی اہتمام کریں۔

۵ - درجہ بندی

(الف) دینی مدارس کی درجہ بندی کی جائے اور اس درجہ بندی کے مطابق اسکول، کالج، یونیورسٹی کی طرح یہاں بھی مدرسہ، دارالعلوم اور جامعہ کی اصطلاحات اختیار کی جائیں۔

(ب) تعلیمی مدارج کی درجہ بندی کو باقاعدہ کیا جائے تاکہ آٹھ دس سال سے قبل بھی کوئی طالب علم درمیانی سطح کی سند لے کر کسی دوسرے ادارے سے وابستہ ہو سکے یا اپنی عملی زندگی کا آغاز کر سکے۔ ہر درجہ کے لئے مدت تعلیم اور نصاب تعلیم مقرر کیا جائے۔ ان مدارج کو موجودہ میٹرک انٹر اور بی اے اور ایم اے سے ہم آہنگ کیا جائے۔

۶ - سندات و داخلہ

(الف) دینی اداروں میں سرٹیفکیٹ کا نظام باقاعدہ جاری کیا جائے۔ وفاق سے منظور شدہ مدارس کے طلبہ اگر ایک ادارے سے دوسرے ادارے میں جانا چاہیں تو پہلے ادارہ کے سرٹیفکیٹ کی بنیاد پر ان کو داخلہ دیا جائے۔

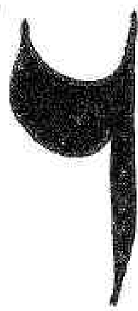
(ب) جدید تعلیمی اداروں کے ان طلبہ کی جو دینی علوم کا شوق رکھتے ہیں، تعلیم و تربیت اور امتحان کے لئے کوئی مناسب اہتمام کیا جائے۔

۷ - حکومت کا کردار

دینی مدارس کا نظام تاریخی طور پر حکومت کے کنٹرول سے آزاد رہا ہے اور دینی مصالح کا تقاضا بھی یقیناً یہی ہے لیکن مسلمانوں کی ہر حکومت کا یہ فریضہ ہے کہ وہ ان اداروں کے ذریعے دینی علوم کی اشاعت اور احیاء کی حوصلہ افزائی کرے اور کسی مداخلت کے بغیر مالی اعانت فراہم کرے۔

۸۔ دینی تعلیم اور جدید ادارے

جدید اداروں میں دی جانے والی اسلامیات کی تعلیم اور عربی و اسلامیات میں تخصص کا نظام و طریق کار قطعی طور پر غیر معیاری اور ناقابل اطمینان ہے۔ اس نظام کو اس طرح بہتر بنایا جائے کہ یہ عصر حاضر کے حقیقی دینی تقاضوں سے ہم آہنگ ہو سکے اور اس کا معیار دینی مدارس کے معیار سے کم نہ ہو۔



ضمیمہ

"دینی مدارس کا نظام تعلیم"

پاکستان میں تعلیم کے شعبہ میں ایک بہت بڑا حصہ دینی تعلیم کے اداروں (درسِ نظامی) پر مشتمل ہے۔ جدید اور عام تعلیمی نظام کے مقابلے میں دینی تعلیم کا نظام بظاہر نسبتاً غیر منظم محسوس ہوتا ہے چنانچہ یہ سوال فطری طور پر بہت اہم ہے کہ جدید تعلیمی نظام ہی کی طرح دینی مدارس اور دینی تعلیم کے اس نظام کو منظم کرنے اور نئے حالات کے مطابق اس کے ارتقاء کی طرف توجہ دینے کی کیا صورت ہونی چاہیے؟ بلاشبہ ان اداروں کی اپنی روایات اور ان کا اپنا تاریخی تسلسل ہے لیکن متعدد مسائل ایسے ہیں جن پر غور و خوض کر کے آج کے حالات کی روشنی میں ان کا حل تلاش کیا جانا چاہیے۔

ذیل میں ان ہی نکات کی نشاندہی کی گئی ہے۔

۱) دینی مدارس سے فارغ ہونے والے افراد عام طور پر امام مسجد، دینی مدارس اور اسکول اساتذہ اور اب کچھ عرصے سے مسلح افواج میں خطیب کی حیثیت اختیار کرتے ہیں۔ کیا معاشرے میں ان کا یہی کردار کافی ہے، یا اسے اس سے زیادہ وسیع کرنے کی ضرورت ہے؟ اس وسعت کی کیا نوعیت ہو اور کیا اس کی مناسبت سے دینی مدارس کے نظام میں کسی تبدیلی کی ضرورت ہے۔

۲) درسِ نظامی کے معیار کو بہتر کیسے بنایا جا سکتا ہے۔ موجودہ صورت میں کسی بھی انتظام کے تحت دینی مدارس کے آغاز پر کوئی پابندی نہیں کیا یہ سلسلہ اسی

طرح جاری رہنا چاہیے یا اس میں کچھ ضابطے اور قواعد کی ضرورت ہے؟ یہ ضابطے اور قواعد کیا ہوں؟ اور ان کے نفاذ کی ذمہ داری کس ادارے پر ہو؟

۳) کیا دینی مدارس سے فارغ التحصیل علماء عہد حاضر میں دینی اور عصری قیادت کے تقاضے پورے کرنے کی قرار واقعی اہلیت رکھتے ہیں؟ اگر نہیں تو اس کے اسباب کیا ہیں؟ کیا نصاب اور نصابی کتب میں موجودہ دور کے تقاضوں اور ترقی کو پیش نظر رکھ کر کسی تبدیلی کی ضرورت ہے؟ کن نئے مضامین کی ضرورت ہے اور موجودہ مضامین میں کیا تبدیلی درکار ہے۔

۴) نصابی کتب کی از سر نو تحریر (موجودہ صورت میں حاشیوں کی بہتات کی بناء پر یہ بہت پیچیدہ اور مشکل ہیں) کی کس قدر افادیت ہے۔؟

۵) موجودہ دور میں فن تعلیم و تدریس ایک سائنس کی شکل اختیار کر گیا ہے جس میں محض پڑھنے اور سننے کے بجائے تدریسی معاونات موثر کردار ادا کرتی ہیں نیز طلبہ کی علمی اور فنی استعداد کے جائزے کے لیے زیادہ بہتر طریقے دریافت ہو چکے ہیں۔ کیا دینی مدارس میں اس علمی و فنی استعداد سے استفادہ نہیں کیا جانا چاہیے؟ کیا استفادہ کے لیے وقتاً فوقتاً اساتذہ کی فنی تربیت اور ریفریشر کورسز کا انتظام مفید ہوگا؟ اگر یہ انتظام مفید ہے تو اس انتظام کی نوعیت اور تفصیلات کیا ہوں؟

۶) دینی اداروں میں اختلافِ مسالک کی نوعیت، اس کی تاریخ اور اس کے اسباب کی تفصیل کیا ہے، کیا ان اختلافات کو کم کرنا یا دور کرنا ممکن ہے۔؟

۷) حکومت اور دینی مدارس کے درمیان تعلق کی اس وقت کیا نوعیت ہے؟ نصاب معیار تعلیم (امتحانی نظام) نظم و نسق، مالیات اور دیگر متعلقہ امور میں تعلق کی تفصیلات کیا ہیں؟ کیا تعلق کی موجودہ نوعیت میں کسی تبدیلی کی ضرورت ہے۔

۸) ملک میں بیک وقت دو نظام (جدید تعلیمی نظام + درس نظامی) رائج رہنا مفید اور

مطلوب ہے یا انہیں کسی سطح پر قریب لانے اور انجام کار باہم مربوط کرنے کی ضرورت ہے۔ اب تک اس ضمن میں جو کچھ ہوا ہے اس کا جائزہ اور آئندہ کے لیے تجاویز کیا ہیں۔؟

۹) دیگر مسلم ممالک میں دینی تعلیم کا کیا نظام ہے۔ اس کی تفصیلات کیا ہیں، پاکستان میں اس نظام سے کیا چیزیں اخذ کی جاسکتی ہیں ؟

مندرجہ بالا امور کے علاوہ بھی دینی تعلیم سے متعلق دیگر مسائل شرکاء سیمینار کی گفتگو کا موضوع بن سکتے ہیں۔

پروگرام سیمینار

۲۳، ۲۴ نومبر ۱۹۸۶ء

نشست اول ۲۳ نومبر ۳۰۔۱۱۔۳۵۔۱

کلیدی خطاب.......... پروفیسر خورشید احمد
باہم تعارف.......... شرکاء

صدارت.......... مولانا محمد ناظم ندوی صاحب سابق شیخ الجامعہ، جامعہ اسلامیہ بہاولپور

مقالات

دینی تعلیم علمائے دین کی نظریہ میں.......... مفتی عبدالقیوم ہزاروی صاحب
دینی مدارس ایک جائزہ.......... حافظ نذر احمد صاحب

نشست دوم ۲۳ نومبر ۱۵۔۴ تا ۰۰۔۷

صدارت.......... مفتی سید سیاح الدین کاکاخیل صاحب مشیر اقتصادی، انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اکنامکس اسلام آباد

مقالات

مدارس میں دینی تعلیم مختلف پہلو.......... محمد یاسین ظفر صاحب
دینی مدارس اور ان کی اصلاح.......... سید معروف شاہ شیرازی صاحب
دینی مدارس کے طلبہ اور اسلامی معاشرہ.......... پروفیسر مسلم سجاد صاحب

نشست سوم ۲۴ اکتوبر ۳۰ ـ ۷ تا ۳۰ ـ ۱۰

صدارت ...... مفتی عبدالقیوم ہزاروی صاحب ناظم اعلیٰ تنظیم المدارس پاکستان و مہتمم جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور

مقالات

دینی تعلیمی ادارے' افادیت اور متعلقہ مسائل ...... سید عبدالخالق گیلانی صاحب
ضی میں مدرسے کی نصابی روایت ...... پروفیسر سید محمد سلیم صاحب
دینی تعلیم آراء و تجاویز ...... مولانا عبدالغفار حسن صاحب
دینی مدارس اصلاح و احوال کا لائحہ عمل ...... فرید احمد پراچہ صاحب

نشست چہارم ۲۴ نومبر ۳۰ ـ ۱۱ تا ۳۰ ـ ۱

صدارت ...... مولانا گوہر رحمن صاحب مہتمم دارالعلوم تفہیم القرآن' مردان و ممبر قومی اسمبلی پاکستان

منہاج تعلیم میں اصلاح ...... مولانا محمد ناظم ندوی صاحب
اصلاح نصاب کیلئے چند تجاویز ...... مفتی سید سیاح الدین کاکاخیل صاحب
دینی مدارس کا نصاب ...... مولانا عبدالمالک صاحب
اسلامی جامعات میں تجربہ گاہوں کی ضرورت ...... ڈاکٹر منصور علی صاحب

نشست پنجم ۲۴ نومبر ۱۵ ـ ۴ تا ۱۵ ـ ۶

صدارت ...... ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتا صاحب صدر نشین' اسلامی نظریاتی کونسل

اختتامی کلمات ...... ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتا صاحب
سفارشات ...... شرکاء

Books on Soviet and Afghan Issue

Challenge from the North
Agha Shahi
pp. 16

Afghanistan Crisis : Implications &
Options for Muslim World, Iran and Pakistan
Tahir Amin
pp. 152 with Maps

Red Clouds over Afghanistan
Dr. A. M. Manzar
pp. 105

Other Publications

Proportional Representation and the
Revival of Democratic Process in Pakistan
Prof. Khurshid Ahmad
pp. 86

Iranian Revolution : A Profile
Dr. Waheed-uz-Zaman
pp. 356

Citizens Slaves, Guest Workers
The Dynamics of Labour Mirgration from
South Asia
Dr. Ijaz S. Gilani
pp. 84

Energy and Economic Growth in Pakistan
1984-85
Saeed Ahmad Rashed
pp. 61

Pakistan's Energy Budget 1983-84
Saeed Ahmad Rashed
pp. 69

Pakistan's Energy Policy :
Need for a New Strategy
Saeed Ahmed Rashed
pp. 106

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد

انسٹی ٹیوٹ کی چند کتب

- نظام تعلیم: نظریہ، روایت، مسائل — پروفیسر خورشید احمد
- اقبالیات درسی کتب میں — شاہد اقبال کامران
- نظام امتحانات: بحران، اسباب، حل — روداد سیمینار
- پاکستان میں ذریعہ تعلیم کا مسئلہ — روداد سیمینار
- سوویت یونین کا زوال: نظریہ، عمل، ردعمل — عطاء الرحمٰن
- ترکستان میں مسلم مزاحمت — آباد شاہ پوری
- مسلم امہ: سوویت یونین میں — آباد شاہ پوری
- کشمیر آزادی کی جدوجہد — ڈاکٹر سفیر اختر
- بوسنیا کے مسلمان — عبداللہ اسماعیل، اشفاق حسین

